

جاسوسی دنیا

93- ساتواں جزیرہ

94- شیطانی جھیل

95- سنہری چنگاریاں



پیشرس

”ساتواں جزیرہ“ ملاحظہ فرمائیے۔

کہانی شروع ہوئی اور پھیلاؤ اختیار کرتی گئی۔ ایسا پھیلاؤ کہ اختصار سے کام لینے کی کوشش کہانی ہی کی موت ثابت ہوتی..... اور آپ لکھ بھیجئے کہ وہ بھی اٹھے تھے اتنے زور و شور سے اور آخر میں ”پس“ ہو کر رہ گئے۔ اسلئے میں نے مناسب بھی سمجھا کہ اسے آگے بڑھا دیا جائے۔ قاسم سے ملے۔ عرصہ سے آپ ان حضرت سے ملنے کے خواہش مند تھے۔

یہ اس کہانی میں خاص کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی کہانی انہیں کے گرد گھومتی ہے اور خود انہیں بھی علم نہیں کہ آخر کس چکر میں پھنس گئے ہیں اور کہانی کے اختتام سے قبل آپ بھی نہ سمجھ پائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص نمبر کا انتظار آپ کو شدت سے کھلے گا۔ لیکن میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ بھی آپ تک جلد سے جلد پہنچ سکے۔

اس بار ایک صاحب نے اپنی دل چاہپ خواہش کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں ”آپ جب اتنا اچھا لکھ سکتے ہیں تو..... ادبی انعام کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ خاص طور پر ایک ناول اس کے لئے بھی لکھئے میرا دعویٰ ہے کہ آپ کامیاب رہیں گے۔“

جناب عالی! میرا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ آپ میری کتابیں پسند کرتے ہیں، انہیں حرف بحرف اس طرح پڑھتے ہیں کہ بعض عبارتیں ازبر ہو جاتی ہیں اور آپ بے لگان اُن کے حوالے اپنے خطوط میں دیتے ہیں اور مجھے متعدد کتابیں اٹھی پڑتی ہیں کہ میں نے یہ چیز کب اور کہاں لکھی تھی!

دیئے ایک بات ہے آپ کسی ”پبلک چونی فنڈ“ سے کوئی ایسا ادارہ قائم کیجئے جو اچھی ادبی تخلیقات پر انعام دے سکے تو میں اس کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دوں گا۔ کیونکہ اُس کی نوعیت ”قوی“ ہوگی لیکن شخصی انعام کا تصور بھی میرے لئے توہین آمیز ہے۔

یا پھر شخصی انعام کے حصول کی کوشش اُس صورت میں کر سکوں گا جب کہ اُس کا تعلق کسی بہت بڑے عالم و دانشور کی ذات سے ہو! کیونکہ علماء کے مقابلے میں تو میں زندگی بھر خود کو کمترین محسوس کرتا رہوں گا۔

بہر حال شاید آپ کی یہ خواہش نہ پوری کر سکوں۔ ویسے یہ تو فرمائیے کہ آپ قابل انعام کس قسم کی کتابوں کو سمجھتے ہیں۔ ضرور مطلع فرمائیے گا۔ والسلام

ابن صفی

دیو کا غسل

سازہ شدت سے بور ہو رہی تھی۔ لیکن کیا کرتی۔ کہاں جاتی۔ ملازمت ہی ٹھہری۔ اسی بوریٹ کا ماہانہ معاوضہ ساڑھے چار سو روپیوں کی شکل میں ملتا تھا..... اور پھر کسی کارپرائیوٹ سیکرٹری ہونا ویسے بھی ہنسی کھیل نہیں۔

نوبے دن سے چھ بجے شام تک کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ صبح سات بجے گھر سے نکل کر بس پر بیٹھتی۔ بس اُسے ایگل سچ تک لاتی۔ پھر ایگل سچ سے ایک لانچ جزیرہ سونار تک پہنچاتی۔ یہ جزیرہ ایگل سچ کے ساحل سے بارہ میل دور واقع تھا۔

بہر حال سونار تک پہنچنے پہنچنے نوج جاتے تھے..... اُس کا باس قلندر بیابانی اسی جزیرے میں رہتا تھا۔ اس کے جاسوسی ناول اردو میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ سکسٹن بلیک سیریز کے انگریزی ناولوں کو کرتا پاجامہ پہنا کر پیش کر دینے میں پڑھ لکھتا تھا۔ پہلے پہل تو سراغ رساں کے نام سکسٹن بلیک کو بھی اردوانے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ لیکن اسے چونی والی پبلک نے سخت ناپسند کیا تھا اور پڑھے لکھے آدمیوں نے بھی ناک بھوں سکوڑی تھی۔ وہ انگریزی میں تو سکسٹن بلیک پسند کرتے تھے لیکن بھلا اردو میں ”کلور پوز“ کیونکر برداشت کر لیتے..... بہر حال اُسے سراغ رساں کا نام کلور پوز کی بجائے پھر کچھ اور ٹھجوز کرنا پڑا تھا۔

بہر حال دو چار ناول پیش کر دینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ سونار میں ایک خوبصورت سے بنگلے کا مالک تھا۔ مستقل طور پر وہیں رہتا بھی تھا..... شہر میں آبائی جائیداد کی مکانات کی

شکل میں موجود تھی جس سے اچھی خاصی ملہنے آمدنی ہو جاتی تھی اور پھر اس کے پبلشر بم
اُسے مناسب معاوضہ دیتے تھے۔

بہر حال مجھ سے ہر ہوتی تھی۔ عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ غیر شادی
شدہ تھ۔ جنگلے میں دو ملازم دن رات رہتے تھے۔ ان میں سے ایک باورچی تھا اور دوسرا ڈرائیور
..... ساڑھ چھ بجے شام کو وہاں سے شہر کے لئے روانہ ہو جاتی تھی۔

اُس کا خیال تھا کہ قلندر بیابانی سکی اور جگہ ہے۔ کسی عورت نے اُسے کبھی پسند ہی نہ کیا
ہوگا۔ پھر شادی کیسے ہوتی؟

ناول کا مسودہ لکھتے لکھتے اُس کا ہاتھ دکھ جاتا اور وہ دل ہی دل میں دعا نہیں کرتی اے اللہ
اس کی شادی کر اے اس سے بھی زیادہ کسی سکی عورت سے۔ تاکہ بھول جائے ”عمل عمل“
کی لگاتار..... کیونکہ ذرا اُسے ست دیکھتا اور دھڑے شعر پڑھ دیتا۔

یہاں کو تابی ذوق عمل ہے خود گرفتاری

جہاں بازو سمیٹتے ہیں وہیں میاد ہوتا ہے

بس لکھے جاؤ۔ جس دن ایک ناول ختم ہوتا اسی دن دوسرا شروع کر دیتا۔ لیکن یہ معاہدہ
آج تک اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے ناول مانیکرو فون پر کیوں ڈکٹٹ کرتا ہے،
اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا۔ وہیں سے مانیک پر ڈکٹٹ کرتا ہے اور وہ دوسرے کمرے
میں تنہا بیٹھ کر لکھتی رہتی۔

اگر اسے جاسوسی ناولوں سے دلچسپی ہوتی اور اس نے انگریزی کے جاسوسی ناول پڑھے
ہوتے تو اندازہ کر لیتی کہ وہ سکشن بلیک سیریز کے ناول ہاتھ میں لے کر نہایت اطمینان سے
اردو میں پڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ تو اُسے جینکس سمجھتی تھی اور کمرے میں بند ہو کر ناول ڈکٹٹ
کرانے کو اس کی ”سنگ“ پر محمول کرتی تھی۔

ویسے بھی ہر جینکس کو پیدا انشی طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خود کو سکی پوز کرے۔ بلکہ اگر
پاگل ہو کر کتوں کی طرح بھونکتا بھی شروع کر دے تو چلیک کو چاہئے کہ اُس کے پیچھے نیپ
ریکارڈ لے کر دوڑ پڑے تاکہ اُس کی ”بھوں بھوں“ سے آئندہ تسلیں بھی نہ صرف محفوظ
ہو سکیں بلکہ اس کے سلسلے میں ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ بھی لے سکیں۔

دوپہر کا کھانا قلندر بیابانی ہی کے ساتھ کھانا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ بھی بوریت برداشت
کر رہی تھی۔ اُن کے ساتھ ایک بلی بھی تھی، جو رہ کر ”میاؤں میاؤں“ کرنے لگتی۔

قلندر کبھی کبھی گوشت کا ایک آدھ ٹکڑا اُس کے لئے ڈالتا رہتا..... بلی بُری طرح
چناب تھی۔ اُسے متوجہ کرنے کے لئے اُس کے زانو پر اگلے پنجے رکھ کر کھڑی ہونے کی
کوشش کرتی.....! ”میاؤں میاؤں“ تو جاری ہی تھی۔ قلندر کے چہرے پر الجھن اور بیزاری
کے آثار تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بلی کی یہ حرکت اُس کی جسمبلاٹ میں بتدریج اضافہ کرتی چلی
جاری ہو۔ یک بیک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بلی کی گردن پکڑی اور اُسے میز پر بٹھاتا ہوا
دہاڑا..... ”لے کھا..... حرام زادی..... میاؤں میاؤں..... کھا.....!“

اُس نے اُس کی گردن ایک پلیٹ میں رگڑ دی..... وہ بُری طرح پھل رہی تھی۔ کئی
پلٹیں اچھل اچھل کر ادھر ادھر جا پڑیں۔

ساڑھ بھی کر سی کھسکا کر اٹھ گئی! قلندر کا غصہ تیز ہو گیا تھا۔ وہ بلی کی گردن رگڑے جا رہا
تھا..... بلی کے حلق سے مختلف قسم کی آوازیں نکلتی رہیں..... بالآخر اُس نے اپنے ہاتھ کو
جھٹکا دیا..... بلی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر آگری۔ لیکن اٹھ کر بھاگنے کی بجائے وہ ایک ہی جگہ
پڑی تڑپتی اور ڈرامائی آوازیں نکالتی رہی۔

قلندر بیابانی وہاں سے جا چکا تھا۔

ساڑھ وہیں دم بخود کھڑی دم توڑتی ہوئی بلی کو دیکھتی رہی۔ اُسے قلندر کی اس حرکت پر
حیرت تھی..... وہ بلی تو اُس کی اتنی چیتھی تھی کہ اکثر دونوں ایک ہی برتن میں کھاٹے دیکھے
گئے تھے..... پھر آج اتنی ذرا سی بات پر کہ وہ اُس کے زانو پر پنجے ٹیک کر اُس کی توجہ اپنی
جانب مبذول کرانا چاہتی تھی اس حد تک برا فروختہ ہونا کہ جان ہی سے مار دینے کی سعی
کر گذرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

بلی کی آخری چیخ بڑی دلگداز تھی..... اُس کا جسم کھینچا چلا گیا تھا اور پھر یک بیک ڈھکی
ہو کر سڑ گئی تھی۔

ٹھیک اسی وقت قلندر نے مانیکرو فون پر باورچی کو پکارنا شروع کیا۔

”ریاض ابے اور ریاضو..... حرام لے سن..... اگر اب کوئی بلا اس گھر میں دکھائی دیا“

تو تیری چڑی او میزدوں گا..... سنتا ہے یا نہیں۔ بندوق سنباں اگر اب وہ چٹکیرا بلا دکھائی دے تو فوراً گولی مار دیجو..... ورنہ تیری خیر نہیں!“

ریاضو بھی ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا تھا..... اور حیرت سے کبھی مردہ ملی کو دیکھتا تھا اور کبھی ادھر ادھر بکھری ہوئی پلیٹوں کو۔

آخر اُس نے سارہ سے پوچھا..... ”یہ کیا ہوا من صاحب؟“

”صاحب نے اسے مار ڈالا.....!“ سارہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”کیوں مار ڈالا.....؟“ ریاضو کے لہجے میں پہلے سے بھی زیادہ تحیر تھا۔

”میں نہیں جانتی۔“ سارہ نے جھنجھلا کر کہا اور کمرے سے نکل آئی۔ دوپہر کے کھانے

کے بعد کسی قدر آرام کی مہلت دیئے بغیر قلندر ڈکلیٹ کرانا شروع کر دیتا تھا۔ وہ اُس کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ یہیں میز پر ایک چھوٹا سا اسپیکر رکھا رہتا تھا، جس سے قلندر کی آواز آتی رہتی اور اُس کا قلم تیزی سے صفحے پر صفحہ سیاہ کرتا چلا جاتا۔

دفعۃً اسپیکر سے آواز آئی ”سارہ..... تم جاسکتی ہو..... آج میں کام نہیں کروں گا۔“

آواز بھرائی ہوئی تھی..... اُسے یقین تھا کہ اُس نے ایک آدھ سسکی بھی سنی تھی۔

سارہ نے طویل سانس لی اور اٹھ گئی۔

لیکن ابھی وہ گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ گھر ہی پر کون سا سکھ نصیب تھا۔ چڑچڑا.....

غصہ ور اور ناکارہ باپ..... نصف درجن چھوٹے بھائی بہن جن کے شور و غل سے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے تھے..... مدقوق اور جلع تن ماں جو اپنی ان ”مہاتقوں“ کو دن رات کوستی رہتی تھی۔



اُن ساتوں جزیروں میں سوناہ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے کئی سے بڑا تھا۔

اُس کے گرد دوسرے چھ جزیرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس لئے سوناہ کا ہر ساحل پر سکون تھا..... بے شمار بادی کشتیاں اُس پاس تیرتی نظر آتیں..... بونگ کے شوقین ملکی اور غیر ملکی لوگوں کی بھڑ بھڑتی..... تیراکی کے لئے بھی اس کے ساحل مناسب تھے۔ اس لئے بیدنگ ہوٹلز کے دلدادہ بھی شہر سے کھینچے چلے آتے تھے۔

لیکن آج تو جزیرے کے کچھ باشندے بھی اُن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کے لئے اُن میں نہ کوئی نئی بات رہی تھی اور نہ کوئی خاص دلچسپی.....

وہ تو دراصل اُس دیو زاد کو دیکھ رہے تھے جس نے سرخ رنگ کا زائدہ سوئنگ ڈریس پہن رکھا تھا۔ بہترے تو یہی سوچ رہے تھے کہ آخر اس سارے سوئنگ ڈریس مہیا کیسے ہوا ہوگا۔ اور وہ دیو زاد ایسا ہی خوش نظر آ رہا تھا جیسے کوئی مجمع باز عطائی حکیم حسب دلخواہ مجمع لگانے میں کامیاب ہو جانے پر مسرور اور چاق و چوبند دکھائی دینے لگتا ہے۔

ایک سیاہ قام لڑکی بھی تھی اُس کے ساتھ اور اپنے ہی جیسے رنگ والے سوئنگ ڈریس میں تھی اس لئے یہ پتہ لگانا محال تھا کہ وہ خود کہاں ہے اور سوئنگ ڈریس کہاں پلا جاتا ہے۔ ساحل سے نظارہ کرنے والوں میں دو ایسے آدمی بھی تھے، جو انہیں تقریباً نہیں دیکھ رہے تھے۔

پستہ قد نے لمبے آدمی سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے اور کہاں سے آکودی۔“

”پستہ نہیں کون ہے۔“ لمبے آدمی نے اگلے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ دیر پہلے دونوں گرین میں ملے تھے۔ لیکن دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ملاقات دو اجنبیوں ہی کی سی تھی۔“

”پھر.....!“

”میں نے لڑکی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا..... ورنہ دیکھتا کہ اجنبیت بے تکلفی میں کیسے تبدیل ہو گئی تھی۔“

”اب یہ کم بخت باہر نکلے گا..... نکلے گا بھی یا نہیں.....!“ پستہ قد آدمی کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”مجھے تو کوئی پیشہ ور معلوم ہوتی ہے..... لیکن وہ مردود کیسا گھنیا میٹ رکھتا ہے۔“

”کریک ہے۔“

”ارے..... یہ لو..... ارے..... لڑکی کو کاندھے پر بٹھالیا۔“

پستہ قد آدمی ہنسنے لگا۔ لے لے لگا۔ ”آف فوہ..... وہ اتارنے کی کوشش کر رہی ہے..... لیکن چھوڑتا ہی نہیں..... اب اور دیکھو..... کنارے کی طرف آ رہا ہے۔“

”دیکھو..... کیا کرتا ہے۔“

”یاد رہے کیا مصیبت ہے.....! لہذا آدمی جھنجھلا کر بولا۔ ”کہیں کھیل بگڑی نہ جائے۔ وہ دیکھو بحری پولیس کے دو سپاہی اُن کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔“

بحری پولیس کے دو سپاہی چلتے چلتے رک گئے تھے..... دیوزاد لڑکی کو کاندھے پر بٹھائے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔

لڑکی نیچے اتر جانے کے لئے خاموش جدوجہد کر رہی تھی۔ لیکن دیوزاد کی گرفت مضبوط تھی۔ لڑکی کے چہرے پر جھلاہٹ اور شرمندگی کے آثار تھے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے اب رو پڑے گی۔

”کیوں صاحب..... یہ کیا بچار کھا ہے۔“ بحری پولیس کے ایک سپاہی نے دیوزاد کو مخاطب کیا۔ لیکن وہ اُسے جواب دیے بغیر ایک طرف چلا رہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ دور اُس کے پیچھے بھی چلے لیکن پھر کچھ سوچ کر دوسری سمت مڑ گئے۔

پستہ قد آدمی بڑبڑایا۔ ”اب کہاں جا رہا ہے؟“

”چلو دیکھیں.....! لے لے آدمی نے کہا۔

وہ کافی فاصلے سے دیوزاد کا تعاقب کرتے رہے۔

”اتارو مجھے.....! لڑکی منٹار رہی تھی۔ ”ورنہ میں اب تمہارا منہ نوچنا شروع کر دوں گی۔“

”کیا تمہیں اچھا نہیں لگتا.....! دیوزاد نے پوچھا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“

”میں سوار سمیت ایریل موٹر سائیکل سڑ سے اونچی اٹھالیتا ہوں..... مسمری کا ایک پایہ

پکڑ کر بیوی سمیت..... اغ..... اغ..... غوب..... بکری سمیت..... اوپر اٹھالیتا ہوں۔“

”مجھے اتارو.....! وہ اُس کے بال مٹیوں میں سمجھ سمجھ کر چینی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا

جیسے اب اُس پر ہسٹریا قسم کا کوئی دورہ پڑ جائے گا۔

”میں تمہیں گرین تک یونہی لے چلوں گا۔“ دیوزاد ہنس کر بولا۔ ”وہاں پہنچ کر تمہارے پیسے دے دیتا۔“

گرین جزیرہ سونار کا سب سے اونچا ہوٹل تھا۔ زیادہ تر غیر ملکی سیاح یہاں قیام کرتے تھے۔ شہر کے دولت مند لوگ بھی سونار آتے تو گرین میں ٹھہرتے۔

”اب میں چننا شروع کر دوں گی اور تم جیل چلے جاؤ گے..... سمجھے۔“

”کوہ سن رہے ہو۔“ لہذا آدمی مضطربانہ انداز میں بولا۔ اب اُن کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور وہ ساری گفتگو بخوبی سن سکتے تھے۔

”یاد رہے پکری اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔“

”چلو ٹھیک بھی ہے۔“ لے لے آدمی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اگر کچھ شروع ہی ہو جائے تو اچھا ہے ہمیں کچھ کر گذرنے کا موقع مل جائے گا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ دشواری پیش آئے..... پہاڑی ٹھہرا.....!“

اتنے میں لڑکی نے سچ چننا شروع کر دیا اور دیوزاد ”اغ اغ“ کرتا رہا۔ اب دور سے تماشہ دیکھنے والے اُن کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

”آؤ.....! لے لے آدمی نے پستہ قد کا ہاتھ پکڑ کر اسی جانب کھینچے ہوئے کہا۔

دیوزاد نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو جھلا کر بولا۔ ”اب تو نہیں اتاروں گا..... دیکھتا ہوں کوئی سالا کیا کر لیتا ہے۔“

لڑکی نہ صرف اُس کے بال نوچ رہی تھی بلکہ کھوپڑی پر گھونسوں اور تھپڑوں کے ڈونگرے بھی برساتی جا رہی تھی۔

اُن کے گرد بھڑا کٹھا ہو گئی تھی۔ لیکن بحری پولیس کے سپاہی کسی دوسرے طرف جاتے تھے..... لوگوں نے لڑکی کو اُس کے کاندھے سے اتارنے کی کوشش شروع کر دی۔

کسی نے کمر پر دو تین گھونسے بھی جڑ دیے۔ بس پھر کیا تھا۔ دیوزاد آگ ہو گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر مجمع پر گھونسے برسانے لگا..... لڑکی مچھلی کی طرح تڑپتی اور دھڑکنے سے ریت پر آ رہی۔

دیوزلو پر چاروں طرف سے کھونے پڑے تھے اور وہ بھی کہہ کہہ کر ہاتھ مار رہا تھا جس پر بھی اُس کا کھونسہ پڑتا تو زدی دیر تک سوچتا رہ جاتا کہ اٹھ کر دوبارہ حملہ کرے یا دم سادھے پڑا رہے۔

اب تک کئی ہٹ چکے تھے۔

دفعتاً لمبے آدمی نے غرات شروع کیا۔ ”ہٹ جاؤ..... الگ ہٹ جاؤ..... پولیس.....!“ وہ بھیڑ میں گھس رہا تھا۔ پتہ قد آدمی اُس کے پیچھے تھا۔ دیوزلو کے قریب پہنچ کر اُس نے ایسی حرکتیں شروع کیں، جیسے اُسے لوگوں کے حملوں سے بچانا چاہتا ہو۔

”ٹھہریے..... ٹھہریے.....!“ وہ چیخ چیخ کر کہتا رہا۔ ”قانون کو ہاتھ میں نہ لیجئے۔ میں اسے پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا..... میرے ہاتھ بٹائیے۔“

پھر اُس نے دیوزلو کا ہاتھ پکڑا اور ایک جانب چلنے لگا..... پتہ قد آدمی دوسروں سے گرجدار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”کوئی ہمارے پیچھے نہ آئے سمجھے۔ چلے جاؤ۔“

ریت کے تودے کی دوسری جانب ایک بڑی سی لالچ لنگر انداز تھی۔ اُس کے قریب پہنچ کر لمبے آدمی نے دیوزلو سے کہا۔ ”میرا شکریہ ادا کرو کہ تمہیں بچالایا..... لیکن پولیس سے میرا تعلق نہیں..... مجھے دوست ہی سمجھو اور چپ چاپ لالچ میں بیٹھ جاؤ..... ورنہ یہ ہنگامہ بڑھ بھی سکتا ہے۔“

دیو کی گمشدگی

کیپٹن حمید تین دن سے سرگرداں تھا۔ چونکہ اس سے پہلے بھی قاسم خود اُس کے ساتھ اپنے گمراہیوں کے لئے لاپتہ رہ چکا تھا اس لئے اس بار بھی جب وہ اچانک لاپتہ ہو گیا تو سب سے پہلے کر مل فریدی کی کوٹھی میں اُس کے متعلق پوچھ گچھ کی گئی اور پھر قاسم کی بیوی کی

استدعا پر حمید کو اُس کی تلاش پر کمر بستہ ہونا ہی پڑا۔

گمشدگی کی اطلاع کو بذریعہ پولیس ملی تھی اور اسی اطلاع کے مطابق یہ معلوم ہو سکا تھا کہ قاسم کا قیام سوند کے گرین ہوٹل میں تھا۔ وہیں قیام کرنے والی ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر مس لیلانا ٹیلر نے اُس کے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی۔

رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر لیلانا اور قاسم کے درمیان اُسی دن رسی سی جان بچان ہوئی تھی اور دونوں نہانے گئے تھے۔ قاسم نے نہانے نہاتے ایک بیک اُسے اٹھا کر کاندھے پر بٹھالیا تھا۔ ”یونہی بلاؤ ج.....؟“ حمید نے پوچھا۔

ڈاکٹر لیلانا فوری طور پر جواب دیتے ہوئے ہچکچائی..... حمید مستغفرانہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے سوچنے دیجئے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”عالم اُس نے اپنی قوت کے متعلق کچھ کہا تھا۔ میں ہنس دی تھی، مقصد یہ تھا کہ وہ جھوٹا ہے۔ مگر شاید وہ یہی سمجھا اور ایک بیک مجھے اٹھا کر کاندھے پر بٹھالیا۔“

”پھر کیا ہوا.....؟“

”لوگ ہمارے گرد اکٹھا ہو گئے..... اُن سے وہ کالم گلوچ کرتا رہا۔ پھر باقاعدہ جھگڑا ہوتا رہا تھا۔ میں گر پڑی تھی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”آپ بیہوش ہو گئی تھیں۔“

”سر تو پہلے سے چکرارہا تھا۔ ری سی کمر کرنے سے پوری ہو گئی تھی۔ جی ہاں اُسے بیہوشی ہی کہنا چاہئے۔“

”آپ اُن لوگوں میں سے کسی کو پہچانتی تھیں، جو اس وقت وہاں موجود تھے۔“

”وہ کسی سوچ میں پڑ گئی کچھ دیر بعد بولی۔“ جی ہاں! مجھے یاد پڑتا ہے ایک جانی پہچانی سی صورت نظر آئی تھی۔ اس لڑکی کو میں نے اکثر قلندر بیابانی کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاید اُس کی سکرٹری ہے۔“

”قلندر بیابانی.....!“ حمید ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”وہ تو نہیں جو جاسوسی ناول لکھتا ہے۔“

”جی ہاں.....دعی.....!“

”کیا وہ یہیں رہتا ہے؟“

”جی ہاں..... جریرے کی اہم شخصیتوں میں سے ہے۔ بیت الحکیم یہاں کی مشہور عمارت ہے کسی سے بھی پوچھیں راستہ بتا دے گا۔“

قلندر بیابانی کا نام اس نے سنا تھا۔ لیکن اس کی کوئی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بیت الحکیم تک بھی جا پہنچا..... قلندر نے ڈرائنگ روم میں اس کا استقبال کیا تھا۔ ”میں جانتا تھا“ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک نہ ایک دن یہاں کی پولیس کو بلا آخر میری طرف متوجہ ہونا ہی پڑے گا..... بالکل اسی طرح جیسے امریکہ کے نامی گرامی دکلاء اول شیلٹے گارڈز سے مشورے لینا اپنے لئے بہت بڑا افتخار سمجھتے ہیں۔“

حمید صرف مسکرا کر رہ گیا، کیونکہ قلندر پہلی ہی نظر میں اُسے جھکی اور سنی معلوم ہوا تھا۔ ”کیا آپ کی سیکرٹری سے ملاقات ہو سکے گی!“ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔

”کیا مطلب.....!“ قلندر اُسے گھورتا ہوا غریبا۔

”ایک کیس کی تحقیق کے سلسلے میں اُن سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”کیا وہ خود کسی کیس میں الجھ گئی ہے۔“

”نہیں جائے واردات پر موجود تھیں۔“

”صرف دعی۔“

”جی نہیں اور بھی تھے۔ لیکن ایک گواہ صرف انہیں پہچان سکا تھا۔“

”واقعہ کیا تھا.....؟“

”اگر وہ موجود ہوں تو.....؟“

”ظہر بے.....“ قلندر اٹھتا ہوا بولا اور اندر چلا گیا۔

حمید پاپ میں تباہ کو بھرنے لگا ڈرائنگ روم کی ہر چیز نیلی تھی۔ نیلی دیواریں نیلے پردے صوفوں پر نیلے غلاف تھے۔ میزوں پر نیلے میز پوش..... گلدانوں میں نیلے کاغذی پھول۔ پھر پاپ کے نیلگوں دھوئیں نے عجیب سی فضا پیدا کر دی۔

کچھ دیر بعد قلندر واپس آیا۔ اس کے ساتھ سیکرٹری بھی تھی۔ حمید نے طویل سانس

لی۔ خاصی دلکش لڑکی تھی۔

”کیپٹن حمید فرام انٹیلی جنس بیورو۔“ قلندر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ سارہ عبدالنور ہیں۔“

”تکلیف دعی کی معافی چاہتا ہوں محترمہ.....!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”تشریف رکھئے..... تشریف رکھئے۔“ قلندر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”یہ بیت الحکیم ہے یہاں غیر ضروری باتوں میں وقت نہیں برباد کیا جاتا۔“

”خیر..... خیر..... رسی باتوں کے بغیر ہی اصل موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا ہوں پولیس والوں کا خاصہ ہے..... ہمیں تو بہر حال نیاز مند رہنا پڑتا ہے۔ ہاں تو محترمہ آج سے چار دن پہلے کے ایک وقوعہ کے متعلق آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”فرمائیے.....!“ بڑی مترنم آواز تھی۔ حمید نے محسوس کیا جیسے ڈرائنگ روم کے نیم تاریک ماحول میں موسیقی کے کوندے سے لپکے ہوں۔

”آپ کو یاد ہو گا..... ایک دیونا آدی اور کسی لیڈی ڈاکٹر کا قصہ تھا۔“

”اوہ..... وہ.....!“ شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ واقعیت کا اظہار کیا گیا۔ قلندر احمقانہ انداز میں کبھی حمید کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی سارہ کی طرف!

”جی ہاں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”وہ دیونا عائب ہے۔ لیڈی ڈاکٹر تو بیہوش ہو گئی تھی..... اُسے پتہ نہیں کہ اُس نامعلوم آدی پر کیا گذری۔“

”ہائیں کیا قصہ تھا۔“ قلندر نے سارہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ آپ سے تذکرہ کرتی۔“

”کیا کہا! کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ بیہوش ہو گئی تھی اور تم وہاں موجود تھیں..... کوئی دیونا آدی..... ہائیں۔“

”آپ سمجھ نہیں۔“ حمید مسکرایا اور پھر اُس نے اُسے بتایا کہ واقعہ کیا تھا۔

”لا حول ولا قوۃ.....!“ وہ نہ اسامہ بنا کر بڑبڑایا۔

”اُسے تو پولیس لے گئی تھی۔“ سارہ نے کہا۔

”آپ کی موجودگی میں ہی۔“

”جی ہاں..... لیکن وہ وردی میں نہیں تھے۔ سادہ لباس میں بھی تو ہوتے ہیں پولیس اسٹیشن پر۔“

”جی ہاں ہوتے ہیں لیکن وہ یہاں کے پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچا تھا۔ اُس کی کوئی رپورٹ پولیس اسٹیشن پر نہیں ہے۔“

”راستے میں رشوت لے کر چھوڑ دیا ہو گا۔“

”ممکن ہے! لیکن اُس کے بعد اُسے گھر تو پہنچنا ہی چاہئے تھا۔“

دفترا قلندر بیابانی جو کھڑکی کے قریب کھڑپائیں باغ میں دیکھ رہا تھا اچھل کر اندر بھاگا..... اور حمید مستفسر انداز میں سارہ کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اُس نے لاعلمی کے اظہار میں شانوں کو جنبش دی۔

پھر وہ دوڑتا ہوا اندر سے آیا اور باہر نکل گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں دو تالی بندوق تھی۔

”کیا قصہ ہے؟“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”خدا جانے۔“ سارہ نے خشک لہجے میں کہا۔

”آپ اس پر متحیر بھی نہیں معلوم ہوتی۔“

”میرے لئے کوئی نئی بات نہیں! دن بھر ایسے ہی حیرت انگیز واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ جاسوسی نادلوں کے مصنف ہیں۔“

”کیا ایسے ہوتے ہیں جاسوسی نادلوں کے مصنف....!“

”پتہ نہیں! میں نے بھی پہلا ہی دیکھا ہے۔“

اچانک باہر سے فائر کی آواز آئی اور ساتھ ہی ”وہ مارا“ قسم کا کوئی نعرہ بھی سنائی دیا۔

وہ دونوں بھی اب برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ حمید نے تھوڑی سی فاصلے پر ایک بڑے سے بلے کو تڑپے دیکھا۔ قلندر اُس کے قریب کھڑا انہیں فاتحانہ انداز میں دلو طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آخر کار.....!“ سارہ غصندی سانس لے کر بڑبڑائی۔ ”یہ آرزو بھی پوری ہو ہی گئی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”نجی معاملات ہیں.....!“ وہ اُس کی طرف مڑ کر مسکرائی اور ڈرائنگ روم کی طرف

چل پڑی۔ قلندر بھی تڑپتے ہوئے بلے کو وہیں چھوڑ کر برآمدے کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

”تفتیش ختم ہو گئی ہو تو اب تشریف لے جائیے۔“ اُس نے حمید کے قریب پہنچ کر کہا۔

”میں ناوقت چائے کے لئے نہیں پوچھتا۔ صبح یا شام کو آنے والوں ہی کو چائے آفر کر سکتا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کہ تفتیش کے اختتام تک شام ہی ہو جائے۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”کیا مطلب.....!“

”میں بھی مجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔“

”برلور کرم جلدی کیجئے! مجھے کام بھی کرنا ہے۔ بیت الحکیم میں تصحیح اوقات کی گنجائش نہیں۔“

حمید پھر ڈرائنگ روم میں آیا۔ سارہ وہیں بیٹھی تھی۔

”پوچھئے جو کچھ پوچھنا ہے۔“ قلندر غرایا۔

”محترمہ تمہوڑا وقت اور لوں گا۔“

”فرمائیے؟“

”کچھ تماشائی اُن کے پیچھے بھی گئے ہوں گے۔“

”جی نہیں! اُن دونوں کو سادہ لباس والوں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا

کہ اگر کوئی پیچھے آیا تو اُس کی خاصی مرمت کی جائے گی۔“

”کیا آپ اُن دونوں کے حلقے بتا سکیں گی۔“

”حلقے۔“ وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”حلقے وضاحت کے ساتھ نہ بیان کر سکوں گی۔ البتہ

اُن دونوں کے درمیان مضحکہ خیز قسم کا تضاد تھا..... ایک بہت لمبا تھا اور دوسرا پستہ قد.....!“

”لیکن وہ گئے کس طرح تھے۔“

”شائد اُس ساحل کی طرف جہاں یاٹ کلب کی بادبانی کشتیاں رہتی ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔



قاسم نے بھڑسا منہ پھیلا کر جمائی لی۔ دیر سے جاگ رہا تھا۔ البتہ ذہن نیم غنودہ کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر دفعتاً اُسے اپنے اُس ملازم پر غصہ آگیا جسے بہت دیر پہلے اُس کے لئے بیڈنی لانی چاہئے تھی۔ دو چار گالیوں کے ساتھ اُس نے آوازیں دیں..... ہر صدائے بے ہنگام کے ساتھ اُس کا ذہن بھی کسی قدر صاف ہوتا گیا۔

”ہائیں.....!“ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں..... اور وہ اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی..... اور ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر یادداشت پر زور دینے لگا۔ اُن دونوں نے اُسے جھگڑا کرنے والوں سے بچایا تھا۔ اپنے ساتھ ایک لالچ تک لائے تھے۔ لالچ میں اُسے چائے پلائی تھی..... اور وہ سو گیا تھا..... تو کیا پھر اب جاگا ہے۔ چائے پینے کا کوئی واقعہ اُسے یاد نہ آسکا..... پہلے اُن دونوں نے خود کو پولیس والا ظاہر کیا تھا پھر کہا تھا وہ تو محض لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے جھوٹ بولے تھے؟ پھر وہ کون تھے..... اور اُسے کہاں لائے ہیں.....! نہ تو یہ گرین والا کمرہ ہے اور نہ اُس کی اپنی خواب گاہ۔ حوالات بھی تو نہیں ہو سکتی، بھلا حوالات کی میز پر گلہ ان کہاں؟

”ہائیں.....!“ وہ منہ پھیلا کر رہ گیا۔ اس بار اُسے بستر چھوڑ دینا پڑا۔ سامنے ایک قد آدم تصویر نظر آئی۔ کسی فرانسیسی مصور کا نسوانی جسمانی مشاہدہ تھا۔ وہ جھپٹ کر اُس تصویر کے قریب آیا اور ہر ہر زاویے سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر یک بیک منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

”بڑی عمدہ حوالات ہے۔“ تھوڑی دیر بعد بڑبڑایا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کمرہ خاصا طویل و عریض تھا..... اور بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ ویسے وہاں اُس مسہری کا اضافہ نیا ہی معلوم ہوتا تھا۔

قاسم تصویر کے قریب بیٹھا کھانا کھکھارتا رہا۔ لیکن جیسے ہی خیال آیا کہ پتہ نہیں اُس نے کب سے کھانا نہ کھایا ہو، ساری محویت رفقہ چکر ہو گئی۔

”ہائے.....!“ وہ کراہا۔ کچھ دیر بعد اس طرح دہڑا جیسے خود پر غصہ آگیا ہو۔ پھر غالباً

اُس کی دہاڑی سن کر کسی نے باہر سے دروازہ کھولا تھا۔ ایک بوڑھی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

قاسم چند لمحے اُسے گھورتے رہنے کے بعد غریبا۔ ”میں کہاں ہوں؟“ ”آپ یہیں ہیں سرکار.....!“ اُس نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”یہ کہاں ہے۔“

”یہ یہیں ہے سرکار.....!“

”ارے تو یہیں کا قوتی نام بھی ہے۔“

”جنت سرکار.....!“

”ہائیں.....!“ قاسم خوفزدہ انداز میں اچھل پڑا اور بوکھلائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر تھوک نکل کر بولا۔ ”تو کیا میں..... مم..... مر گیا ہوں۔“

”نہیں سرکار..... ایسی کوئی بات نہیں۔ اس عمارت کا نام جنت ہے۔ آپ بالکل زندہ ہیں۔“ ”چلو صبح ہے۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”میں تو ڈر گیا تھا کہ اب کھانا دانا نہیں ملے گا۔“

”ضرور ملے گا سرکار..... کھانا تیار ہے۔“

”ارے تو کھلو آؤ نا..... الا قسم بھوک کے مارے جان نقل رہی ہے۔“

”میرے ساتھ آئیے۔“

قاسم اُس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے میں آئے جہاں کئی بڑی بڑی کھانے کی میزیں تھیں لیکن..... لیکن وہاں کوئی تیسرا آدمی نہ دکھائی دیا۔

ایک میز پر اتنا کھانا نظر آیا جو کہ از کم دس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا۔

”صبح ہے.....!“ قاسم نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

بوڑھی عورت نے اُس کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

نئی ولدیت

بیٹھا نظر آیا تھا۔

وہ دل کو سمجھانے لگی۔ یہ بھی اتفاق ہی ہو گا کہ اُسے بھی اس بس سے سفر کرنا ہے۔
ایک گھنٹہ بعد بس شہر میں داخل ہوئی تھی..... بس اسٹاپ سے اُس کے مکان کا فاصلہ
زیادہ نہیں تھا..... اس لئے وہاں سے پیدل ہی راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔

وہ چل پڑی..... ایک بار مڑ کر دیکھا..... وہ اُس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بے ساختہ
یہی دل چاہا کہ دوڑنا شروع کر دے۔

تو وہ سچ اُس کا تعاقب ہی کر رہا ہے..... کیوں؟ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟
گھر کے دروازے پر رک کر ایک بار وہ پھر مڑی اور اُسے سامنے والی پان کی دوکان پر

کھڑا پایا۔

اندر پہنچ کر اُس کمرے میں آئی جس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ پاٹوں میں درہ
کر کے باہر جھانکا وہ دوکان کے سامنے کھڑا..... اُس کے دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر اُسے دوسروں کے خیال سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ آنا پڑا تھا۔ لیکن اس وقت
تک وہ وہیں کھڑا نظر آیا تھا۔

دفعتاً سارہ کو محکمہ سراغ رسانی کا وہ آفیسر یاد آیا جس نے اُس جھگڑے کے متعلق اُس
سے پوچھ گچھ کی تھی۔

کیا یہ وحشی بھی محکمہ سراغ رسانی کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ اُس نے سوچا لیکن کیوں۔
اول تو اُس کا اُس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر وہ ایک تماشائی کی حیثیت بھی رکھتی تھی

تو کیا یہ ایسا ہی جرم تھا کہ خفیہ پولیس اُس کی نگرانی شروع کر دے۔
آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر کسی بہانے سے اُس کمرے میں گئی تھی۔ کھڑکی سے جھانکا تھا۔

لیکن اب وہ آدمی وہاں نہیں تھا۔

چھ بجے والی لانچ ایگل سچ کے لئے تیار تھی۔ آج سارہ دیر سے پہنچی۔ قلندر نے تو چار
ہی بجے چھٹی دے دی تھی۔ لیکن وہ ایک کتاب میں ایسی کھو گئی تھی کہ وقت کا احساس ہی
رہا۔ قلندر وہی بجے کہیں چلا گیا تھا اور اس سے کہہ گیا تھا کہ وہ چاہے تو چار بجے جاسکتی ہے۔
کتاب نے خاصا وقت لے لیا۔ اُس کے اختتام تک چھ بجنے میں بیس منٹ باقی رہ گئے۔
پھر وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مشرقی ساحل تک پہنچی تھی۔

لانچ میں بیٹھتے وقت اُس نے ایک آدمی کو اپنی طرف گھورتے دیکھا..... یوں
گھورنے والوں سے دن بھر ہی سابقہ پڑتا رہتا تھا..... لیکن یہ آدمی..... وہ کانپ کر رہ گئی۔
قدم لڑکھڑانے لگے اور وہ بدقت اپنی سیٹ تک پہنچی۔

وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور رخ بھی اُسی کی طرف تھا۔ ڈراؤنا چہرہ
تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ دہانہ اُن میں غائب ہو کر رہ گیا تھا۔ پھٹی پھٹی ی
وحشت زدہ سرخ آنکھیں لیکن لباس سے غیر مہذب یا ناشائستہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بار بار
اُس سے نظر ملتی اور سارا جسم جھنجھٹا کر رہ جاتا وہ الجھن میں بھی پڑ جاتی کہ آخر اس آدمی کو پہلا
کہاں اور کب دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شکل پر چھائیں کی صورت میں ذہن کے
کسی گوشے میں پہلے سے موجود رہی ہو۔

ایگل سچ پہنچ کر وہ اُسے اپنے ذہن سے دھکیلنے کی کوشش کرتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف
روانہ ہو گئی۔

مڑ کر پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ارے تو کیا وہ اُس کے پیچھے آئے گا صرف اُس
ہی تو نہیں گھور رہا تھا۔ سبھی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

بس میں بیٹھتے وقت اتفاقاً داہنی جانب نظر اٹھی تھی اور پورا جسم شل ہو کر رہ گیا تھا۔
کیونکہ وہ مردانہ ہصے کے دروازے والے فٹ بورڈ پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔

کسی نہ کسی طرح زندہ سیٹ پر جا بیٹھی تھی اور جالیوں سے مردانہ ہصے میں جھانکا تھا۔



کیپٹن حمید نے دونوں تصویروں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ان تصویروں سے کیا بنے گا؟“

”کیوں؟“ فریدی نے فائل سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔

”یہ صرف چہروں کے کلوز اپ ہیں۔ لمبے یا پستہ قد ہونے کا پتہ کیسے چلے گا۔“

”احتمالاً باتیں نہ کرو۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کون پستہ قد ہے اور کون

طویل قامت رکھتا ہے۔ اُس ایک لڑکی کے علاوہ اور کس نے انہیں دیکھا تھا؟“

”اُس کے علاوہ اور کسی نے بھی اُس کی کہانی نہیں دہرائی۔ اُس لیڈی ڈاکٹر اور قلندر کی

سیکریٹری کے علاوہ اور کوئی مل ہی نہیں سکا، جو اُس واقع کے متعلق کچھ بتاتا۔“

”لہذا۔۔۔۔۔!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اُس کے بیان کی تصدیق اسی صورت سے

ہو سکے گی کہ وہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر یہ بتائے کہ ان میں سے کون لمبا تھا اور کون پستہ

قد۔۔۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو آپ کو یقین ہے کہ یہی دونوں رہے ہوں گے۔“

”میں اس قسم کے دو آدمیوں سے واقف ہوں۔ ہمارے یہاں اُن کا باقاعدہ ریکارڈ بھی

موجود ہے۔ پھر کیوں نہ ہم یہیں سے شروعات کریں۔“

”اچھی بات ہے۔“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں دیکھوں گا۔“

اُس نے تصویریں ڈائری میں رکھیں۔ کلک روم میں آکر فلٹ ہیٹ لی اور پارکنگ ٹینڈ

کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر بعد اُس کی گاڑی ایگل سچ کی طرف جاری تھی۔ ایگل سچ پر فریدی کی نجی موٹر

بوٹ بھی ہمیشہ ساحل پر موجود رہتی تھی، جس کی نگرانی ہٹ کے چوکیدار کے ذمے تھی۔

حمید قلندر کی سیکریٹری کے تصور میں کھویا ہوا جریہ سونار کی جانب بڑھتا رہا۔

قلندر بھی یاد آیا جو پچھلے دن خاصا بد اخلاق ثابت ہوا تھا۔

بیت الحکیم کی کمپاؤنڈ کا پھانک بند ملا۔ اُس نے کال بل کا بٹن دبایا اور پھانک کھلنے کا منتظر رہا۔۔۔۔۔ دو بج رہے تھے۔۔۔۔۔ کئی منٹ گزر گئے لیکن پھانک نہ کھلا۔۔۔۔۔ وہ دوسری بار گھنٹی کا بٹن دبائے جارہا تھا کہ کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔۔۔ وہ چونک کر مڑا۔۔۔۔۔ قلندر بیابانی کی پھرے ہوئے گوریلے کے سے انداز میں اُسے گھور رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا؟

”شائد آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

”نہ پہچانا ہوتا تو تم اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہ رہ گئے ہوتے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو اس گھنٹی کا بٹن دبانا ایسی ہی بُری بات ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔“

”میں آٹو گراف لینے نہیں آیا۔“ حمید کا لہجہ زہریلا تھا۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کیوں آئے ہو۔ بس کہیں کسی جوان عورت کی بوسہ لگ

پاؤ۔۔۔۔۔ کرمل فریدی سے تمہاری شکایت کروں گا سمجھے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی ہے۔۔۔۔۔ عورت نہیں۔“

”میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔“

”آپ میرے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کر رہے ہیں۔“ حمید کا لہجہ کسی قدر

سخت تھا۔

”تو پھر۔۔۔۔۔؟“ قلندر آنکھیں نکال کر بولا۔

”میں اُسے بذریعہ وارانٹ کسی تھانے میں طلب کر کے بیان لے سکتا ہوں۔“

”ارے نہیں کپتان صاحب۔ بڑی چکنی ٹوٹیا ہے۔“ قلندر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”تمیز سے گفتگو کرو۔۔۔۔۔“ حمید کو بھی غصہ آگیا۔

”جھک مارتے رہو۔“ قلندر نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پھانک کی ذیلی

کوٹھی کھول کر کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں ابھی تم دونوں کو مقامی پولیس

اسٹیشن میں بلوائے لیتا ہوں۔“

قلندر نے کھڑکی کھول کر سر نکالا اور کسی نکلھنے کے کی طرح غرایا۔ ”وہ آج نہیں آئی۔“
”اچھا تو اُس کے گھر کا پتہ بتاؤ۔“

”جنم میں جاؤ۔“ کہہ کر اُس نے زور دار آواز کے ساتھ کھڑکی بند کی اور دوسری طرف سے چیخ کر بولا۔ ”جاؤ جو کچھ بگاڑنا ہے بگاڑ لینا۔“
پھر اُس نے محکمہ پولیس کو گندی سی گالی بھی دی۔
”اچھا، اچھا..... دیکھوں گا۔“ حمید سر ہلا کر بولا اور وہاں سے چل پڑا۔



قاسم نے بھاڑ سامنے پھیلا کر جمائی اور ایک آنکھ بند کر کے اونگھنے لگا۔
بوڑھی عورت سانسے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔
دفعۃً وہ کھکاری اور قاسم چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔
بالآخر ہاتھ ہلا کر غرایا۔ ”بھاغ..... جاؤ.....!“
”بڑے سرکار نے یاد فرمایا ہے جناب.....!“
”کون بڑے سرکار! میں کسی کو نہیں جانتا..... وہ دونوں سالے کہاں ہیں؟“
”کون دونوں.....!“

”ارے تو قیام میں اُن کے نام بھی جانتا ہوں۔“
”بھر بتائیے سرکار میں کیسے بتا سکوں گی۔“

”وہ دونوں..... وہ..... ایک لہا تھا اور دوسرا نانا.....!“

”یہاں..... نہ کوئی بہت لہا ہے اور نہ کوئی نانا! پھر میں کیا بتا سکوں گی۔“
”اب یہ بھی میں ہی تاؤں کہ تم کیا بتا سکو گی۔“ قاسم جھنجھلا کر بولا۔

”اسی لئے گنداش ہے سرکار کہ تشریف لے چلے..... خود ہی پوچھ لیجئے گا بڑے سرکار

۔ ممکن ہے وہ آپ کے سوال کا جواب دے سکیں.....!“
”چالو.....!“ قاسم اٹھتا ہوا بولا۔

بوڑھی عورت اُسے ایک بہت بڑے ڈرائنگ روم میں لائی۔ یہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے..... ایک بھاری بھر کم اور دراز قد تھا اور دوسرا دبلا چٹلا اور بوڑھا..... بوڑھے آدمی کی فرنگ کٹ ڈاڑھی بالکل سفید تھی اور سر کے بالوں میں بھی کہیں کوئی سیاہ لہر نہیں پائی جاتی تھی۔

بھاری بھر کم آدمی کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ لیکن صحت اچھی ہونے کی بناء پر معمر نہیں معلوم ہوتا تھا۔
جیسے ہی قاسم کمرے میں داخل ہوا بھاری بھر کم آدمی اٹھتا ہوا بولا۔ ”آؤ..... آؤ..... بیٹے..... ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔“

قاسم نے غصیلی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ دراصل اُس کا بے تکلفانہ انداز اُسے گراں گذر رہا تھا۔
بھاری جسم والے نے بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہل ”ڈاکٹر..... یہی ہے میرا بیٹا منور جاوید۔“
”ٹھیک جاوید.....“ قاسم جلدے لہجے میں غرایا۔ ”میں پوچھتا ہوں میں تمہاں ہوں؟“
”دیکھا آپ نے۔“ بھاری بھر کم آدمی نے دردناک لہجے میں بوڑھے سے کہا۔
بوڑھے نے قاسم کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے پر تشویش انداز میں سر کو جنبش دی..... پھر قاسم سے بولا۔ ”تم کھڑے کیوں ہو..... بیٹھ جاؤ۔“
”ٹھنچ ہے۔“ قاسم بیٹھتا ہوا بولا۔ ”تم بیٹا کہو تو ٹھنچ بھی ہے..... لیکن یہ..... جراثیم کی شکل تو دیکھو..... مجھے بیٹا کہتے ہیں۔“

”دیکھا آپ نے؟“ بھاری بھر کم آدمی نے پھر بوڑھے سے کہا۔
”ہوں.....!“

”بالکل نہیں پہچانتا..... ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسے میں اُس کے لئے اجنبی ہوں۔“
بھاری بھر کم آدمی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ارے.....!“ قاسم ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”تم کہاں کی ہانک رہے ہو.....“

”یا اللہ میرے حال پر رحم کر.....!“ بھاری بھر کم آدمی کی آواز رقت آمیز تھی۔

”ارے..... ادھر دیکھو..... میری طرف..... وہ دونوں سالے کہاں ہیں..... اور یہ کیا چار سو میں ہے..... اب میں واپس جانا چاہتا ہوں..... اور تم ابھی منور جاوید کے کہہ رہے تھے..... میں تو قاسم ہوں قاسم۔“

”دیکھا آپ نے.....!“ بھاری بھر کم آدمی نے پھر بوڑھے کو مخاطب کیا۔

بوڑھا قاسم کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے سر ہلاتا رہا۔

”نہیں دیکھا انہوں نے۔“ قاسم جھلا کر بولا۔ ”تم دیکھو میری طرف.....!“

”بیٹے بیٹے..... ہوش میں آؤ.....“ بھاری بھر کم آدمی قریب قریب رو دیا۔

”اے اے.....!“ قاسم دانت پیس کر گھونسنہ ہلاتا ہوا بولا۔ ”میں جیادہ لمبا مذاخ پسند

نہیں کرتا..... ہو گئی تھوڑی دیر کی..... ہاں.....!“

بھاری بھر کم آدمی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر باقاعدہ طور پر سسکیاں لینے لگا۔ بوڑھا

آدمی اُس کے قریب آیا اور شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سر

جاوید..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔“

بھاری بھر کم آدمی بدستور منہ چھپائے ہوئے روتا رہا۔ بوڑھے نے پوچھا۔ ”لیڈی جاوید

کہاں ہیں۔“

”میں نے انہیں..... انہیں..... باہر بھیج..... بھجوا دیا ہے.....!“ بھاری بھر کم

آدمی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکتیں۔“

”اچھا کیا..... اچھا ہی کیا!“ بوڑھا سر ہلا کر بولا۔ ”بہر حال میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں

کہ..... اکثر لوگ وقتی طور پر اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ مرض مستقل نہیں ہوتا.....!“

”اے او سالو..... یہ قیا گھلا ہو رہا ہے۔“ قاسم دہاڑا۔ ”تو ن سالو اپنی یادداشت کھو

بیٹھا ہے۔“

”بڑی بی..... تم اسے لے جاؤ.....“ بھاری بھر کم آدمی سسکیوں پر قابو پانے کی

کوشش کرتا ہوا بولا۔

”لے گئیں بڑی بی۔“ قاسم نے کسی لڑاکا عورت کی طرح ہاتھ نچا کر کہا۔ پھر صوفے کے

ہتھے پر گھونسنہ مار کر بولا..... ”تم کون ہو..... اور مجھے کہاں لائے ہو۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”کون دونوں..... میرے بیٹے.....!“ بھاری بھر کم آدمی نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

”وہی دونوں جو مجھے لانچ پر بٹھا کر لائے تھے۔“

”میں نہیں جانتا کہ وہ دونوں شریف آدمی کون تھے..... انہوں نے تمہیں سونار میں

بھٹکتے دیکھا تھا اور یہاں پہنچا گئے تھے..... وہ شائد پہلے بھی تمہیں میرے ساتھ دیکھ چکے

تھے..... اس لئے سیدھے یہیں آئے۔ انہیں ہرگز یہ نہیں معلوم تھا کہ تم میرے بیٹے ہو۔“

”اچھا تو کیا میں تمہارا بیٹا ہوں۔“

”میرے خدا..... میرے خدا.....“ بھاری بھر کم آدمی آنکھیں بند کر کے بڑبڑایا۔

”میں کیا کروں میں کیا کروں.....!“

”یہ کرو..... کہ مجھے جانے دو..... تم نے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں.....

میں باہر نہیں جاسکتا۔“

کوئی کچھ نہ بولا۔

پھر قاسم کچھ اور کہنے والا تھا کہ اچانک بھاری بھر کم آدمی نے پھر رونا شروع کر دیا.....

اس بار آواز سسکیوں کی حدود سے باہر نکل گئی تھی۔

اُن کی شناخت

نہ جانے کیوں حمید نے اپنی دھمکی کو عملی شکل دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اُس دن ٹال

ئی گیا۔ دوسرے روز پھر جزیہ سونار کے ساحل پر موجود تھا۔

سائرہ کو لانچ سے اڑتے دیکھا..... لیکن فوری طور پر اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی

کوشش نہیں کی۔ خاموشی سے اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ کسی ایسی جگہ روکنا چاہتا تھا جہاں کچھ دیر

کیفے ڈرمیرز کے قریب اُس نے اُسے جا ہی لیا۔

”کل سے پریشان ہوں.....!“ حید بولا۔

”کیوں.....؟“ وہ جھنجھلا گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”اوہ..... آپ ہی تھے۔ شاید اُن دن..... میرا مطلب ہے جنہوں نے اُس جھگڑے کے متعلق پوچھ گچھ کی تھی۔“

”جی ہاں..... اور اب پھر تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں..... آئیے ڈرمیرز میں۔“

”مجھے افسوس ہے آپ وہیں تشریف لائیں..... دس منٹ کے اندر اندر مجھے ڈیوٹی پہنچنا ہے۔“

”کل آپ نہیں آئی تھیں..... اچھا چلتی رہے۔“

”جی ہاں..... کل نہیں آئی تھی۔“

وہ پھر آگے بڑھ گئے..... حید اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔

”میں سمجھا تھا شاید قلندر نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ حید نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا بھی چاہتی ہے لیکن کسی وجہ سے شاید

زبان کھولنا مناسب بھی نہیں سمجھتی۔

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ جیسی شائستہ خاتون اُسے کس طرح برداشت کرتی ہے۔“

”ملازمت ٹھہری۔“ سارہہ کالجیہ تلخ تھا۔

”کل تو میں نے سوچا تھا کہ اُسے تھانے ہی میں بلاؤں مگر پھر مصنف سمجھ کر چھوڑ دیا۔“

”آپ ہی کی لائن کا مصنف ہے۔“

”جھک مارتا ہے۔ میں نے تو کبھی پڑھی نہیں اُس کی کوئی کتاب۔ البتہ پڑھے لکھے لوگوں

کو کہتے سنا ہے کہ سکشن بلیک سیریز کے ناولوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔“

”نہیں.....!“ وہ چلتے چلتے رک گئی۔

”بس کاربن کاپی سمجئے! نام اور مقام بدل کر پیش کر دیتا ہے۔“

”اب میں سمجھی۔“

”کیا سمجھیں؟“

”میں اُس کے طریقہ کار کو سنک سمجھتی تھی۔“

”کیسا طریقہ کار.....؟“

”کمرے میں بند ہو کر مائیک پر ڈکلیٹ کرتا ہے..... میں دوسرے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔“

”بہت چالاک ہے۔“

”او نہہ..... مجھے کیا۔“ سارہہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”ہاں آپ کیا پوچھنا چاہتے تھے۔“

”اگر آپ اُن دونوں کو دوبارہ دیکھیں تو پہچان لیں گی نا.....!“

”یقیناً پہچان لوں گی۔“

حید نے دونوں تصویریں نکالیں..... اور بولا۔ ”بتائیے؟ کیا یہی دونوں تھے!“

”بلاشبہ یہی تھے.....!“ وہ دیکھتے ہی بولی۔

”اب یہ بتائیے کہ ان میں سے کون لمبا تھا اور کون کوتاہ تھا.....!“

یہ بتانے میں بھی سارہہ نے دیر نہیں لگائی تھی۔ حید اُس کے جوابات کے مطابق

تصویروں کی پشت پر کچھ لکھنے لگا تھا۔

”اچھا..... بہت بہت شکریہ۔“ اُس نے کہا۔

”ٹھہریئے..... میری ایک بات کا بھی جواب دیتے جائیے۔“

”فرمائیے۔“

”اس کیس میں میری کیا حیثیت ہوگی۔“

”کچھ بھی نہیں..... میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو عدالت میں بھی اُس کے متعلق

کچھ نہ کہنا پڑے۔“

”پھر آخر اس کا کیا مطلب ہے؟“

”کس کا..... کیا مطلب؟“ حید نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا تعاقب کیوں کیا جاتا ہے؟“

”کون کرتا ہے تعاقب.....؟“

”آپ کے محلے کا کوئی آدمی.....!“

”قطعی نہیں۔ میں اس کیس کا انچارج ہوں..... اگر اس قسم کی کوئی بات ہوتی تو میری

عی وساطت سے ہوتی۔“

”پھر وہ کون ہے؟“

”براہ کرم مجھ سے اُس کے متعلق ضرور بتائیے۔“

”یہاں سے واپس جانے لگتی ہوں تو لانچ کے قریب کھڑا ملتا ہے۔ ایگل بیچ بیچ کر وہاں سے ایک ہی بس میں ہم دونوں شہر تک جاتے ہیں۔ وہاں سے گھر تک پیدل تعاقب کرتا ہے کچھ دیر مکان کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ صبح جب گھر سے یہاں آنے کے لئے نکلتی ہوں تو اُس پاس ہی موجود ہوتا ہے۔..... یہاں تک ساتھ آتا ہے۔“

”تب تو..... وہ اس وقت بھی.....!“ حمید چلتے چلتے رک گیا اور پھر دفعتاً پچھڑا۔ سارہ جوں کی توں کھڑی رہی، اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔.....

”مجھے تو کوئی بھی نہیں دکھائی دیتا۔..... یہاں سے موٹر تک سڑک سنسان ہے۔“

”گھسی ڈاڑھی والا.....“ وہ مڑے بغیر آہستہ سے بولی۔

”ارے..... ایک تنفس بھی نہیں ہے۔“

سارہ بھی مڑ کر دیکھنے لگی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔

”تعب ہے..... حالانکہ لانچ سے اترتے وقت تک وہ میرے پیچھے رہا تھا۔“

”بہر حال! میرا حکم آپ میں اس حد تک دلچسپی نہیں لے رہا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”میں نہیں سمجھ سکتی..... کیا چکر ہے۔“

حمید نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ“

مجھے ان نمبروں پر فون کر سکتی ہیں۔ جب بھی ضرورت محسوس کریں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

”میں دیکھوں گا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے..... اچھا شکریہ۔“

حمید وہیں سے ساحل کے لئے مڑ گیا۔

فریدی سے ایگل بیچ والے ہٹ میں ملاقات ہونے کی توقع تھی۔ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ انہیں قاسم کی تلاش تھی۔ وہ اکثر تبدیلی کے لئے ایگل بیچ چلا آتا تھا۔ قاسم والے واقعہ سے اسی حد تک دلچسپی تھی کہ اُس کے خاندان والوں نے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

حمید نے دونوں تصویریں اپنے نوٹ سمیت اُس کے سامنے رکھ دیں۔ فریدی کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے اچانک وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔

”لو کی نے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کی۔“ اُس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”کو تاہ قد کا نام قادر ہے اور لمبے آدمی کا نام جواد..... دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور بزنس بھی ہمیشہ شرکت ہی میں ہوتا ہے..... اسمگلر قسم کے سرمایہ داروں کے لئے مناسب معاوضے پر کام کرتے ہیں۔“

”تو پھر اب مجھے کیا کرنا چاہئے.....!“ حمید نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے پوچھا۔

”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔“

”پھر حمید نے سارہ کی کہانی دہراتے ہوئے اُس آدمی کا تذکرہ کیا جو اُس کے بیان کے مطابق اُس کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔

”بظاہر اس معاملے میں اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”لڑکی کا خیال تھا کہ ہمارا حکم اُس میں اس حد تک دلچسپی لے رہا ہے.....!“

”ہوں.....!“

حمید پائپ سلگا رہا تھا۔



قاسم کو اس کی قطعی فکر نہیں تھی کہ اُس کے گھر والے پریشان ہوں گے اور نہ یہی اندازہ تھا کہ وہ کتنے دنوں سے اس پکر میں پڑا ہوا ہے۔ اُس کی زبان تو ہر وقت اُن لذیذ کھانوں پر رال ٹپکتی رہی تھی، جو وافر مقدار میں اُس کے سامنے آتے تھے اور کوئی یہ کہنے والا بھی نہیں تھا کہ بھوک رکھ کر کھانا..... بے حد خوش تھا کہ چلو اُس جلتے تن بیوی سے تو پیچھا چھوٹا، جو اُسے پیٹ بھر کھاتے ہی نہیں دیکھ سکتی تھی..... سر پر سوار رہتی تھی۔ کجنت لوگ

”ہناتا ہوں۔“ ڈاکٹر کی آواز سے دبا ہوا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ ”لیکن اس گفتگو کے دوران میں لیڈی جاوید کی موجودگی ضروری نہیں۔“

”میں جارہی ہوں.....!“ عورت اٹھتی ہوئی ہوئی۔

وہ لاہریری سے چلی گئی۔ قاسم اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بڑی زوردار عورت ہے اُس نے سوچا۔

ڈاکٹر سر جاوید سے کہہ رہا تھا۔ ”دراصل آپ کی یہ بے جوڑ شادی ہی صاحبزادے کے مرض کا باعث بنی ہے۔“

”بھلاہ کیسے؟“ سر جاوید کا لہجہ غصیلا تھا۔

”صاحبزادے نے اس سے گہرا اثر لیا اور یادداشت کھو بیٹھے..... آپ نے سنا نہیں کیا کہا تھا..... بیٹی۔“

”لا حول ولا قوۃ.....!“

قاسم ساری گفتگو سن رہا تھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ تو اُس عورت کے متعلق سوچے جا رہا تھا اور اُن کی گفتگو نے یہ بات بھی اُس پر واضح کر دی تھی وہ عورت سر جاوید کی بیوی ہی ہو سکتی ہے۔

”آپ نہیں سمجھ سکتے۔“ ڈاکٹر سر جاوید سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ نفیات کی گتھیاں ہیں..... بعض واقعات انسانی ذہن کے لئے اتنے اذیت ناک ثابت ہوتے ہیں کہ وہ نہ صرف اُن واقعات کی حد تک یادداشت کھو بیٹھتا ہے بلکہ اُن سے تعلق رکھنے والی دوسری چیزیں بھی شعور کی سطح سے نیچے پھینک دیتا ہے۔ مثال کے طور پر نہ صرف یہ شادی صاحبزادے کے ذہن سے محو ہو گئی بلکہ اپنے دونوں بھی اجنبی بن کر رہ گئے۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں کہ وہ آپ کے بیٹے ہیں۔ آپ کے بیٹے کی حیثیت سے جس نام سے پکارے جاتے تھے وہ بھی۔“

اتنے میں قاسم کو چھینک آگئی اور وہ دونوں ہی اچھل پڑے..... ایسی گرجدار آواز تھی کہ دیواریں تک جھنجھٹا اٹھیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا.....!“ سر جاوید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز بھی بدل گئی ہے..... کاف کو قاف اور گاف کو غین بولتا ہے۔“

رہتی تھی۔ ارے اب بس کرو، بیس چپائیاں تو کھا چکے..... بیس چپائیوں میں بھلا کیا ہو..... بیس تنوریاں ہوں تو بات بھی ہے..... کئی بار اُس نے تجویز پیش کی تھی کہ باورچ خانے میں تنور کیوں نہ لگوادیا جائے۔ بیوی ایسی تجویز کو لے اڑتی تھی۔ ایسا مصلحہ اڑاتی تھی کہ قاسم کو بعض اوقات رونا آجاتا تھا..... اُس کا بگڑ ہی کیا سکتا تھا..... قبلہ والد صاحب کے ہنر کے توسط سے اُسے اُس کی ساری باتیں ہضم کرنی پڑتی تھیں۔

مگر یہ کیا چکر تھا..... وہ سوچتا..... آخر یہ سالہا سر جاوید کون ہے جو مجھے اپنا بیٹا ڈالنے پر تل گیا ہے..... اور سنو..... میں یادداشت بھی کھو بیٹھا ہوں کہ باپ صاحب کی پہچان ہی نہیں سکتا اور یہ سالہا بڈھا جسے سر جاوید ڈاکٹر کہتا ہے..... خواہ مخواہ دماغ چاٹا کرتا ہے۔ بے تنگی پوچھتا ہے۔ کہتا ہے یہ یاد کر کے بتاؤ..... وہ یاد کر کے بتاؤ..... اچھا بیٹا اب بتاؤں گا تم کو..... اب کے آؤ..... ایسا آلو بتاؤں گا کہ زندگی بھر یاد کرو گے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بوڑھی ملازمہ پھر اُسے لاہریری میں لے گئی۔ یہاں سر جاوید کے ساتھ ایک عورت بھی نظر آئی۔ وہ بھی اُسی کی طرح لیم شیم تھی۔ لیکن ساتھ ہی خوش شکل بھی..... عمر پچیس چھیس سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔

بوڑھا ڈاکٹر بھی موجود تھا..... قاسم اُس عورت کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا۔

”ہاں..... ہاں.....!“ سر جاوید سر ہلا کر بولا۔ ”پچانو..... یہ کون ہیں.....!“

”پپ..... پچانوں..... پچان لوں.....!“ قاسم کے کہنے کا انداز بوکھلاہٹ سے بھرپور تھا۔

”ہاں ہاں..... بیٹے۔“

”یہ..... یہ..... وہ ہیں.....“ قاسم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے!

”کون ہیں!“ ڈاکٹر کا لہجہ پر امید تھا اور اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”ان کی بیٹی۔“ قاسم نے سر جاوید کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اوہ.....“ ڈاکٹر ان پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”ناؤدی کیٹ از آؤٹ آف بیگ.....!“

”کیا مطلب.....!“ سر جاوید نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

”سب کچھ ممکن ہے سر جاوید۔“ بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے تو ایسے کیس دیکھے ہیں کہ لوگ یادداشت کھو بیٹھنے کے بعد کچھ بول ہی نہیں سکتے۔ نوزائیدہ بچوں کی طرح غول غارتے ہیں۔۔۔۔ اور پھر اسی طرح بتدریج بولنا سیکھتے ہیں جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ سیکھتا ہے! شکر کیجئے کہ یہ ٹوٹل لاس آف میموری نہیں ہے!۔۔۔۔۔ شخصیتیں بدل جاتی ہیں جناب۔“

”لیکن اب کیا ہو گا۔“

”فکر نہ کیجئے۔۔۔۔۔ یہ اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن وقت لگے گا۔ ہاں یہ تو بتائیے ڈرنک بھی کرتے تھے یا نہیں۔“

”اعتدال کے ساتھ!۔۔۔۔۔“

”اب کیا حالت ہے!۔۔۔۔۔“

”میری دانست میں تو اس حال کو پہنچنے کے بعد اس نے شراب نہیں ماگی۔“

”اچھا اب آپ جانیے۔۔۔۔۔ اور لیڈی جاوید کو بھیج دیجئے۔“

سر جاوید چلا گیا اور ڈاکٹر نے قاسم کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ ”آپ کون سی دہائی پیتے ہیں۔“

”اے تم لوغ مجھے الوکیوں بنا رہے ہو۔۔۔۔۔ بتاؤ۔“

”آپ نے کب سے نہیں پی۔“

”میں کبھی نہیں پیتا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر نے پر تشویش انداز میں سر کو جنبش دی۔

اتنے میں وہی لچم لچم عورت کمرے میں داخل ہوئی اور ڈاکٹر اٹھتا ہوا بولا۔ ”تشریف

لائیے لیڈی جاوید۔“

قاسم بھی یک یک سعادتمند نظر آنے لگا۔

”کیا آپ کا اُن سے کبھی کسی بات پر اختلاف رائے ہوا تھا۔“ ڈاکٹر نے لیڈی جاوید

سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں ڈاکٹر۔۔۔۔۔ میں سر جاوید سے زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی۔ میں نے اپنی

طرف سے کبھی یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ ہمارے درمیان کوئی سوتیلارشتہ ہے!“

”ان کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا۔“

”کبھی برا نہیں رہا۔ میرا احترام کرتے تھے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

قاسم نکلیوں سے لیڈی جاوید کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی نظر چرا کر اس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے کھار کر کہا۔ ”لیڈی جاوید۔۔۔۔۔ ان کی یادداشت جب بھی واپس آئے گی آپ ہی کے توسط سے واپس آئے گی۔“

”بتائیے میں اس کے لئے کیا کروں۔“

”انہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کیجئے۔ سر جاوید کا سامنا نہ ہونے پائے تو بہتر ہے۔“

”بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔۔ آپ ہی انہیں سمجھا دیجئے گا۔“

”میں سمجھا دوں گا۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

چھلاوا

کپٹن حمید نے ریسپور کریڈل پر رکھتے ہوئے کرنل فریدی سے کہا۔

”پرنسٹن کے انچارج کی کال تھی اُس نے اُن دونوں کو روک رکھا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔۔۔۔۔ جاؤ دیکھو۔“ فریدی نے کاغذات پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

”نہیں آپ بھی چلے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے میں انہیں ہینڈل نہ کر پاؤں۔“

”بھئی مجھے مت گھسیٹو اس معاملے میں۔۔۔۔۔ اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اتنی خود

”وہیں جہاں اُسے ہونا چاہئے تھا۔“

”سبیدگی سے میرے سوالات کے جواب دو.....“ فریدی نے سخت لہجے میں کہا۔
”میں نے غلط نہیں کہا..... ہمیں اُس کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ وہ اپنی

یادداشت کھو بیٹھا ہے..... اُسے گرین ہوٹل سے کہیں اور نہ جانے دیں!“

”نگرانی پر کس نے مامور کیا تھا۔“

”سینٹھ عاصم کے سیکریٹری نے۔“

”اوہ..... اچھا تو پھر کیا ہوا؟“

”جب ہم نے دیکھا کہ پولیس کیس بن جائے گا تو ہم نے اُسے وہاں سے ہٹالے جانا ہی مناسب سمجھا۔“

”اوہ خود کو پولیس سے متعلق ظاہر کیا..... کیوں؟“

”مجبوری تھی جناب..... اگر ہم ایسا نہ کرتے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہی نہیں

ہو سکتے تھے۔ لوگ یقیناً ہمارے پیچھے آتے۔“

”ہوں تو پھر تم اُسے کہاں لے گئے۔“

”سیکریٹری کی لانچ پر.....!“

”کیا وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔“

”جی ہاں..... ہم سے کہا گیا تھا کہ جب بھی مزید ہدایات کی ضرورت محسوس ہو ہم

اُس لانچ پر پہنچ جائیں۔ غالباً وہ ہمیشہ وہاں موجود رہتی ہے۔“

”پھر کیا ہوا.....؟“

”اُسے ہم سیکریٹری کے حوالے کر کے چلے آئے تھے۔“

”وہ اُس وقت لانچ پر موجود تھا۔“

”جی ہاں.....!“

”اُس کام کا معاوضہ کتنا اور کب ملا تھا۔“

”پانچ سو روپے..... دوسرے دن۔ ہمیں ہماری قیام گاہ ہی پر مل گئے تھے۔“

”سیکریٹری خود آیا تھا۔“

اعتمادی تو تم میں ہوئی ہی چاہئے۔“

”دیکھئے..... یہ میرا کام ہے۔ آپ خواہ مخواہ دنیا بھر کے کام سینٹھ پھرتے ہیں اور میں مجھے بھی جھوٹک دیتے ہیں..... تب میں تو کچھ نہیں کہتا۔“

”یار کوئی کام میں کام بھی ہو۔“ فریدی کاغذات کو ایک طرف ہٹا کر اٹھتا ہوا ہوا
”چلو.....!“

دونوں آفس سے باہر آئے۔ لیکن پارکنگ شڈ میں کھڑی تھی۔ حمید اگلی سیٹ پر
کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ فریدی انجن اشارت کرتا ہوا بولا۔ ”صاحبزادے یا تو کسی عیاشی کے
میں پڑ گئے ہیں..... یا وہ دونوں سینٹھ عاصم سے کوئی لمبی رقم وصول کرنا چاہتے ہیں۔“
”عیاشی کے پھیر میں وہ تنہا کبھی نہیں پھنستا۔“

”کیا مطلب.....!“

”مجھے اطلاع دیئے بغیر اپنے کسی عشق کو آگے نہیں بڑھاتا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ پرنسٹن کے تھانے تک آئے..... قادر اور جواد وہاں موجود
تھے۔ پرنسٹن کے تھانے کا انچارج انہیں دفتر میں چھوڑ کر خود باہر چلا گیا۔ حمید نے محسوس
ہیے وہ دونوں فریدی کو پہچانتے ہوں۔

”کیا مشاغل ہیں آج کل آپ حضرات کے۔“ فریدی نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

”وہی پرانی کمیشن اسٹیجٹی۔“ لمبے آدمی نے جواب دیا۔ لہجے میں اکٹھاٹ تھی۔

”ایک ہنگامے کے تفتیش کے سلسلے میں تمہیں یہاں بلوایا گیا ہے۔“ فریدی اُس

آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”بھلا ہمیں ہنگاموں سے کیا سردکار۔“

”پانچویں تاریخ کی بات ہے! سونا میں..... کسی ایسے آدمی کا جھگڑا تھا جس نے ایک

عورت کو کاندھے پر بٹھار کھا تھا۔“

”اوہ.....!“ دونوں نے بیک وقت کہا اور ہنس پڑے۔ فریدی انہیں استفہامیہ نظر

سے دیکھتا رہا۔ آخر جواد نے پوچھا۔ ”آپ اُس کے متعلق کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”تم دونوں اُسے کہاں لے گئے تھے؟“

”جی نہیں..... وہ کوئی اور تھا۔“

”سکریٹری کو پہلے سے جانتے تھے۔“

”جی نہیں! لیکن شائد وہ ہمیں اچھی طرح جانتا تھا۔ ورنہ ہم سے یہ کام ہی کیوں لیتا۔“

”اُس آدمی کو بھی پہلے سے جانتے تھے جس نے وہ ہنگامہ برپا کیا تھا۔“

”جی نہیں..... سکریٹری ہی نے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ عاصم کا لڑکا ہے۔“

”سیٹھ عاصم سے کبھی ملے ہو.....!“

”جی نہیں..... اُس کا بھی نام ہی سنا ہے۔ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

فریدی نے ہاتھ بڑھا کر کسی کے نمبر ڈائریل کئے اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”سیٹھ عاصم“

پلیز.....!“

چند لمبے خاموش رہا پھر بولا۔ ”ہلو، عاصم صاحب! میں فریدی بول رہا ہوں۔“

پرنسٹن پولیس اسٹیشن سے..... ذرا اپنے سکریٹری کو یہیں بھیج دیجئے۔“

”جی ہاں..... جتنی جلدی ممکن ہو..... بلکہ فوراً..... شکریہ۔“

ریسیور رکھ کر وہ سگار سلگانے لگا۔ لیکن اب وہ اُن دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا

حمید نے محسوس کیا جیسے ان دونوں کا اضطراب بڑھ گیا ہو۔ وہ فریدی کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے اس کال نے انہیں الجھن میں مبتلا کر دیا ہو۔

فریدی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگار کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ لیکن وہ اب اُن

اُن دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک کار تھا نے کی کپاؤنڈ میں آکر رکی اور اس پر سے سیٹھ عاصم

سکریٹری اترا۔ حمید اُسے پہچانتا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے دیکھا کہ وہ برآمدے میں رک کر ایک

کانٹینیل سے کچھ پوچھ رہا ہے۔ کانٹینیل نے ہاتھ اٹھا کر دفتری طرف اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر پہلے

سکریٹری دفتر میں داخل ہوا۔ وہ دونوں بھی اُس کی طرف دیکھنے لگے تھے اور فریدی اُن تینوں

کے چہروں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”کرئل فریدی صاحب؟“ سکریٹری نے ایک ایک کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں..... تشریف رکھئے۔“ فریدی نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”فرمائیے.....!“ سکریٹری نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ ان دونوں کو پہچانتے ہیں۔“

اُس نے متحیرانہ انداز میں باری باری سے دونوں کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔

”جی نہیں؟“

”لیکن یہ دونوں تو کہتے ہیں.....!“ فریدی نے جملہ پورا نہیں کیا۔

”کیا کہتے ہیں.....!“ سکریٹری کے لہجے میں بھی استعجاب تھا۔

”یہی کہ یہ دونوں آپ کو پہچانتے ہیں اور آپ بھی انہیں.....!“

”ہم نے کب کہا ہے؟“ دونوں یک وقت بولے۔

”یہ سیٹھ عاصم کے سکریٹری ہیں۔“

”اوہ.....!“ جواد جلدی سے بولا۔ ”لیکن یہ وہ نہیں ہیں۔“

”ان کے علاوہ سیٹھ عاصم کوئی دوسرا سکریٹری نہیں رکھتے..... کیوں جناب۔“

”جی ہاں.....؟“ سکریٹری بولا۔ وہ اب بھی اُن دونوں کو گھورے جا رہا تھا۔ لیکن اُسی

طرح جیسے کوئی کسی اجنبی کو دیکھتا ہے۔

”تب تو پھر ہمیں دھوکا دیا گیا..... ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے خود کو سیٹھ عاصم

کا سکریٹری ہی ظاہر کیا تھا.....؟“

”لہذا.....!“ فریدی جواد کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔ ”تم دونوں اُس وقت تک

حراست میں رہو گے جب تک اس دوسرے سکریٹری کا سراغ نہ ملے۔“



سارہ کا خیال آتے ہی دل میں عجیب سی گدگدی محسوس ہوئی..... کتنی اچھی لگتی تھی اس وقت جب باتیں کرتے کرتے دفعتاً نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگتی اور پھر اس

طرح بولنا شروع کر دیتی جیسے ابھی ابھی خواب سے بیدار ہوئی ہو۔

حمید آج کل زیادہ تر اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی سونار ہی کی طرف جا رہا تھا..... قاسم کی تلاش بھی ابھی تک سونار سے آگے نہیں بڑھی تھی..... وہ جواد کو پچھلے دن سونار لائے تھے اور وہاں اُس لالچ کی تلاش دیر تک جاری رہی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے کیا تھا۔ لیکن اُس کا سراغ نہیں مل سکا تھا..... گھٹا کے دوسرے ملاحوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق روزانہ کتنی ہی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جواد اور قادر اُس لالچ کی کوئی ایسی خاص نشانی بھی نہیں بتا سکے تھے جس کی بناء پر تلاش آگے بڑھ سکتی۔

بہر حال وہ دونوں ابھی تک حراست میں تھے۔ انہوں نے اس کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ کوئی اُن کا ضامن بن کر انہیں رہائی دلا دیتا۔

”ہم اب اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔“ جواد نے کہا۔ ”تاوقتیکہ وہ آدمی ہاتھ نہ آجائے، جس نے ہم سے یہ کام لیا تھا ہم حوالات ہی میں رہنا مناسب سمجھیں گے۔“ اور پھر فریدی کو یہ کہنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا کہ اب یہ حقیقتاً ایک سیریس قسم کا کیس بن گیا ہے۔

قاسم کی بیوی بے حد پریشان تھی اور عاصم صاحب کی بوکھلاہٹوں کا کیا پوچھنا۔ اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ اپنے اعزاء پر بھی شبہ ظاہر کر بیٹھے تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اُن سے اس طرح پوچھ گچھ نہ کی جائے جو انہیں اُن کی طرف سے بدگمان کر دے۔

ہر طرف تفتیش کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک تو کامیابی کی صورت نظر نہیں آئی تھی..... اس لئے اب مجبوراً سارہ.....؟ ویسے اگر اُس نے کسی ایسے آدمی کا تذکرہ نہ کیا ہو تا جو اُس کا تعاقب کیا کرتا تھا تب بھی حمید کو اُس کے علاوہ اور کوئی ایسا نہ دکھائی دیتا جس کے ذریعہ مجرم یا مجرموں تک رسائی اُس کی دانست میں ممکن ہوتی۔ آج وہ شہر ہی سے اُس کا تعاقب کرتا ہوا ایگل سچ تک پہنچا تھا۔

شہر سے ایگل سچ تک تو کوئی بھی ایسا نہیں نظر پڑا تھا جس پر سارہ کے تعاقب کرنے کا

شبہ ہو سکتا۔ لیکن جب وہ سونار کے لئے لالچ پر بیٹھنے لگی تھی تو ایک آدمی قریب کے ایک چائے خانے سے نکل کر لالچ کی طرف جھپٹا تھا۔ حمید نے محسوس کیا کہ اُس کا حلیہ سارہ کے بیان کردہ ملے سے مختلف نہیں تھا۔

البتہ وہ شاید تاریک شیشوں کی عینک کا تذکرہ کرنا بھول گئی تھی۔

وہ بھی اسی لالچ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ٹھیک سارہ کے پیچھے والی سیٹ منتخب کی تھی۔ حمید اُس کے پیچھے جا بیٹھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ آدمی اجنبی ہونے کے باوجود بھی کچھ جانا پہچانا سا ہو۔

ہر چند کہ سارہ کا رخ اس کی طرف نہیں تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ مضطرب ہو۔ ویسے ایک بار بھی اُس نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔

پھر لالچ نے ایگل سچ کا ساحل چھوڑا تھا اور سونار کے ساحل سے آگئی تھی۔ دوسرے مسافر اترتے رہے لیکن حمید بیٹھا رہا۔ سارہ اُس سے بے خبر تھی اس لئے جب وہ اترنے لگی تو حمید نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اُس کے بعد وہ آدمی اُترا۔

سارہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتی جا رہی تھی..... اُس آدمی کے اتر جانے کے بعد حمید بھی اُترا۔

لیکن وہ آدمی سارہ کے پیچھے جا رہا تھا۔

حمید اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ گرین ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ سارہ ”بیت الحکیم“ کی طرف چلی گئی تھی۔

حمید نے فوراً ہی ہوٹل میں داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن پھر یہ احتیاط لے ہی ڈوبی۔ ڈائینگ ہال میں تو اُس کا سراغ نہ مل سکا۔ حمید نے چاروں طرف دیکھا اور یہ سوچتے ہوئے اپنے لئے ایک میز منتخب کر لی کہ وہ اسی ہوٹل کے کسی رہائشی کمرے میں موجود ہو گا۔

بیٹھتے ہی ایک ویٹر اُس کی طرف آیا۔

”چائے.....!“ حمید نے مینور پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اور چکن سینڈویچ بھی لانا۔“

ویٹر چلا گیا۔

تین کے علاوہ اور ساری میزیں خالی تھیں۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اُس کے متعلق ویٹر سے

پوچھ گچھ کرے گا۔ یقیناً وہ یہیں مقیم ہو گا۔

کچھ دیر بعد ویٹر چائے اور سینڈویچ لایا۔

”سنو.....!“ حمید نے آہستہ سے کہا اور ویٹر اُس کے چہرے کے قریب جھک آیا۔

”وہ صاحب کس نمبر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”کون صاحب۔“

”گھنی ڈاڑھی والے..... کالی عینک لگاتے ہیں۔“

”وہ.....!“ ویٹر ہنسنے لگا۔ ”جی وہ آج چائے پیئے بغیر ہی پیشاب کر کے چلتے بنے۔“

”کیا مطلب.....!“

”جی وہ روزانہ آتے ہیں..... چائے پیتے ہیں۔ پیشاب کرنے جاتے ہیں اور اُسی طرز کے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔“

”میں سمجھا تھا شاید یہیں رہتے ہیں۔“

”جی نہیں۔“

”کب سے آتے ہیں۔“

”تین چار دن سے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا..... کہتے اُن سے کچھ کہنا دیکھوں گا۔“

”ہے۔ آئیں گے تو کہہ دوں گا۔“

”نہیں..... جاؤ..... کچھ نہیں۔“

وہ چلا گیا..... حمید نے سوچا چوٹ ہو گئی۔ وہ یقیناً آگاہ ہو گیا تھا کہ اُس کا بھی تعاقب کیا

جارہا ہے ورنہ اس طرح خلاف معمول غائب نہ ہو جاتا۔

زبردستی سینڈویچ لئے اور ایک کپ چائے حلق سے اتاری۔ پھر پاپ سگا کر کرسی کی

پشت سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ”بیت الحکیم“ کی طرف جا رہا تھا۔ قلندر ہی سے چھینڑ چھاڑ سہی۔ اُس کے

چڑے پن کو ابھار کر عجیب قسم کی خوشی محسوس کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی اذیت پسندی کا کوئی قسم ہو۔

پھانک بند تھا۔ اُس نے کال بل کا بٹن دبایا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ گھنٹی میں کوئی خرابی پیدا

ہو گئی ہے۔ قلندر نے پہلے کبھی بتایا تھا۔

”ارے کوئی ہے۔“ اُس نے پھانک ہلا کر آواز دی۔

”فرمائیے جناب۔“ پشت سے آواز آئی اور حمید جھنجھلا کر مڑا۔ کیونکہ آواز قلندر ہی کی

تھی۔ ایک بار پہلے بھی یہی واقعہ پیش آچکا تھا۔

”کیا تم مجھ پر رحم نہیں کر سکتے۔“ قلندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”اُس کا پیچھا چھوڑ دو۔“

”کچھ پوچھنا ہے۔“

”کب تک پوچھتے رہو گے.....!“ قلندر یک یک غصیلی آواز میں چیخا۔ اتنے میں کسی نے پھانک بھی کھول دیا اور قلندر اُسی لہجے میں دہاڑا۔ ”تم کیوں آگئیں..... واپس جاؤ..... جاؤ.....!“

پھانک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

”اچھی بات ہے قلندر صاحب۔“ حمید نے طویل سانس لی۔ ”اب میں سچ سچ تمہیں

دیکھوں گا۔“

پھر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

خنجر

آج قاسم کھانے کی میز پر تنہا نہیں تھا وہ خور و اور لمبی ترنگی عورت بھی اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ قاسم کچھ شرمایا سا تھا..... لیکن کھانے کے معاملے میں نہیں۔ بس اُس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا اور یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اُس کی تمام تر توجہ کھانے کی طرف ہے۔

”تم بہت کھانے لگے ہو.....!“ دفعتاً لیڈی جاوید کی مترنم آواز کمرے میں گونجی۔
 ”نہن..... نہیں..... توغ.....!“ قاسم اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔
 ”میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں..... کبھی اس کے متعلق بھی سوچا ہے۔“
 ”کھانے تے بعد سوچوں غا۔“ قاسم نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔
 پھر وہ خاموشی سے کھانے میں مشغول رہے۔

لیڈی جاوید کنکھیوں سے اُسے دیکھتی جا رہی تھی۔ روٹیاں ختم۔ قاقیں صاف اب سویر
 ڈشز کی باری تھی۔ ذرا سی دیر میں اُن کا بھی صفایا ہو گیا۔
 ”اور کچھ.....!“ لیڈی جاوید نے پوچھا۔

”ہی ہی..... نہیں بس۔ آپ تے یہاں انبالہ والوں کی رس ملائی نہیں آتی کیا۔“
 ”نہیں ہمیں دیسی مٹھالیاں پسند نہیں..... تم بھی پسند نہیں کرتے تھے۔!“
 ”ارے..... واہ..... وہ رستم حلوہ..... حبشی حلوہ.....!“

”سچ کہتی ہوں..... پہلی بار تمہاری زبان سے یہ نام سن رہی ہوں۔ مجھے ان کے متعلق
 کچھ نہیں معلوم..... لکھ کر دے دینا مگلوادوں گی۔“
 ”نہ دوں غا.....“ قاسم سر ہلا کر بولا۔

”کھانے کے بعد تم قہوہ پیتے ہو۔“

”ارے توبہ توبہ..... بلکہ لاحول ولا قوۃ..... اب نام نہ لیجئے گا..... ورنہ مجھے نہ
 ہو جائے گی۔“

”ہائے تم اتنے بدل گئے ہو منور.....!“

قاسم کچھ نہ بولا۔ اس اول بدل اور یادداشت والے معاملے پر اُسے اختلاف ہونے لگا
 تھا۔ لیکن وہ کچھ بولتا نہیں تھا۔ اپنے طور پر حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن ابھی تک اُس
 نہیں سمجھ سکا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ وہ اُن کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دے لیکن پھر یہ سوچ کر
 خاموش رہ جاتا کہ کہیں اس دہاکڑ اور زور دار عورت کی ہم نشینی سے محروم نہ ہو جائے۔
 چلنے دو..... وہ سوچتا جب تک چلے چلنے دو..... میں کوئی تنہی سی گڑیا تو ہوں نہیں کہ سالے
 جیب میں رکھ کر پار لے جائیں گے..... جب چاہوں گا ٹھوک پیٹ کر باہر! کبھی سوچتا کہ

دوں کہ یادداشت واپس آگئی ہے۔ پھر دیکھوں کیا ہوتا ہے لیکن پھر ان کٹو بیگم کو سوتیلی ماں
 بھی تو سمجھنا پڑے گا..... لہذا بالکل گول رہو۔ دیکھا جائے گا اور یہ سالہا سر جاوید بالکل چغند
 معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس کا بیٹا منور میرا ہم شکل تھا جو کہیں غائب ہو گیا۔ اگر آجائے سالہا تو پھر
 کیسی رہے گی۔ جان کو آجائیں گے سب سالے۔

اس وقت بھی وہ ایسے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔
 ”منور.....!“ دفعتاً لیڈی جاوید نے اُسے مخاطب کیا۔
 ”جی.....!“

”اوہ..... تو تمہیں یاد آ گیا کہ تم منور ہو۔“
 ”جی نہیں..... آپ قہتی ہیں تو پھر منور ہی سہی۔“
 ”تمہیں میرا اتنا ہی خیال ہے.....؟“
 ”جی ہاں۔“

”میری طرف دیکھو.....!“

قاسم نے دیکھا اور بدقت اُس سکاری کو روک سکا جو اُس کے ہونٹوں کی گرفت سے
 آزادی ہونے والی تھی۔

لیڈی جاوید بڑی نیٹلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور ہونٹوں پر ایسی
 مسکراہٹ تھی..... جیسے جیسے..... اُس نے بوکھلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کیوں اُس
 کے ذہن میں اُس کی ماں کا یہ جملہ گونج رہا تھا، جو اکثر بچپن میں اُس کی زبان سے سن چکا تھا۔
 ”کسی کو نگا دیکھنے سے آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔“

”ارے باپ رے.....!“ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے ہونٹوں میں بدبایا۔

”کیا بات ہے..... منور..... میری طرف دیکھو.....!“ پیار بھرے لہجے میں کہا گیا۔

”جی غاں..... دیکھتا ہوں.....“ قاسم نے گڑبڑا کر پھر آنکھیں کھول دیں وہ اب بھی
 اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

”خدا کرے تم مجھے جلدی پہچانے لگو۔“

”جی غاں.....!“

”تم مجھے آنٹی کہتے تھے۔“

”اب نہیں کہوں غا.....!“ قاسم بے ساختہ بولا۔

”کیوں..... کیوں.....!“

”جی مجھے..... یاد نہیں۔“

”یاد ہو یا نہ ہو..... آنٹی کہنے میں کیا حرج ہے۔“

”جی..... بڑا حرج ہے۔“

”کیا حرج ہے۔“

”پتہ نہیں۔“

”پھر تم مجھے کیا کہو گے۔“

”سوچ لوں تو بتاؤں.....!“ قاسم نے کہا اور کچ سوچنے لگا کہ اُسے اُس کو کیا کہہ ا

”میں نہیں جانتا۔“

مخاطب کرنا چاہئے۔ ڈارلنگ..... مگر نہیں بھڑک جائے گی۔ سالے منور کی سوتیلی ماں پھر کہوں..... خود ہی کوئی نام رکھ دوں دیکھا جائے گا۔ وہ پیارے حمید بھائی تم نہ ہوئے..... ورنہ کوئی اچھا سا نام بتاتے..... پھر اُسے حمید کی یلیاں اور فل فلوئیاں یاد آئیں..... فل فلوئی..... فل فلوئی۔“

”میں آپ کو فل فلوئی کہوں گا.....!“ وہ تھوڑی دیر بعد بڑبڑایا۔

لیڈی جاوید ہنسنے لگی۔

”بھلا یہ کیا نام ہوا۔“

”جی ہوتا ہے..... آپ سمجھتی نہیں۔ ہم لوغ سمجھتے ہیں۔“

”کیا سمجھتے ہیں۔“

”یعنی کہ وہی..... ہی ہی ہی ہی۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے تا.....!“ لیڈی جاوید یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔

”جی بالکل ٹھیک ہے۔“ قاسم بھی اُس کی سنجیدگی پر سراسیمہ ہو گیا۔

”خدا کرے تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کتنی پریشان ہوں!“

لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں کچھ ہو جائے۔“

”کون لوگ.....!“ قاسم ہمہ تن اشتیاق بن گیا۔

”تمہارے سوتیلے چچا اور اُن کے ہمدرد.....!“

”جی میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”تم سب کچھ بھلا چکے ہو..... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو معاہدے کے مطابق ساری

جائیداد سارا کاروبار بالآخر تمہارے سوتیلے چچا اور اُس کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ مجھے

بھی ایک پیسہ نہ ملے گا..... پھر بس یہ سب کچھ تمہارے پاپا کی زندگی ہی تک ہو گا۔“

”مجھے اُس کے بارے میں پوری طرح بتائیے۔“

”تم سب کچھ جانتے تھے منور..... لیکن میں تمہیں بتاؤں گی شاید اسی طرح تمہاری یاد

داشت واپس آ سکے۔ جانتے ہو اگر اُسے اس کا علم ہو جائے کہ تم اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو تو

کیا ہو گا۔“

”تمہارے وجود کو فراڈ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا..... جب تم عدالت میں اپنا نام

قاسم بتاؤ گے تو وہ یہاں تک ثابت کر دینے کی کوشش کرے گا کہ سر جاوید کے کبھی کوئی لڑکا

تھای نہیں۔ اس طرح تمہارے پاپا کے بعد ہم دونوں مفلسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور

ہوں گے۔“

”کیا دوسرے لوگوں نے سر جاوید کے لڑکے کو نہ دیکھا ہو گا۔“

”یہی تو دشواری ہے کہ تم ایسٹ افریقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں پلے بڑھے یہاں کسی

نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

وہ خاموش ہو گئی اور قاسم مجسم غور و فکر بن گیا۔





پچھلے دن بھی وہ نہیں دکھائی دیا۔ آج صبح بھی جب وہ گھر سے نکلی تھی تو اندیشہ تھا وہ گلی کے کنارے پر موجود ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج بھی کسی نے اُس کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ دو بجے تک وہ قلندر کا ناول لکھتی رہی تھی۔ پھر قلندر نے مائیکروفون پر اعلان کیا کہ اب وہ بوریت محسوس کر رہا ہے اس لئے کام نہ ہو سکے گا..... وہ چاہے تو گھر جاسکتی ہے۔ پھر وہاں اُس کی موجودگی ہی میں قلندر بندوق اور کارٹوسوں کی چینی سنجال کر باہر نکلا گیا تھا۔ بوریت محسوس کرنے کے اعلان کے بعد وہ ہمیشہ بندوق ہی سے جی بہلاتا تھا..... پھر آج کل تو بیلے۔

سارہ نے باورچی سے ایک کپ چائے کی فرمائش کی تھی اور چائے پی کر ٹھیک تین پلے ساحل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ لالچ پر ایک ایسے آدمی کے مقابل بیٹھی تھی جس کی ناک اور ہونٹ بے ہنگم نہ ہوتے نہ خاصہ دلکش جوان ہوتا۔

ناک کی نوک اوپر اٹھی ہوئی تھی اور اوپری ہونٹ بھی سکر کر اس طرح اوپر اٹھ گیا تھا کہ سامنے کے دانت دکھائی دیتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور دلکش تھیں۔ اگر چہرے کا خوبصورت چھپایا جاتا تو کوئی بھی نہ کہہ سکتا کہ اتنی خوبصورت آنکھوں کے نیچے ایسا وہابیات ہو گا..... لباس بھی خاصا قیمتی معلوم ہوتا تھا اور اُسے سلیقے سے پہنا بھی گیا تھا۔

وہ بہر حال اُسے گھورے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظریں ملتیں اور وہ دوسری طرف دیکھ لگتی۔ پھر اُسے اُس پر غصہ آنے لگا۔ اس طرح گھورتے ہیں یہ حرام زاوے جیسے کپاہی کو جائیں گے۔ کب سدھریں گے اپنے یہاں کے لوگ۔ وہ سوچتی اور تاؤ کھاتی رہی۔ پھر اٹھا اُس کا رومال گر گیا۔ اُسے علم تھا اور وہ اٹھانے کے لئے جھک رہی تھی کہ وہ جھکا پھر اگر فوراً ہی سنجال کر سیدھی نہ ہو گئی ہوتی تو دونوں کے سر ٹکرائے ہوتے۔ اُس نے رومال اٹھا کر نہایت ادب سے اُس کے سامنے پیش کر دیا۔

”شکریہ۔“ سارہ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور رومال لے کر بے تعلقی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنے مکروہ دہانے سے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی نظر پڑی اور جی چاہا کہ منہ پر تھپڑ رسید کر دے لیکن خاموش بیٹھی رہی۔ ایگل بیچ کے ساحل پر اتر کر بس اسٹاپ کی طرف چلی تو محسوس کیا کہ وہ ٹھیک اُسی کے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

دفعتاً اُسے خیال آیا کہیں وہی نہ ہو اور اس سے پہلے نقلی ڈاڑھی استعمال کرتا رہا ہو۔ لیکن آج وہ خوفزدہ نہیں تھی اگر یہی اُس کی اصلی شکل ہے تو پتہ کار اُس کی صورت پر اُس نے سوچا اور اس خیال پر مسکرا پڑی کہ اگر سینڈل اُتار کر بھڑ جائے تو کیسی رہے گی۔ بڑی بات نہیں! ساتھ ہی شور بھی مچانا شروع کر دے کہ چھیڑا تھا..... اور پھر تماشاخیوں کی ہمدردیاں بھی اُسی کی طرف ہوں گی اور چٹنی بن جائے گی اُس صورت حرام کی۔

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ لیکن مڑی نہیں۔ اندازے سے اُسی وقت اچانک مڑنا چاہتی تھی، جب وہ قریب پہنچ چکا تھا آس پاس اور لوگ بھی آج رہے تھے اُس سے پٹ لینے کا بہترین موقع تھا۔

پھر وہ مڑی اور ایک بیک چوک پڑی وہ اُس سے بمشکل چھ یا سات قدم کے فاصلے پر رہا ہو گا۔ لیکن اُس کی ناک.....؟ اُس کے ہونٹ؟..... وہ تو..... وہ تو..... کیپٹن حمید تھا۔

”ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“ وہ قریب پہنچ کر مسکرایا۔

سارہ کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا دی۔

”نہ وہ کل نظر آیا اور نہ آج.....!“ حمید بولا۔

”میں بھی..... یہی سوچ رہی تھی۔“

”یہاں کھڑے ہو کر سوچنے سے کیا فائدہ..... میرے ساتھ آئیے۔“

وہ نہیں چاہتی تھی اس کے باوجود بھی اُس کے ساتھ چل پڑی۔

”کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔“ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی ناممکن ہے۔“

”کیا چیز.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”ناک اس طرح مستقل طور پر اٹھی رہے اور ہونٹ کھل جائیں۔“

”اسی سرکس کی روٹی کھاتے ہیں ہم لوگ۔“

”نہیں بتائیے..... یہ کیسے ممکن ہے۔“

”ممکن ہے..... تبھی تو آپ نے دیکھا تھا۔“ کیپٹن حمید نے ایک ہٹ کے سارے

رکتے ہوئے کہا۔ وہ بھی رک گئی اور حمید بولا۔ ”آئیے..... اندر چلے..... اب میرا

آپ میں خاص طور پر دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا ہے؟“

”کیوں.....؟“ وہ چونک پڑی۔

”آئیے..... اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

”اگر میں انکار کر دوں تو۔“

”مجھے کی دلچسپی مزید بڑھ جائے گی۔“

”خواہ مخواہ مجھے خوفزدہ نہ کیجئے۔“

”اس دلچسپی کا تعلق آپ کے خلاف کسی قانونی کارروائی سے نہیں.....!“

وہ دونوں ہٹ کے سنگ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ حمید نے کرسی کی طرف اشارہ ایک نامی کو نقصان پہنچے۔“

کر کے کہا۔ ”تشریف رکھئے۔“

سارہ بیٹھ گئی مگر الجھن میں پڑ گئی تھی۔

”پرسوں میں نے اس کا تعاقب کیا تھا..... لیکن وہ ڈاج دے کر نکل گیا۔“

”اوہ..... اسی لئے دو دن سے نظر نہیں آیا۔“

”سونار پہنچ کر آپ کا تعاقب کرنے کی بجائے گرین کی طرف مڑ گیا تھا۔“

”لیکن آپ سے بچ کر کیسے نکل گیا۔“

”اکثر ایسا بھی ہوتا ہے..... ہم بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”نہ

چھوڑیے..... آج آپ کی جلدی چھٹی ہو گئی۔“

”اکثر ایسا ہوتا ہے..... میرا باس سکی ہے۔ جب اُس پر بوریت کا دورہ پڑتا ہے بندو

لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ آج کل تو بلوں کی شامت آگئی ہے۔“

”شائد میری موجودگی میں بھی اُس دن ایک بلے کو گولی مار دی تھی۔“

”جی ہاں..... اور اب شائد سونار میں ایک بھی بلا زندہ نہ بچے گا۔“

”خیر..... ہو پیز اکثر مضحکہ خیز بھی ہوتی ہیں۔“

”اے آپ ہو بی کہتے ہیں۔“

”یقیناً..... میری ہو بی اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ میں مکھی مارتا ہوں۔“

وہ مسکرائی اور بولی۔ ”شروعات ملی سے ہوئی تھی۔ اُس نے ایک ملی پال رکھی تھی.....

نئی سر چڑھی تھی کہ میز پر اُسی کی پلیٹ میں کھاتی تھی۔ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتی۔ دفعتاً

ایک بلا دونوں کے درمیان آگیا اور وہ زیادہ تر گھر سے غائب رہنے لگی۔ جھاہٹ میں ایک دن

س نے اس ملی کو ختم کر دیا۔ پھر گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اُس کے بعد سے سونار کے بلوں

نا خیر نہ رہی۔ روزانہ دو چار مار دیتا ہے۔“

”نفسیات کا کیس ہے؟ خیر ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُس نامعلوم آدمی نے آپ کا

غائب اُسی پوچھ گچھ کے بعد ہی شروع کیا تھا لہذا میرا محکمہ آپ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا

ہے۔ ویسے آپ مطمئن رہئے کہ اس سلسلے میں کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوگی جس کی بناء پر آپ

دفعتاً حمید اچھل پڑا اور جھک کر اُس چیز کو دیکھنے لگا جو اُس کی گردن سے ٹکرا کر آواز کے

ساتھ فرش پر گر گئی۔ پھر سارہ نے اُسے دروازے کی طرف جھپٹے دیکھا۔ وہ ہکا بکا کھڑی اُس

چمکدار خنجر کو دیکھتی رہی۔ اُس کا رخ کھڑکی ہی کی طرف تھا اور اُس نے باہر سے پھینکے جانے

والے خنجر کی جھلک دیکھی تھی۔

کیپٹن حمید باہر جا چکا تھا..... وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

طوفانی سفر

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ مضطربانہ انداز میں دروازے کی

طرف بڑھی۔ باہر بھی نکل آئی۔ ہٹ کی چھوٹی سی کمپاؤنڈ سنان پڑی تھی۔

کچھ دیر بعد حمید نظر آیا۔ چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ دوڑتا رہا ہے۔

”آپ نے خنجر کو ہاتھ تو نہیں لگایا۔“ اُس نے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... کون تھا.....؟“

”پتہ نہیں.....!“

”دکھائی دیا تھا۔“

”دکھائی بھی نہیں دیا۔“

”پھر آپ کہاں دوڑے گئے تھے؟“

”ہر اُس راستے کو دیکھا تھا جہاں سے فرار ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ قریب ہی لا علم تھی..... اور اب خود کیپٹن حمید کیا سوچ رہا ہو گا۔“

”کسی ہٹ میں جا چھپا ہو گا۔“

”پھر.....؟“

”کچھ بھی نہیں..... دیکھا جائے گا۔“

وہ اندر آئے..... حمید نے نہ صرف کھڑکیاں بلکہ دروازہ بھی بند کر دیا..... راحف کر سکے گا۔“

دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔

”کرسی نے جان بچائی۔“ حمید پھر اسی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”آپ چائے پیئیں گی یا؟“

”جی.....!“ ساڑھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اردو میں ترجمہ کرو؟“ حمید نے بھولے پن سے پوچھا۔

”یعنی..... یعنی..... یہ خنجر..... اور آپ.....!“

”خدا کا شکر ہے کہ شام کی چائے پینے کے لئے زندہ بچ گیا۔ لہذا پہلی فرصت میں

فی الحال کوئی ملازم موجود نہیں..... ساری چیزیں کچن ہی میں مل جائیں گی.....

بیٹھے..... میں ابھی آیا۔“

”ارے اس خنجر کو تو دیکھئے۔“

”وہیں پڑا رہنے دیجئے..... چائے کے بعد دیکھیں گے۔“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“

”آپ پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں..... تاکہ آپ مجھے ہیر و سمجھنے لگیں ورنہ

نیتنا عالم یہ ہے کہ..... خیر..... ہاں تو میں ابھی آیا.....!“

”میں بھی چل رہی ہوں.....!“ وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

چھوٹے سے کچن میں اُمور خانہ داری کے سارے لوازمات سلپتے کے ساتھ موجود تھے۔

ساڑھ خاموشی سے اُس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

وہ اسی خنجر کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ کس نے پھینکا تھا؟ کیوں پھینکا تھا؟ کیا یہ اُسی

حرکت تو نہیں تھی، جو اُس کا تعاقب کرتا رہا تھا؟ مگر کیوں؟ اگر کچ جُ خنجر کیپٹن حمید کی

دون میں پوسٹ ہو جاتا تو خود اُس کی کیا پوزیشن ہوتی۔ وہ پولیس کو کیسے یقین دلا سکتی کہ اُس

اور اب خود کیپٹن حمید کیا سوچ رہا ہو گا۔

”کیا آپ اس واقعہ کے متعلق سوچ رہی ہیں۔“ دفعتاً اُس نے پوچھا اور ساڑھ نے

متراف میں سر ہلا دیا۔

”سامنے کی بات ہے؟“ حمید مسکرایا۔ ”جسے بلوں پر غصہ آ سکتا ہے وہ کسی آدمی کو کیسے

”آپ غلط سمجھے۔“ وہ ناخوشگوار لہجے میں بولی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”آپ کی دانست میں نہ ہو گی۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔ وہ کیتلی میں پتی ڈال رہا تھا۔

”میں کہتی ہوں تاکہ آپ غلط سمجھے ہیں۔“ ساڑھ کو غصہ آنے لگا تھا۔ حمید کی مسکراہٹ

نکلیف دہ تھی۔

”مٹی بچاری بھی اس سے لا علم رہی ہو گی کہ قلندر راج مچ بیابانی ہے۔“

”آپ میری توہین کر رہے ہیں۔“ ساڑھ پیرٹنچ کر بولی۔

”میں ابھی آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا! ذرا یک سے پیالیاں نکال لیجئے۔“

”شکریہ! اور وہ اُدھر جو ڈبہ رکھا ہوا ہے اُس میں سینڈوچ ہوں گے۔ فی الحال اس سے

زیادہ خاطر نہ کر سکوں گا۔“

ساڑھ نے طوعاً و کرہاً وہ سب کچھ کیا اور کچھ دیر بعد پھر وہ شنگ روم میں آئے۔ حمید

چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔

”اب کیا چائے بھی میں ہی انڈیلوں۔“ اُس نے کہا۔ اور ساڑھ پیالیوں میں چائے انڈیل کر ہی قلندر نے ملازمت کی پیش کش کی ہوگی۔ میرے سامنے تو کسی قسم کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔“

”سینڈوچ لیجئے۔ مجھے شامی کبابوں کے سینڈوچ پسند ہیں۔“

وہ چپ چاپ چائے پیتی رہی۔ حمید کی باتوں سے موڈ خراب ہو گیا تھا اور اب وہ خیال غلط ہو۔ آپ اس مسئلے پر زیادہ نہ سوچئے گا۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ اُسی کی حرکت ہو، جو آپ کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہی تھی۔

”یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے محترمہ!“ حمید کچھ دیر بعد بولا۔

”میں کہتی ہوں غلط ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے آج تک اُسے اپنا عمارتوں کی تلاش لیجئے نا۔“

”اول تو بغیر وارنٹ کے تلاش لینا ناممکن ہے۔ دوم خنجر پھینکنے والے نے اپنے گلے میں خنجر تو لٹکانہ رکھی ہوگی۔۔۔۔۔ کیسے پکڑوں گا۔“

”میں آپ کے بیان کی تردید نہیں کروں گا۔ لیکن انسانی ذہن کو سمجھنا بہت مشکل مجھے معلوم ہے کہ قلندر نے کبھی شادی نہیں کی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والے یا دار یوں سے گھبراتے ہیں یا اپنے متعلق کسی وہم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یا پھر بالکل عی۔ مطلب یہ کہ ضروری نہیں کہ جس مقابل سے ذہنی وابستگی نہ رکھتے ہوں۔“

”مجھے اب جانا چاہئے۔“

”بالکل۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”جہاں تک میری معلومات کا تعلق آپ سے پہلے اُس کی کبھی کوئی سیکریٹری نہیں تھی۔ کیا اس نے اس پوسٹ کے لئے اشتہار دیا تھا“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ میری ایک سہیلی کے والد کے توسط سے مجھے یہ ملازمت ملی۔ انہوں نے کہا تھا کہ قلندر کو ایک سیکریٹری کی ضرورت ہے اور وہ صرف جھکی اور گک ادباز نہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اُسے بچپن سے جانتے ہیں۔ طالب علمی کے دنوں میں بھی وہ بہت محتاط تھا اور دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ میری سہیلی کے والد عرصہ اُس کے کلاس فیلو رہے تھے۔“

”ملازمت سے پہلے آپ قلندر سے ملی تھیں۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ایک تقریب کے سلسلے میں سہیلی کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی۔ مگر دنوں مختلف جگہوں پر ٹیوشن کرتی تھی۔ سہیلی کے والد نے میرا تعارف کراتے ہوئے سے کہا تھا کہ میں ٹیوشن کر کے ایک پورے خاندان کی کفالت کر رہی ہوں۔ غالباً اس کے



”خنجر پر کسی قسم کے نشانات نہیں ملے۔“ کرئل فریدی نے کہا۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟“ حمید نے برا سامانہ بنا کر کہا۔

”کیوں؟“

”ہر پندرہ مئی منٹ کے بعد قاسم کی بیوی کی کال آتی ہے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ بجھا ہوا سگار انگلیوں میں دبائے خلاء میں گھورے جا رہا تھا۔
 کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ ”قادر اور جواد نے اُس آدمی کا جو حلیہ بتایا ہے اُس میں
 ساڑھ کا تعاقب کرنے والے کے حلقے میں گھٹی ڈاڑھی مشترک ہے۔“
 ”لیکن اب شانہ وہ ڈاڑھی صاف ہی کرا دے۔“
 ”اگر واقعی اُس کی ذاتی ڈاڑھی رہی ہوگی۔“ فریدی مسکرایا۔
 ”میں نے جس آدمی کا تعاقب کیا تھا وہ میک اپ میں معلوم ہوتا تھا۔“
 ”خیر چھوڑو..... غالباً اُس لاٹچ کا سراغ مل گیا ہے جس پر قاسم کو لے جایا گیا تھا۔“
 ”سراغ بھی محض اس بناء پر ملا ہے کہ اُس وقت قاسم کے جسم پر زنا نہ بیدنگ سوٹ تھا۔“
 ”دعا دیجئے میری جینٹس کو۔ میں نے ہی وہ سوٹ اُس سے خریدوایا تھا۔ سرخ رنگ کا
 سوٹ جس میں وہ سینکڑوں میل دور سے بالکل واضح نظر آتا تھا۔“
 ”خدا تم دونوں کے حال پر رحم کرے۔“
 ”تو پھر اُس لاٹچ کا کیا ہوا۔“
 ”سراغ مل گیا ہے..... اور ہم وہیں چل رہے ہیں۔“
 ”کہاں.....؟“
 ”سونار سے چالیس میل دور ایک جزیرے میں۔“
 ”سونار کے آگے تو بڑی طوفانی لہروں کا سامنا ہوتا ہے..... لاٹچ کیسے جاسکی ہوگی۔“
 ”سونار سے کچھ دور اُسے لاٹچ پر لے جایا گیا تھا پھر اُسے ایک اسٹیر پر پہنچا دیا گیا تھا۔“
 ”در اصل اُس اسٹیر کے کپتان ہی سے یہ ساری اطلاعات ملی ہیں۔ اسٹیر ساتویں جزیرے کے ایک
 طرف جا رہا تھا راہ میں اُسے اشارہ دے کر روکا گیا۔ کپتان سے کہا گیا کہ لاٹچ میں مرگی کا ایک
 مریض غشی کی حالت میں پڑا ہوا ہے جسے ساتویں جزیرے پہنچانا ہے..... لاٹچ طوفانی لہروں کا
 مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اسٹیر سے رسیاں لٹکائی گئی تھیں اور بیہوش آدمی کا اسٹریچر رسیوں سے
 باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ اسٹیر پر پہنچا تھا۔ تین آدمی اُس کے ساتھ تھے۔ لیکن ان میں
 کوئی اُس حلقے کا نہیں تھا جس کا تذکرہ جواد اور قادر کر چکے ہیں۔“

سونار کے آس پاس متعدد جزیرے ہیں۔ بعض کے باقاعدہ نام ہیں اور بعض کے صرف نمبر۔

”تو پھر ہم کس سے ملیں گے۔“

”اسٹیر کے کپتان سے..... اسٹیر اس وقت ساتویں جزیرے ہی میں لنگر انداز ہے۔
 اُسے آگے بڑھ جانا چاہئے تھا لیکن اس کے انجن میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے۔“
 ”دونوں کچھ دیر بعد ایگل بیچ بیچے۔ لیکن جب فریدی اپنی لاٹچ میں بیٹھنے لگا تو حمید بوکھلا کر
 بولا۔ ”کیا مطلب..... کیا اسی پر۔“

”ہاں.....!“

”میرے بس سے باہر ہے۔“

”کیوں؟“

”اگر یہ کسی وہیل مچھلی کے پیٹ میں پہنچ گئی تو۔“

”بکومت..... ادھر وہیل نہیں پائی جاتی۔“

”آپ تنہا خود کشی کر سکتے ہیں..... مجھے مرنا ہو گا تو کافی ہاؤز کیا نہ ا ہے۔“

”چلو.....!“ فریدی نے گردن پکڑ کر اُسے لاٹچ میں بٹھا دیا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ غصیلے انداز میں چلا۔ لیکن لاٹچ اپنے پیچھے پھواریں
 اڑاتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی۔ فریدی نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا اور
 دوسرے کی گرفت میں اب بھی حمید کی گردن تھی۔

”ارے ہم غرق ہو جائیں گے.....!“ حمید حلق پھاڑ کر دہاڑا۔

”سونار تک تو سمندر پر سکون ہے..... مرے کیوں جا رہے ہو۔“

”اور اس بارہ میل کی زندگی پر مجھے آپ کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔“ وہ زہریلے لہجے
 میں بولا۔

”آج تمہیں بتاؤں گا کہ ایڈونچر کس چیز کا نام ہے..... زنا نہ لباس پہن کر نہانا اور
 لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی ایڈونچر ہی ہے، لیکن اُس سے صرف بیچرے ہی محفوظ
 ہو سکتے ہیں۔“

”میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا..... سونار سے آگے ہرگز نہیں بڑھوں گا.....!“

”سونار میں رکنا کون ہے..... چکر کاٹ کر آگے نکل جائیں گے۔“

سے چکر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ غیر مرئی ہاتھ اُسے خلاء میں اچھال رہے ہوں لیکن زمین پر گرنے سے پہلے کوئی اُسے سنبھال کر پھر اچھال دیتا ہو۔

آہستہ آہستہ یہ احساس بھی فنا ہو گیا۔

پھر پتہ نہیں کتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اُس نے کسی کے ہاتھ اپنے گالوں پر محسوس کئے تھے اور آنکھیں کھول دی تھیں۔ فریدی اُس پر جھکا ہوا تھا۔

گیس ماسک بھی شانہ اُسی نے اتارا تھا۔ حمید نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اُس نے فریدی کی آواز سنی۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔

اپنی اُس کمزوری پر اُسے غصہ آنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد حالت سنبھلی تھی اور اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اب بھی لانچ کی سیٹ سے جکڑا ہوا تھا۔ اُس نے سیفٹی بیلٹ کے تسموں سے چھٹکارا حاصل کیا۔

لانچ ساتویں جزیرے کے پر سکون ساحل پر ٹھہری ہوئی تھی۔ لیکن حمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑی سبک روی سے کسی سمت تیرتی چلی جا رہی ہو۔

”گرم کافی کا ایک کپ طبیعت بحال کر دے گا۔“ فریدی اُس کا شانہ تھپتھا کر بولا۔

”ارے بھی ذرا مسکراؤ تو..... کمال ہے؟“

”مٹھی مسکراتا ہوں..... ٹھہر جائیے۔“ حمید نے اس طرح کہا جیسے لٹھ مار دینے کی دھمکی دی ہو۔

”سفر کیسا رہا۔“ فریدی کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

”بہت عمدہ۔ اس کے بعد شانہ سفر آخرت کی بھی ہمت نہ پڑے۔“

”بہت اچھے..... بہر حال ذہن جاگ ہی رہا ہے..... یہی بہت ہے فرزند۔“

”آپ کی بھی بیڑی کبھی اگر ہاسٹ ہو گی یا نہیں۔“ حمید جل کر بولا۔

”قوت ارادی کا ڈانٹا موائے کبھی اگر ہاسٹ نہیں ہونے دیتا۔“

”کیا وہ گرم کافی کا کپ آسمان سے اترے گا۔“

”کیٹلی..... بیڑ پر رکھی ہوئی ہے..... بس ذرا سی دیر۔“ فریدی نے کہا اور بیڑ کی

طرف متوجہ ہو گیا۔

کافی پینے کے بعد چائے اُسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسی جنم جنم کی تھکن گرم پانی کے غسل سے اتر گئی ہو۔

اس کے بعد پائپ کے ہلکے ہلکے کش تو جنت ہی کی طرف لئے جا رہے تھے۔ فریدی نے اس سے کہا۔ ”مگر چاہو تو آرام کر سکتے ہو..... میں جا رہا ہوں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ ظاہر تھا کہ وہ اُسی اسٹیئر کے کپتان سے ملنے جا رہا ہو گا۔ اُس نے سوچا جب یہ حضرات اتنے مہربان نظر آرہے ہیں تو پھر آرام ہی کیوں نہ کیا جائے۔

وہ چلا گیا اور حمید سوچتا رہا کہ آخر لائے ہی کیوں تھے جب اُس کا کوئی مصرف نہیں تھا..... سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں..... دن ڈھل رہا تھا..... کچھ دیر بعد اُس نے پھر کیٹلی بیڑ پر رکھ دی۔ اُس لانچ کی خصوصیات سے وہ ابھی تک

تواقف ہی رہا تھا۔ حالانکہ کئی بار خود بھی اُسے اسٹیئر کر چکا تھا۔ ایگل بیچ سے سونار تک اسی پر جاتا تھا۔

کیٹلی میں پانی ایلنے لگا تھا۔ اُس نے پیالی میں کافی ڈالی اور پانی اٹھیلنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت کئی افراد کی آہٹ محسوس ہوئی اور لانچ ہلنے لگی۔ چند سریلے قہقہے گونجنے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا

تین یوریشین عورتیں لانچ کی پچھلی نشست پر بیٹھ رہی تھیں۔ حمید انہیں استفہامیہ نظر سے دیکھتا رہا ان میں سے دو تیس کے لگ بھگ رہی ہوں گی اور تیسری نہ صرف نوجوان بلکہ

خاصی دلکش بھی تھی۔

”غصہ آئی لینڈ لے چلو۔“ اُن میں سے ایک نے کہا۔

”سیونٹھ بیون بھی لے چل سکتا ہوں..... لیکن فی الحال موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ

فہم پڑیں جن میں وہ لڑکی بھی شامل تھی لیکن تیسری کو کسی قدر طیش آگیا اور کھرکھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”دماغ تو نہیں چل گیا۔ میں تمہارا لائنس ضبط کرادوں گی۔“

”لائسنس تو دیوے ہی ضبط ہو جائے گا کیونکہ تم تین ہو..... اور یہاں کوئی دوسرا نہیں ہے۔“

اب وہ دونوں بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ لڑکی چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”یہ پرائیویٹ معلوم ہوتی ہے۔“

”پرائیویٹ ہے.....؟“ غصیلی عورت نے آنکھیں نکال کر حمید سے پوچھا۔

”کیوں؟ پہنچا دو گے؟“ اس بار لڑکی نے پر اشتیاق اور لگاؤ بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”آؤ.....!“ حمید اپنے قریب کی سیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”راستہ بتاؤ۔“
 لڑکی اُس کے پاس آگئی اور اُس نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ انجن اشارت ہوا اور لالچ حرکت میں آگئی۔

لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں عورتیں آپس میں گفتگو کرتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکی کے وجود ہی سے بے خبر ہوں۔ لڑکی حمید سے گفتگو کرتی رہی۔
 ”جج جج تم بہت اچھے آدمی ہو۔“ وہ اپنی کانپٹی ہوئی سی مترنم آواز میں کہہ رہی تھی۔
 ”اسپورٹسمن معلوم ہوتے ہو۔ مجھے ایسے آدمی پسند ہیں۔ پایا کہتے ہیں وہی آدمی خوش رہ سکتا ہے جسے انجام کی پرواہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر میں تمہیں جہنم میں بھی پہنچا سکتی ہوں کیونکہ تم فقہ آئی لینڈ کے محل وقوع سے ناواقف ہو۔ جج بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو۔“
 ”میں مرغ سے آیا ہوں اور یہ کشتی اڑ بھی سکتی ہے۔“

”کچھ دن ٹھہرو گے یہاں؟..... کوئی پرواہ نہیں اگر اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“
 ”بتاؤں بھی تو تم یقین نہیں کرو گی..... اس لئے کیا فائدہ۔“
 لالچ سمندر کا سینہ چیرتی آگے بڑھتی رہی۔



کچھ دیر بعد حمید نے سوچا کہ فریدی چڑی اڑھڑ دے گا..... سورج غروب ہونے والا تھا۔ اگر دن رہے واپسی نہ ہوئی تو ممکن ہے کہ غرق ہی ہونا پڑے کشتی رانی کا کوئی خاص تجربہ نہیں رکھتا تھا۔

پورے دو گھنٹے ہو چکے تھے انتظار کرتے ہوئے..... وہ فقہ آئی لینڈ کے ساحل پر اُسے چھوڑ گئی تھیں۔ لڑکی نے مخصوص ریلے لہجے میں کہا تھا کہ وہ بہت جلد واپس آجائیں گی۔

”پرائیویٹ اینڈ کو فیڈ نفل.....!“
 ”سوری.....!“ وہ لالچ سے اترنے کے لئے دوسری طرف مڑتی ہوئی بولی۔
 ”کافی تو چیتی جاؤ..... یہ ابو بن ادھم کا خیمہ ہے۔“

وہ جھلا کر پلٹ پڑی۔ تینوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائیں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور پھر وہ دھرتا دے کر بیٹھ گئیں۔ حمید نے دو پیالیاں نکالیں۔ اُن کے لئے بھی کافی بنائی اور سونار سے خریدے ہوئے لچ بکسوں میں سے ایک اُن کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی کانپٹی ہوئی سی آواز میں ہنس رہی تھی۔
 ”ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہیں پیشہ ور ملاح سمجھتے تھے۔“ ایک عورت بولی۔
 ”میں تو لارڈ لن لٹھ کو کا بھتیجا ہوں۔“ حمید نے اکثر کہا۔
 صرف لڑکی ہنس پڑی۔ وہ دونوں ایسی سنجیدگی سے حمید کو دیکھے جارہی تھیں جیسے کچھ کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔

کچھ دیر بعد اُن میں سے ایک بولی۔ ”ہمیں فقہ آئی لینڈ جانا ہے..... اور پھر رات پہلے واپس بھی آ جانا ہے..... کوئی لالچ نہیں مل رہی ہے۔“
 ”میں نہیں جانتا کہ فقہ آئی لینڈ کہاں ہے..... ورنہ پہنچا دیتا اور واپس بھی لاتا۔“
 ”ہم تمہیں راستہ بتا سکیں گے۔“ لڑکی بولی۔

دفعتاً حمید کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ خواہ مخواہ دعوت دے بیٹھا ہے۔ اب اگر جانا پڑا تو قادر ہارڈ اسٹون واپسی پر لالچ کی گمشدگی کو نہ جانے کس نقطہ نظر سے دیکھیں اور کر گذریں۔

اُس نے گردن پچانے کے لئے ایندھن کی کمی کا بہانہ تراشا لیکن وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ حمید ان اطراف کے لئے اجنبی ہے اس لئے ایک پوچھ بیٹھی۔ ”انداز کتنا ایندھن ہو گا۔“
 ”بمشکل بیس بائیس میل نکل سکیں گے..... میرا ساتھی ایندھن کے لئے گیا ہے۔“
 ”ارے تو کام چل جائے گا۔ پانچ میل آنا اور پانچ میل جانا..... وہ رہا سامنے.....“
 تم پہلی ہی بار ادھر آئے ہو..... کہاں سے آئے ہو۔“

حمید ٹھنڈی سانس لے کر مردہ سی آواز میں بولا۔ ”اب تو شکار پور ہی سے آیا ہوں۔“

کی رپورٹ درج کرا دی ہو۔“

”میں بے حد شرمندہ ہوں۔“

”تو تمہارا ارادہ بھی واپسی کا نہیں تھا۔“

”قطعی نہیں..... لیکن اب واپسی کیونکر ہوگی۔“

”کل دیکھا جائے گا۔“

”یہیں فقہ آئی لینڈ میں رہتی ہو۔“

”ہاں..... لیکن سیونٹھ آئی لینڈ میں بھی شب باشی ہو سکے گی۔ میرے پیادہاں سی

سائڈ ہیون میں مقیم ہیں۔ شاید تم نے ڈاکٹر شایور ماہر نفسیات کا نام سنا ہو۔ وہ یہیں کے

باشندے ہیں۔ میری ماں اپنی تھی۔“

”آہ..... اسی لئے تو تمہاری آنکھیں دیکھ کر مجھے غرناطہ کی شامیں یاد آئی تھیں۔ الحمراء

کے درپے یاد آئے تھے جن پر شفق کی چھوٹ پڑتی ہے اور شام کے دھندلکے جنہیں چومتے

ہوئے خنک راتوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔“

”مکپاس پر نظر رکھو پیارے شاعر..... ورنہ کہیں اور جانتگیں گے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”اب میں تمہاری کھڑکی کے نیچے اشارہ لائٹ سیرے نیڈ گایا کروں گا..... نی الحال گینار

مرمت کے لئے گیا ہوا ہے۔“

”کچ بتاؤ تم کون ہو..... بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم نے ابھی تک اپنا نام

نہیں بتایا۔“

”اور غالباً تم اپنا پتہ بتا چکی ہو۔“

”میرے کئی نام ہیں.....!“ وہ ہنس پڑی۔ ”ثریا تابندہ اختر کہتے ہیں می دیر اشاپور کہا

کرتی تھیں۔ بڑی اچھی تھیں۔ میں بالکل چھوٹی سی تھی جب ان کا انتقال ہوا..... انہیں جمیلی

کے پھول پسند تھے۔ ہمارے پائیں باغ میں چاروں طرف جمیلی کی بلیں بکھری رہتی

تھیں۔ میں جب بھی اُن کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو جمیلی کے پھولوں کا بڑا سا گچھا

ذہن میں لہرا کر رہ جاتا ہے۔ اُن کے خدو خال نہیں یاد آتے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ یہ غمناک تذکرہ نکل آیا۔“ حمید نے مغموم لہجے میں کہا۔

چاروں طرف سمندر پھیلا ہوا تھا اور حمید کے فرشتوں کو بھی سیونٹھ آئی لینڈ کی یاد نہیں رہی تھی۔ وہ تو لڑکی کی ریلی آواز کے زیر و بم میں کھویا رہا تھا اور یہ چیز بھی ذہن پر تھی کہ وہ واپس بھی آئیں گی لہذا کیا فکر ہے۔

اور اب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے..... وہ یوریشین سورنیاں یقیناً چر دے گئی تھیں۔ اگر وہ واپسی کی بھی بات نہ کرتیں تو وہ ہرگز تیار نہ ہوتا۔

• فادر ہارڈ اسٹون کھال کھینچ لے گا۔ پھر اُس نے سوچا کیوں نہ کوئی ایسا آدمی تلاش جائے جو معقول معاوضے پر اُس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو جائے۔

وہ لالچ سے اتر آیا۔ ساحل پر بہترے لوگ چل رہے تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر پار

گیری کی ایک کشتی جال پھیلا رہی تھی..... اُس نے سوچا اسی کشتی کا کوئی آدمی تیار ہو جائے

کیا کہنا..... اندھیرے میں بھی سیونٹھ آئی لینڈ تک رہنمائی کر سکے گا۔

وہ کشتی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً وہی یوریشین لڑکی تہا دکھائی دی جو اُس کے

قریب بیٹھ کر رہنمائی کرتی رہی تھی۔ اُس نے شانے سے ایک چرمی تھیلا لٹکا رکھا تھا اور تیز

سے اُسی طرف آ رہی تھی۔

حمید رک گیا۔

وہ قریب آ کر ہانپتی ہوئی بولی۔ ”مجھے افسوس ہے تمہیں انتظار کرنا پڑا چلو۔“

اُس نے بے تکلفی سے حمید کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور لالچ کی طرف کھینچ رہی تھی۔

وہ لالچ میں آ بیٹھے۔ لڑکی بولی۔ ”سورج غروب ہونے والا ہے..... جلدی سے

چلو، ورنہ اندھیرے میں اندازہ کرنا دشوار ہو گا کہ کس طرف لینڈ کرنا ہے۔“

”وہ دونوں کہاں رہ گئیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”انہوں نے تمہیں یہ قوف بنایا تھا۔ اگر واپسی کے متعلق بھی نہ کہتیں تو تم ہرگز نہ آنا

..... مجھے بھی واپس نہیں آنا تھا لیکن میں نے سوچا کہ یہ ایک گھٹیا حرکت ہوگی، کیوں ہے

”بالکل..... اب مجھے کہنا چاہئے کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو..... حقیقت یہ ہے کہ

نے سفر کی سمت پر دھیان نہیں دیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ کدھر جاؤں..... میرا سامنی

جانے کیا سوچ رہا ہو گا، ان اطراف میں ہم پردہسی ہیں..... ہو سکتا ہے اُس نے لالچ کی گتہ

”نہیں..... غناک نہیں۔ اُن کے متعلق سوچ کر عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے..... کتنا جوان اور حسین چہرہ تھا۔ اب ہوتیں تو بوڑھی ہو چکی ہوتیں۔ مجھے پڑھا پے سے خوف آتا ہے اور اپنے بڑھا پے کے تصور ہی سے نفرت محسوس ہوتی ہے..... اچھا ہوا جو جوانی ہی میں مر گئیں۔“

”اچھی بات ہے..... میں سیونٹھ آئی لینڈ پہنچ کر تمہیں مار ڈالوں گا۔“

وہ ہنس پڑی۔

”اب تم مجھے اپنے متعلق بتاؤ.....“ اُس نے کہا۔

”ایک آوارہ آدمی ہوں۔ آج یہاں کل وہاں..... دیس دیس کے گیت اُٹھا کرتا ہوں۔“

”تو..... تم بھی میرے پاپا کی طرح خطی ہو۔“

”کیوں..... وہ کیا کرتے ہیں۔“

”بس ماہر نفسیات ہیں۔ نفسیات میں آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ لی تھی۔ سچ کہتی ہوں اگر ہمارے پاس مانی گیری کی ایک کشتی نہ ہوتی تو ہم بھوکوں مر جاتے۔ آج کل البتہ انہیں ایک دلچسپ کیس مل گیا ہے۔ معاوضہ بھی معقول مل رہا ہے۔ پانچ سو روپے یومیہ مگر بڑے بڑے اسرار لوگ ہیں۔“

”پراسرار کیوں۔“

”ایسٹ افریقہ کے کوئی تاجر ہیں۔ اُن کا لڑکا اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔ افریقہ کا نام ہی پُر اسرار ہے۔ افریقہ کے نام پر میں ہمیشہ عجیب سے خوابوں میں کھو جاتی ہوں..... پاپا کہہ رہے تھے کہ وہ لڑکا اپنے باپ کی دوسری شادی کی بناء پر یادداشت کھو بیٹھا ہے..... باپ کی بیوی کو اُن کی بیٹی کہتا ہے..... اپنا نام کچھ اور بتاتا ہے۔ پاپا کہتے ہیں کہ ایسا دیو صفت آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا..... پورے پورے بکرے تنہا کھا جاتا ہے..... زیادہ طویل القامت آدمی اتنے موٹے نہیں ہوتے جتنا موٹا وہ ہے۔“

حمید کی ریزہ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکن بھی کسی حد تک بڑھ گئی تھی۔

”اس کی پچھلی ہسٹری معلوم کر کے اُس کی مناسبت سے یادداشت واپس لانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ایک ہفتے سے سیونٹھ آئی لینڈ ہی میں مقیم ہیں۔“

”انہیں لوگوں کے ساتھ۔“

”نہیں انہوں نے سی سائیڈ ہیون میں ایک کمرہ لے رکھا ہے۔ وہیں سے روزانہ اُس تاجر کی گاڑی انہیں اُس کے گھر لے جاتی ہے۔“

”براد دلچسپ کیس ہے.....!“ حمید نے کہا۔ ”تمہارے پاپا اور کیا بتاتے ہیں۔“

”وہ کبھی کچھ نہیں بتاتے بس رواروی میں اس کا تذکرہ کر دیتا تھا۔ اب پوچھتی بھی ہوں تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قادر اور جواد نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ ایک ایسے آدمی کی نگرانی پر مامور کئے گئے تھے جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ تو اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ یہ لڑکی اس طرح ہاتھ لگ گئی لیکن کہیں یہ بھی کسی قسم کا جال ہی نہ ہو۔ لڑکی اس کی شخصیت سے واقف ہو اور اُسے بھی کسی الجھاوے میں ڈالنا چاہتی ہو۔

شامت

شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ فریدی تھک ہار کر جزیرے کے پولیس اسٹیشن میں آ بیٹھا تھا۔ حمید کی افتاد طبع سے بخوبی واقف تھا اس لئے پریشانی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے تنہا واپس نہ چلا گیا ہو..... اپنے دفتر میں بھی فون کیا تھا اور بحری پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ کمانڈر نے ٹرانسمیٹر پر مطمئن رہنے کو کہا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ ایک بڑی کشتی لالچ کی تلاش میں روانہ ہو چکی ہے۔

اس سے قبل وہ اُس اسٹینر کے کپتان سے ملا تھا کافی دیر تک سوالات کی پوچھاڑ کر تاربا تھا۔ لیکن وہ اس سے زیادہ نہ بتا سکا کہ بیہوش آدمی کو اُس کے ساتھی اُتار لے گئے تھے۔ ساحل کے کچھ مزدوروں نے بھی انہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ بھی نہ بتا سکے کہ وہ اُسے کہاں لے گئے تھے۔ بہر حال قاسم اسی جزیرے میں لایا گیا تھا۔

لیکن اب قاسم اُس کے ذہن سے نکل چکا تھا اس کی جگہ حمید کے متعلق تشویر
جھنجھلاہٹ نے لے لی تھی۔

ٹھیک پونے سات بجے اسٹیشن انچارج نے اطلاع دی کہ لالچ ساحل پر موجود
ڈیوٹی کانسٹیبلوں نے اُس پر قبضہ کیا ہے۔ پالٹ کے ساتھ ایک یوریشین لڑکی بھی ہے۔
اپنا نام بتانے سے انکار کر رہا ہے۔ اُس نے لڑکی کو بھی کچھ بتانے سے روک دیا ہے۔

فریدی خاموشی سے اٹھا اور ریڈیو کار میں بیٹھ کر ساحل تک آیا۔
حمید لڑکی سمیت لالچ سی میں ملا۔ چار ڈیوٹی کانسٹیبل بھی موجود تھے۔ فریدی نے اُس
باہر جانے کو کہا۔

”تم نے دیکھا.....!“ حمید نے ویرا سے کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ میرے ساتھی
رپورٹ درج کرا دی ہوگی۔ اب تم سی سائیڈ جاؤ..... صبح ملاقات ہوگی۔“

لڑکی نے فریدی کے سنجیدہ چہرے پر نظر ڈالی، جو حمید کو گھورے جا رہا تھا اور چپ ہوا
لالچ سے اتر گئی۔

”بڑی نیک بچی ہے۔“ حمید نے کہا اور پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

”کہاں گئے تھے۔“ فریدی نے اُس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر سر دلچے میں پوچھا
”فقہہ آئی لینڈ.....!“

”کیوں.....؟“

”یہی لڑکی لے گئی تھی۔ اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں جو وہیں رہ گئیں۔“

”میں تمہیں مار دوں گا..... سنجیدگی اختیار کرو۔“

”زیادہ دور نہ گئی ہوگی۔ خود پوچھ لیجئے..... ویسے شاید مجھے قاسم کا سراغ مل

ہے..... کسی بھی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں ہمیشہ پہلے کوئی خوبصورت لڑکی تلاش کرنا

فیصدی سود مند ثابت ہوتا ہے۔“

”ہاں تھی تو خوبصورت.....!“ فریدی کا موڈ یکھٹ بدل گیا۔

”تھی نا.....!“ حمید چپک کر بولا۔

فریدی نے اثبات میں سر ہلایا لیکن نظر بدستور حمید کے چہرے پر جمی رہی۔

”سی سائیڈ ہیون میں مقیم ہے۔“
”چلو ہم بھی وہیں چلیں۔“ فریدی نے کسی قدر جوش کا مظاہرہ کیا۔

”الو بتا رہے ہیں مجھے۔“

”اس قابل بھی نہیں سمجھتا۔“ فریدی نے کسی قدر جوش کا مظاہرہ کیا۔

حمید پاپ سلگانے لگا۔

فریدی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے اُسے اپنے متعلق کیا بتایا ہے۔“

حمید نے پوری کہانی دہرائی اور فخریہ انداز میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے جو اُن نے بھی یادداشت ہی کھو بیٹھنے کے متعلق کچھ کہا تھا۔“

”جی ہاں..... کیوں نہ ہم اُس ڈاکٹر سے ملیں۔“

”جلد بازی نہیں..... ہو سکتا ہے کھیل بگڑ جائے۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ قاسم ہی

ہو۔ لڑکی کے بیان کے مطابق وہ اپنا نام کچھ اور بتاتا ہے..... یعنی وہ نہیں جس نام سے وہ

لوگ اُسے پکارتے ہیں۔ کیا اُس نے بتایا تھا کہ وہ اپنا نام کیا بتاتا ہے۔“

”نہیں..... اُسے نام یاد نہیں آیا تھا۔“

”خیر..... تم پھر کچھ دیر آرام کرو..... میں ابھی آیا۔“

”کہاں چلے؟“

فریدی مزید کچھ کہے بغیر لالچ سے اتر گیا۔ حمید نے دوسرا بلب بھی روشن کر دیا اور بیٹر

پر کانی کے لئے پانی رکھنے لگا۔

”سوچ رہا تھا دیکھئے رات کہاں گذرتی ہے۔ دفعتاً باہر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی

لالچ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کون ہے؟“ حمید نے گونجیلی آواز میں پوچھا۔

”تم زندہ ہو یو قوف شاعر.....!“ مترنم سی آواز آئی جو ویرا کی ہو سکتی تھی اور پھر

”سرے ہی لمحے میں وہ سامنے بھی آگئی۔

”تم..... تم واپس کیوں آگئیں.....!“ حمید نے پوچھا۔

”گلی کب تھی..... اُدھر پچھروں کی کشتی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔“

”کیوں.....؟“

”دیکھنا چاہتی تھی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ تمہارا ساتھی بڑے غصے میں تھا۔ خطرناک معلوم ہوتا ہے..... اُس کی آنکھوں سے ڈر لگا تھا مجھے۔“

”ہو سکتا ہے..... وہ جلد ہی واپس آجائے۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
”تم جاؤ..... ورنہ تمہارے پیپا.....!“

”او نہہ.....!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”انہیں کیا پتہ کہ میں واپس آگئی ہوں کیا تم رات کو یہیں لاؤں گی میں قیام کروں گے؟“

”خدا جانے..... میرا ساتھی مجھ سے زیادہ کڑیک واقع ہوا ہے لیکن اُسے تم سے دلچسپی نہیں۔“

”ارے تو کیا میں.....!“ وہ جھنجھلا کر بولی، مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر تھوڑی بعد آنکھیں نکال کر ناخوشگوار لہجے میں بولی۔ ”تم خود کو کیا سمجھتے ہو۔“

”ایک بیوقوف شاعر..... جو ایک سپورٹ اپورٹ کا بزنس کرنے کی بجائے ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جن سے اُس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔“

”نہیں..... تم شاید سمجھتے ہو کہ میں کوئی فلرٹ ہوں.....!“

”ارے بابا مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تم جاؤ یہاں سے۔ تم لوگوں بدولت یونہی کافی پریشان ہو چکا ہوں۔ میرا ساتھی آپ سے باہر ہو رہا تھا۔ اب پولیس وہاں سے اپنی محنت کا معاوضہ وصول کر لیں گے۔“

”اوہ.....!“ وہ یک بیک نرم پڑ گئی۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے۔ وہ دونوں تو مجھ سے بیٹھی ہوں گی لیکن مجھے کیسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ اُس نے بھی اپنے چہرے پر زبردستی جھلہٹ کے آثار پیدا کر رکھے۔ دیر اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

حمید نے کافی بنانے کے لئے پیالیاں نکالیں لیکن اپنے مصنوعی تفر آئیز روکنے کوئی تبدیلی نہ ہونے دی۔

”نہیں میں کافی نہیں پیوں گی۔“ دیرانے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ دوسری پیالی تمہارے لئے بنا رہا ہوں۔“

”میں جا رہی ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

وہ لانچ سے اتر گئی اور حمید ساحل کے ٹلگے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتا رہا۔ پھر اُس نے تنہا کافی پی اور پاپ کا تمباکو ختم کر کے اونگھنے لگا۔ سارا دن بے سکی مصروفیات میں گذرا تھا..... اور اس وقت سمندر کی سمت سے چلنے والی ٹنک اور نمک آلود ہواؤں نے پورے جسم میں درد پیدا کر دیا تھا۔ یہی دل چاہتا تھا کہ لمبی تان کر سو جائے۔
اچانک ساحل کی طرف سے شوراٹھا..... اور اونگھتا ہوا ذہن فوری طور پر اُس کی نوعیت کو نہ سمجھ سکا۔

پھر قریب ہی پانی میں ”چھپاکا“ سا ہوا، جیسے کسی نے جھلانگ لگائی ہو۔ حمید آواز کی سمت مڑا..... لانچ کی روشنی کے پھیلاؤ سے باہر پانی کی سطح پر کوئی متحرک چیز نظر آرہی تھی۔



قاسم کی بن آئی تھی۔ ہر وقت لیڈی جاوید کا ساتھ رہتا۔ اب وہ اس پر بھی مصر نہیں تھی کہ وہ اُسے آنٹی ہی کہے۔ ویسے اُس کے گوبر کے ڈھیر جیسے ذہن میں بھی یہ خیال جز پکڑنے لگا تھا کہ وہ سچ سچ اُسے بہت چاہتی ہے، ایک دن اس نے سرگوشیوں میں اُس سے کہا تھا۔ ”چاہے جو کچھ کرو..... لیکن اپنے پیپا کے سامنے میرا احترام ہی کیا کرو۔“

اور قاسم نے سعادت مندانہ انداز میں سر ہلا کر کہا تھا۔ ”جی بہت اچھا۔“

ویسے وہ سوچتا رہتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ اُس سالے پیپا کے سامنے احترام کیوں کروں۔ ہائے کیسے مسکراتی ہے..... کیسے دلار کرتی ہے میرا..... لیکن اس ذہنی جنت کے ساتھ ہی ساتھ ایک خلش بھی تھی اور یہ خلش تھی بوڑھے ڈاکٹر کی بکواس۔ ہر چند اب

اُس نے خود کو قاسم کہنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ڈرتا تھا اپنے اوٹ پٹانگ ذہن کی کج خیالی سے۔
 پتہ نہیں کس وقت منہ سے کیا نکل جائے اور اس نگڑی سی آنٹی سے ہاتھ دھونا پڑے
 ابھی تو اچھا ہے کہ سالے مجھے منور جاوید سمجھتے ہیں۔ اس بوڑھے ڈاکٹر سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے؟
 اس وقت بھی وہ سر پر مسلط تھا اور کمرے میں لیڈی جاوید کی بجائے خود سر جاوید موجود تھا۔
 ڈاکٹر اُس سے منور جاوید کے پسندیدہ مشاغل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔
 ”یہ بہترین تیراک تھا ڈاکٹر.....!“ سر جاوید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”جھیل میں
 لوہے کی گیند پھینکتا تھا اور غوطہ لگا کر اُسے تہہ سے نکال لاتا تھا۔“
 ”کیوں آپ غوطہ لگا سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے قاسم سے پوچھا۔



”اُسے مذاخ کرتے ہو۔ میرا ذلیل ڈول دیکھو.....! غراب سے وہیں رہ نہ جاؤں گا۔“
 قاسم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ صاحب تمہیں یونہی بہکا رہے ہیں۔ میں اُن کا بیٹا دیتا نہیں ہوں۔“
 ”ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن اگر کوشش کریں تو اچھے تیراک بن سکتے
 ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یونہی تفریحاً تیرنا شروع کیجئے۔“
 ”دو چار تھوڑا کھو سو میرے تیرنے لگوں گا۔“ قاسم کا غصہ تیز ہو گیا۔
 ”ہوش میں آؤ بیٹے.....!“ سر جاوید نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں تمہا ہوں اس بوڑھے سے میرا پیچھا چھڑاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ کیسا ڈاکٹر
 ہے کہ مکچر اور انجکشن دینے کے بجائے مجھے تیرنا سکھانا چاہتا ہے۔ تم نے بھی غلط سنا ہے مٹا
 جھیل کی تہہ سے لوہے کی گیند نہیں نکالتا بلکہ اپنے منہ سے نکال سکتا ہوں۔“ غصے کی زیادتی کی
 وجہ سے اُس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ دفعتاً لیڈی جاوید کمرے میں داخل ہوئی اور تیز لہجے میں
 بولی۔ ”کیوں آپ لوگ اُس کا دماغ خراب کر رہے ہیں۔ کیا بالکل ہی اُس سے ہاتھ دھونا
 چاہتے ہیں۔“

پھر اُس نے قاسم کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف گھسیٹتی ہوئی بولی۔ ”تم چلو میرے
 ساتھ۔“

قاسم چپ چاپ دروازے سے گذر گیا۔ راہداری میں مڑ کر دیکھا اُن میں سے کوئی ان
 کے پیچھے نہ دکھائی دیا۔

”واکئی..... یہ لوگ مجھے پاگل بتادیں گے۔“ وہ بڑبڑایا۔
 ”ارے..... میں بھگاتی ہوں اس مردود ڈاکٹر کو..... کل سے نہیں آنے پائے
 “جرور..... جرور..... صورت حرام ہے سالہ۔“

حمید نے مارچ اٹھا کر روشنی ڈالی..... وہ کوئی آدمی تھا..... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے
 غرق ہونے سے بچنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

”گھبراتا نہیں.....“ حمید نے اُسے آواز دی۔ ساحل کی طرف سے اب بھی شور سنائی
 دے رہا تھا۔ دفعتاً اُس نے محسوس کیا کہ وہ خود ہی تیرتا ہوا لالچ کی طرف آرہا ہے۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... چلے آؤ۔“ حمید نے دل بڑھانے کے لئے کہا۔
 وہ جھپٹ کر نہ صرف لالچ پر چڑھ آیا بلکہ سیدھا اگلے حصے کی طرف دوڑ گیا۔ پھر قبل
 اس کے کہ حمید کچھ کہتا اُس نے انجن اشارت ہونے کی آواز سنی اور لالچ نے تیزی سے لمبا چکر
 لیا اور ایک سمت اڑتی چلی گئی۔

”گمے..... یہ کیا کر رہے ہو تم.....!“ وہ بوکھلا کر اسٹیرنگ کی طرف جھپٹا۔ اب اُس نے
 دیکھا کہ وہ آدمی غوطہ خوری کے لباس میں ملبوس تھا۔ اُس نے نقاب کا گوشہ کسی قدر اٹھا کر کہا۔
 ”مہربان آدمی..... رحم کرو..... ورنہ وہ مجھے گولی مار دیں گے۔“

”کون.....!“

قبل اس کے کہ وہ جواب دیتا..... بات حمید کی سمجھ میں آگئی۔ ایک لالچ اس کی لالچ کا
 تعاقب کر رہی تھی..... اُس کی ہیڈ لائٹ کی شعاعیں اُس کی اپنی لالچ پر پڑ رہی تھیں۔ اُس
 نے مڑ کر اُس آدمی کی طرف دیکھا اور پھر اسپینڈ میٹر پر بھی نظر ڈالی۔ وہ بتدریج رفتار بڑھاتا

تھی اور ٹھیک اسی وقت پچھلی لالچ سے فائر بھی ہوتے تھے۔
 ”یار اگر تمہارے ہی گولی لگ گئی تو کیا ہو گا۔“
 ”مقدر.....!“ جواب ملا۔

لانچوں کی دوڑ جاری رہی۔ دفعتاً نامعلوم آدمی نے کہا۔ ”میرے قریب آؤ دوست! اب میں نہیں بچ سکتا۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالیں میں ایک چیز تمہارے حوالے کر دیتا چاہتا ہوں۔“

حمید خاموشی سے اُس کی طرف ریگتے لگا اور اندازے سے قریب پہنچ کر بولا ”ہوں۔ کیا کہتے ہو۔“ جواب میں ایسا زوردار گھونسا کپٹی پر پڑا کہ آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔
 پھر سر پر بھی کسی وزنی چیز کی چوٹ پڑی اور ذہن پوری طرح تاریکی میں ڈوب گیا۔

تفتیش

ٹھنڈا سا بادل جسم کو چھوتا ہوا گذر رہا تھا۔ آنکھوں کے پوٹوں سے عجیب طرح کی گدگدی شروع ہوئی تھی اور پھر جسم کے ریٹے ریٹے میں سرایت کرتی چلی گئی تھی۔ گدگدی اور ٹھنڈک عجیب سا احساس تھی۔ جھدن جھدن جھن کئی طرح کے سازج رہے تھے اور برف سے سفید لڑکیاں سفید ہی لباس میں ملبوس رقص کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بھی خنکی ہی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک ناچتی ہوئی اُس کے قریب بھی آئی اور اُس کی پیشانی پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے..... پیشانی پر دباؤ ڈالتی رہی اور اُس کا سر پیچھے جھٹکا چلا گیا۔ حتیٰ کہ گردن ٹوٹنے لگی۔ تکلیف کا احساس اتنا شدید تھا کہ اُس نے لڑکی کو پرے جھٹک دیا اور خود اٹھ بیٹھا۔
 طلسم ٹوٹ چکا تھا، چاروں طرف تلخ اندھیرے کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن گردن کا درد بدستور قائم تھا..... اور سارا جسم سرد تھا۔ کپڑے بھگ کر چپک گئے تھے اور وہ بوکھلا کر

جا رہا تھا۔

”احق آدمی..... آگے طوفانی لہروں کا سامنا ہو گا.....“ اُس نے جھلا کر کہا۔
 ”اُن کی گولی سے نہیں مرنا چاہتا چاہے ڈوب مروں۔“ جواب ملا۔

دفعتاً پچھلی لالچ سے پے درپے دو فائر ہوئے۔
 ”ارے ستیا ناس کراؤ گے میری لالچ کا۔“ حمید نے چیخ کر کہا۔
 ”فکر نہ کرو..... سارے نقصانات کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔“
 حمید اُس کا چہرہ دیکھ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اُس نے اندر کے بلر دیئے۔ ساتھ ہی اُس نے اُس کی غراہٹ بھی سنی۔
 ”دیکھو..... اگر تم نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تو ہم دونوں ہی کو غرق ہو جائیں گے۔“
 ”بہتر یہی ہے کہ چپ چاپ بیٹھے رہوں۔“
 ”وہ تو ویسے بھی غرق ہوں گے۔“ حمید جھلا کر بولا۔ ”آگے خطرناک لہروں سے بڑے گا۔“

”فکر نہ کرو..... ان اطراف کا سمندر میرا چھانا ہوا ہے..... ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“
 ”تم ہو کون؟“

”ضروری نہیں کہ تمہیں یہ بھی بتاؤں۔“

”تمہاری آواز کچھ جانی پہچانی معلوم ہو رہی ہے۔“

”یہ اور تمہارے..... کیا تم مجھے پہچان سکتے ہو۔“

”کوشش کروں گا۔“

”یقین کرو، میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کر رہا..... البتہ جو لوگ میرے پیچھے مجرموں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے تعلق رکھتے ہیں۔“

پچھلی لالچ سے پھر فائر ہوئے اور حمید نشستوں کے درمیان لیٹ گیا۔ وہ اُس نام آدمی پر جھپٹ پڑنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ اگر اتفاقاً وہ پانی میں جا پڑا تو کیا ہو گا۔
 دونوں لانچوں کے درمیان فاصلے میں کوئی فرق نہیں واقع ہوا تھا۔
 البتہ کبھی پچھلی لالچ کی ہیڈ لائٹ کی روشنی اُس کی لالچ میں پل بھر کے لئے پھیل

کھڑا ہو گیا..... اکاد کا بحری پرندوں کی تیز آوازوں سے سکوت ٹوٹا اور پھر پہلے ہی خاموشی طاری ہو جاتی۔

اُس نے پانی کی سمت دوڑنا شروع کر دیا..... شاید صبح ہونے والی تھی اور اتنا اچھا... اس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف اُس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف اُس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف

نیچے ریت تھی..... سر پر کھلا آسمان..... اور حد نظر تک سمندر تھا شیش مارہا تو

بوکھلائے ہوئے انداز میں چاروں طرف دوڑتا پھر لیکن کہیں ایک تنفس بھی نہ دکھائی۔ دور دور تک کسی بستی کا نشان نہیں تھا کہاں لاپھٹکا مردود نے۔ اُس نے سوچا۔ اندر سے۔ اُسے حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا کاش وہ محتاط ہوتا۔ اُس کے بلانے پر بے تامل اُس مناسب نہ سمجھا۔ اُن جواز کے مایگیروں کے متعلق وہ پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔ وہ اکثر قریب کیوں چلا گیا تھا۔ عقل کہاں چرنے لگی تھی۔ ایسی حماقت تو کسی گدھے سے بھی نہ

ہوتی۔ مگر وہ تھا کون..... صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بولتے وقت اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی بولنے کا انداز کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

وہ ذہن پر زور دیتا رہا..... لیکن یادداشت قاصر رہی۔

پھر اب کہاں بھٹکتا پھرے گا۔ پتہ نہیں کہاں لاپھٹکا ہے۔ لالچ بھی ہاتھ سے گئی۔ فریدی نے ہزاروں روپے صرف کئے ہوں گے۔

وہ پھر ریت پر بیٹھ گیا۔ مشرقی افق میں سیاہی مائل سرخی ابھر رہی تھی..... اور چاروں طرف بکھرا ہوا ملگجاندھیرا پہلے سے کچھ زیادہ بوجھل معلوم ہونے لگا تھا۔

وہ وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ پوری طرح اوجھلا پھیل گیا اور فضا بحری پرندوں کے شور سے گونجنے لگی۔

بھیکے ہوئے لباس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھ کر کپڑے اتارے اور انہیں نچوڑ کر دوبارہ پہنا۔

دانتوں میں ریت لک رہی تھی۔ کھارے پانی سے کلیاں کرنی پڑیں پھر بڑی دیر تک منہ بناتا رہا۔ خود کو سو فیصدی اُلو محسوس کر رہا تھا۔

پھر سوچا اس طرح بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ..... کوٹ کی اندرونی جیب ٹوٹی ہوئی

موجود تھا۔ اُسے نکال کر دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ نوٹ بھیکے نہیں تھے اور رقم بھی معقول تھی۔

اُس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف اُس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف اُس نے دھات کا ایک سکہ اچھال کر ٹاس کیا اور جھک کر اُسے دیکھا اور پھر اٹھا کر ایک طرف

نیچے ریت تھی..... سر پر کھلا آسمان..... اور حد نظر تک سمندر تھا شیش مارہا تو

بوکھلائے ہوئے انداز میں چاروں طرف دوڑتا پھر لیکن کہیں ایک تنفس بھی نہ دکھائی۔ دور دور تک کسی بستی کا نشان نہیں تھا کہاں لاپھٹکا مردود نے۔ اُس نے سوچا۔ اندر سے۔ اُسے حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا کاش وہ محتاط ہوتا۔ اُس کے بلانے پر بے تامل اُس مناسب نہ سمجھا۔ اُن جواز کے مایگیروں کے متعلق وہ پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔ وہ اکثر قریب کیوں چلا گیا تھا۔ عقل کہاں چرنے لگی تھی۔ ایسی حماقت تو کسی گدھے سے بھی نہ

ہوتی۔ مگر وہ تھا کون..... صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بولتے وقت اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی بولنے کا انداز کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

وہ ذہن پر زور دیتا رہا..... لیکن یادداشت قاصر رہی۔

پھر اب کہاں بھٹکتا پھرے گا۔ پتہ نہیں کہاں لاپھٹکا ہے۔ لالچ بھی ہاتھ سے گئی۔ فریدی نے ہزاروں روپے صرف کئے ہوں گے۔

وہ پھر ریت پر بیٹھ گیا۔ مشرقی افق میں سیاہی مائل سرخی ابھر رہی تھی..... اور چاروں طرف بکھرا ہوا ملگجاندھیرا پہلے سے کچھ زیادہ بوجھل معلوم ہونے لگا تھا۔

وہ وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ پوری طرح اوجھلا پھیل گیا اور فضا بحری پرندوں کے شور سے گونجنے لگی۔

بھیکے ہوئے لباس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھ کر کپڑے اتارے اور انہیں نچوڑ کر دوبارہ پہنا۔

دانتوں میں ریت لک رہی تھی۔ کھارے پانی سے کلیاں کرنی پڑیں پھر بڑی دیر تک منہ بناتا رہا۔ خود کو سو فیصدی اُلو محسوس کر رہا تھا۔

پھر سوچا اس طرح بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ..... کوٹ کی اندرونی جیب ٹوٹی ہوئی

”بیس روپے..... ہر رات.....!“

”کیا.....؟“ وہ بوکھلا کر بولی۔

لے جانے لگا۔

لکڑے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر چکا تھا۔

5

اُس نے اپنے اچھے خاصے لیج چہرے پر ڈھیر سا پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ ہونٹوں پر پھونڈا

سینھ آئی لینڈ کے پولیس اسٹیشن کا انچارج فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”میری سمجھ میں غصیلی آواز نہیں آتا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکوں گا..... بچپنی رات ساحل پر کسی قسم کا ہنگامہ ہوا تھا

پائے، غصہ و آدمی ہیں اور میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو واپس آئی تھی اسی لئے کہ آپ کے ساتھی کو بحفاظت یہاں تک پہنچا دوں۔“

”پھر وہ کہاں غائب ہو گیا۔“

”میں کیا جانوں..... یقین کیجئے مجھے علم نہیں۔ بے شک میں اُس کے بعد بھی لالچ پر گئی تھی لیکن جلد ہی واپس بھی ہو گئی تھی۔ میں دراصل چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ دونوں کے درمیان جھگڑا تو نہیں ہوتا۔ آپ بہت غصے میں تھے۔“

”اُس لالچ کی مالیت پچاسی ہزار ہے؟“

”پھر بتائیے..... میں کیا کروں..... کیا کر سکتی ہوں۔“

”میں آپ کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”خدا کے لئے اُن سے نہ کہئے گا۔ میں التجا کرتی ہوں۔ وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ میں اُن سے بہت ڈرتی ہوں۔“

”میں نے سنا ہے کہ وہ ماہر نفسیات ہیں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”بس اپنے ساتھی کے متعلق اُن سے مشورہ کروں گا۔“

”کیوں؟..... کیوں؟“

”کیا آپ نے اُس کی شخصیت میں کوئی عجیب سی بات محسوس نہیں کی۔“

”جی ہاں کی تھی..... کچھ تو تھی عجیب سی بات۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

”اُسی کے متعلق مشورہ کروں گا..... آپ کی بات نہیں ہوگی۔“

”اچھا..... اچھا..... میں دیکھتی ہوں۔“ وہ تیزی سے مڑی اور دروازے کو دھکا دیتی ہوئی اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہا۔ ”وہ مل سکیں گے۔“

”اچھا اب آپ جہاں جا رہی تھیں جاییے..... آپ کی موجودگی ضروری نہیں۔“

”دیکھئے..... خدا کے لئے۔“

”مطمئن رہو۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا..... اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ بوڑھا ڈاکٹر شاہ پور اٹھا لیکن فریدی پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔

سمندر سے ساحل کی طرف فاروں کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ اگر کیپٹن حمید اُس سے لالچ کو کہیں اور لے گئے ہوں تو انہیں اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔“

”وہ ان اطراف کے لئے اجنبی ہے؟“

”پھر اب جو کچھ آپ بتائیے کیا جائے۔“

”کچھ نہیں..... میں خود دیکھوں گا۔“

”پچھلی رات..... وہ لڑکی کون تھی لالچ میں۔“

”مفتھہ آئی لینڈ سے کوئی ساتھ آگئی تھی۔ ہمارے لئے قطعی اجنبی تھی۔“

”غالباً اس کے بعد انچارج نے کچھ اور پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے اگر آنکھوں سے بے اعتباری مترشح تھی۔“

پھر فریدی سی سائیڈ ہیون آیا۔ ڈاکٹر شاہ پور کے متعلق اُس نے پچھلی رات ہی کو بہا معلومات فراہم کر لی تھیں۔ لیکن براہ راست اُس سے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اس وقت سی سائیڈ ہیون کے اُس کمرے کے سامنے جہاں ڈاکٹر کا قیام تھا اُس لڑکی ملاقات ہوئی جسے پچھلی رات اپنی لالچ میں دیکھ چکا تھا۔

”نف..... فرمائیے.....!“ وہ بوکھلا گئی۔

”میرا ساتھی پچھلی رات سے غائب ہے..... لالچ سمیت۔“

”میں کچھ نہیں جانتی..... یقین کیجئے آپ کے سامنے ہی میں چلی آئی تھی۔“

”کس طرح یقین کر لیا جائے..... جب کہ اسکے بعد بھی آپ لالچ پر دیکھی گئی تھی۔“

”وہ..... وہ.....!“ ویرا بے حد زور سے نظر آنے لگی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن

سکی۔ فریدی جواب طلب نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے مڑ کر خوفزدہ نظروں سے اُک کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی طرف دیکھا لیکن فوراً ہی اُس کے چہرے نظر ہٹا لی۔

”دیکھئے..... میں یقین دلاتی ہوں۔“

”کمرے میں کون ہے۔“ فریدی نے سر دلچے میں کہا۔

”میرے والد ڈاکٹر شاہ پور.....!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”دیکھئے انہیں نہ معلوم“

”اوہ! شاید میں آپ کو جانتا ہوں۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

”اس سے اور زیادہ آسانیاں پیدا ہو سکیں گی۔“ فریدی مصافحہ کرتا ہوا مسکرایا۔

”آپ اٹلی جنس کے کرٹل فریدی ہی ہیں نا۔“

”آپ کا خیال درست ہے۔“

”فرمائیے..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کے ایک مریض کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں۔

”میرے مریض کے متعلق.....!“ اُس نے حیرت سے کہا۔ ”میرے پاس شاید نادرہ

کوئی کیس آتا ہے۔ یہاں لوگ ذہنی امراض کے صحیح علاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”میں اُس مریض کی بات کر رہا ہوں جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔“

”اوہ..... اچھا..... وہ سر جاوید کا لڑکا۔ اُس کے بارے میں آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

”ڈاکٹر نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ اپنا نام کیا بتاتا ہے۔“

”قاسم.....!“

فریدی نے قاسم کا حلیہ دہرایا، جس پر ڈاکٹر سر ہلا کر بولا۔ ”جی ہاں..... بالکل بالکل۔“

”سر جاوید کہاں رہتا ہے؟“

”یقین کیجئے اُس عمارت کا محل وقوع میرے فرشتے بھی نہ بتا سکیں گے۔“

”بڑی عجیب بات ہے..... کیا آپ وہاں کبھی نہیں گئے۔“

”کل تک روزانہ جاتا رہا ہوں.....!“

”کل تک کیوں.....؟“

”کل انہوں نے مجھے سبک دوش کر دیا..... آج میں اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا۔“

”آپ وہاں جاتے بھی رہے ہیں اور عمارت کا محل وقوع بھی نہیں بتا سکتے۔“

”بات مضحکہ خیز ہے! لیکن حقیقت بھی یہی ہے۔ روزانہ ایک پک اپ مجھے لینے

لے یہاں آتی تھی۔ میں اندر بیٹھ جاتا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے گہرے سبز رنگ کے ہیں۔

ان کے پار دیکھا نہیں جاسکتا۔ ڈرائیور کی نشست پچھلے حصے سے دکھائی نہیں دیتی، اس لئے

اسکرین سے باہر کا نظارہ کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔“

”چلئے..... عمارت کی بیرونی ساخت ہی کے متعلق کچھ بتائیے۔“

”جناب والا..... اس سے بھی معذور ہوں۔“

”کیوں.....؟“

”پک اپ عمارت کے اندر ونی حصے میں رکتی تھی۔ میں اترتا تھا اور ڈرائنگ روم میں پہنچا

دیا جاتا تھا۔ آج تک عمارت کا بیرونی حصہ بھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہیں سے وہ گاڑی مجھے

ہوٹل واپس لاتی تھی۔“

”یہ سر جاوید کون ہے۔“

”ایسٹ افریقہ کا تاجر..... اپنے اعزہ سے ملنے یہاں آیا تھا کہ یک بیک لڑکا یادداشت کھو

بیٹھا۔ یہاں بھی ان کی خاصی بڑی جائیداد ہے۔ کاروبار ہے۔“

”آپ نے اُس کے اعزہ کے متعلق بھی معلومات حاصل کی ہوں گی۔“

”میرے لئے قطعی غیر ضروری تھا۔“

”مستقل قیام کہاں رہتا ہے اُس کا۔“

”وہیں ایسٹ افریقہ میں۔“

”کس شہر میں۔“

”نیروبی۔“

”آپ اپنا پورا معاوضہ وصول کر چکے ہیں۔“

”جی ہاں وہ روزانہ ادائیگی کر دیتے تھے۔“

”کیا مریض کی یادداشت واپس آگئی تھی۔“

”نہیں..... لیڈی جاوید نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکے کی جسمانی

صحت پر نڈا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔“

”سر جاوید کا حلیہ بتائیے۔“

”لبا ترنگا صحت مند آدمی ہے، لیکن قد میں اپنے بیٹے سے کم ہے۔ اتنا زیادہ جسم بھی

نہیں ہے..... اوجیز عمر کا ہے..... بیوی چھپیں ستائیس سال کی ہوگی۔ دراصل سر جاوید کی

فریدی کاؤنٹر سے ہٹ کر ہال کی ایک میز کے قریب آ بیٹھا اور ویٹر کو بلا کر کافی کا آرڈر دیا۔ وہ آدمی اب بھی کاؤنٹر ہی پر کھڑا اخبار دیکھ رہا تھا۔ فریدی نے قطعی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔



دوسری صبح حمید خود کو کافی تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ ناشتہ برآمدے میں ہوا۔ بڑی سی چوکی پر وہ سب ساتھ بیٹھے تھے۔ بوڑھے نے تو اس کے لئے الگ انتظام کیا تھا لیکن حمید نے کہا کہ وہ خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ ہی ناشتہ کرے گا۔ اس پر بوڑھے نے نہ صرف اس کے حسن اخلاق کی تعریف کی تھی بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ ان کے سب سے چھوٹے بچے کی عمر غالباً دس سال رہی ہوگی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ آج وہ اسکول دیر سے پہنچے گا۔

”تم بہت اچھے بچے ہو۔“ حمید اس کا شانہ تھپک کر بولا۔ ”تعلیم کا بڑا خیال ہے تمہیں، بہت ذہین معلوم ہوتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا۔“

”میری میر.....!“ بچے نے شرماکر جواب دیا۔ پھر دفعتاً اسے وہ تدبیر سوجھ بوجھ گئی جس سے وہ کم از کم اس جگہ کے متعلق تو کچھ نہ کچھ معلوم ہی کر سکتا۔

”اچھا ستوں کا نام بتاؤ۔“ اس نے کہا۔ لڑکا گراموفون کے ریکارڈ کی طرح چل پڑا۔ ”سمتیں چار ہیں، شمال، جنوب، مشرق،

مغرب، سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔“

”شاباش..... شاباش..... بہت اچھے۔“ تمہارے محلے کا کیا نام ہے۔ ”پچھلی ہاٹ۔“

دوسری شادی ہے..... میرا خیال ہے یہی شادی وہ حادثہ ہے جس کی بناء پر لڑکے کی زندگی.....!“

”ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا اور جلدی سے

”سر جاوید کی کوئی ایسی پہچان بتائیے جس کی بناء پر اس کی شناخت میں آسانی ہو۔“

”بائیں جبرے پر گہرے گھاؤ کا نشان ہے۔ گہرائی کوئی چوتھائی انچ ہوگی۔“

”شکریہ۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔“

”لیکن قصہ کیا ہے؟“

”اس لڑکے منور جاوید نے ایگل بیچ پر کوئی ہنگامہ برپا کیا تھا..... اس سلسلے میں تو

کر رہا ہوں۔“ فریدی کمرے سے باہر آگیا۔ پھر اسی ہوٹل سے اسٹیشن کے انچارج کو فون پر

”فرمائیے..... کچھ سراغ ملا.....!“ اس نے دوسری طرف سے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں..... دیکھئے یہاں کی ایک عمارت کے متعلق معلومات فراہم کرنی ہیں۔“

فریدی نے ننکھیوں سے بائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”فرمائیے۔“

”سرفراز ولا کہاں ہے اس کا مالک کون ہے۔“

”بہت بہتر..... تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا۔ کس نمبر پر رنگ کروں۔“

”میں خود ہی مل کر معلوم کر لوں گا۔“ فریدی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا اب وہ

کلرک کو کال کے پیسے دے رہا تھا۔ لیکن اس آدمی سے بے خبر نہیں تھا جس کی موجودگی کا

پر اس نے فون پر عمارت کے متعلق ان معلومات کا تذکرہ نہیں کیا تھا جو حقیقتاً حاصل کر

تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ آدمی نگرانی کی حد تک اس میں ضرور دلچسپی لے رہا

ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے وقت بھی اس نے اسے دیکھا تھا اور جب کمرے سے باہر

تھا تب بھی وہ دکھائی دیا تھا اور اب کاؤنٹر پر اس کے قریب ہی کھڑا اخبار دیکھ رہا تھا۔ لیکن

ایسا ہی تھا جیسے کان گفتگو کی طرف لگے ہوں۔

یہ متوسط قد اور اچھی صحت کا مالک تھا۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی

بشرٹ اور پتلون میں تھا۔

”خوب..... خوب..... اچھا تمہارے جزیرے کا نام کیا ہے؟“

”مرتبان.....!“

”واہ..... بھلا یہ نام کیوں پڑا..... گلہ ان کیوں نہیں کہتے ہیں اسے۔“

”ہمارے ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ مرتبان کی شکل کا ہے۔“

”بہت اچھے شاباش.....!“ حمید نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ایگل چیچ سے مرز

میل کے فاصلے پر تھا۔ سرکش قسم کے لوگوں کی آبادی تھی۔ لیکن عیاشی کا بہترین انداز معلومات کے مطابق جزیرہ خاصا بڑا تھا اور یہاں متمول لوگ بھی آباد تھے۔ وہ اتفاق سے آدمیوں کی بستی میں آچسما تھا اور صرف اس بستی کو جزیرے کی کل آبادی سمجھ بیٹھا تھا۔ ہوئی کہ وہ اپنی ہی مملکت کے ایک جزیرے میں لاپھونک گیا ہے۔ واپسی آسانی سے ہو سکتی بس مقامی پولیس اسٹیشن تک جانا پڑتا۔

بچے ناشتہ کر کے اسکول چلے گئے۔ مسٹر اور مسز میزبان نے اُسے بتایا کہ اب وہ بھی اپنے کاموں پر چلے جائیں گے اور لڑکی اُس کے لئے دوپہر کا کھانا تیار کرے گی۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی کے ساتھ تہارہ گیا۔ لڑکی کا موڈ خراب معلوم ہوتا تھا۔ آنا صبح سے اب تک اُس نے اُس کی آواز نہیں سنی تھی۔ آج تو منہ بھی پھولا ہوا تھا۔

”یہاں سے پولیس اسٹیشن کتنی دور ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”کیوں.....؟“ وہ چونک پڑی۔

”یونہی..... کوئی خاص بات نہیں۔ پولیس اسٹیشن کے قریب میرا ایک دوست رہتا ہے۔“

”کیا..... یہاں پہلی بار آئے ہو۔“

”بالکل پہلی بار۔“

”تو اپنے اسی دوست کے گھر کیوں نہیں گئے۔“

”وہ تہارہ ہوتا ہے..... کھانے پینے کی تکلیف ہوتی۔“

”تو تم یہاں قیام کرو گے۔“

”بالکل..... بالکل..... اور تمہاری چارپائی کا کرایہ بھی ادا کرتا ہوں گا۔“

”لے لو..... اپنے روپے.....“ وہ جھلا کر بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”میں اپنی خوشی سے یہ سب کچھ نہیں کرتی۔“

”واہ..... تو تم چیچ اُس بوڑھی کی بیٹی نہیں ہو۔“

”ہوں کیوں نہیں؟“ وہ طیش میں آکر بولی۔

”تو وہ خود ہی تمہیں مجبور کرتا ہے۔“

”ہم غریب ہیں..... یہاں گرانی بہت بڑھ گئی ہے۔ تم لوگوں کی آمد و رفت سے پہلے

ہم سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شہر کے پارسا اور ذی عزت لوگوں نے اپنی رٹیاں یہاں لایاں ہیں۔ یہ آنے جانے والے یہاں پانی کی طرح پیسہ بہاتے ہیں۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم کیا کریں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ اس مسئلے پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد

باہر نکلا۔ پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں کوئی بھی دشواری نہ ہوئی۔ جیسے ہی اُس نے انچارج کے

ہاتھ میں اپنا ملاقاتی کارڈ دیا وہ اچھل پڑا۔

”ارے جناب..... سارے جزیرے میں جیجان برپا ہے۔ اب میں سیونٹھ آئی لینڈ اطلاع

بجوائے دیتا ہوں کہ آپ بھی مل گئے ہیں۔“ اس نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”میں بھی مل گیا مطلب..... کیا لانچ بھی مل گئی ہے۔“

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“ انچارج نے حیرت سے کہا۔ ”اب آپ ہی بتائیے کہ

وہ لاش کس کی ہے؟“

”کیسی لاش.....؟“

”لانچ میں ایک لاش پائی گئی ہے۔ وہ غوطہ خوری کے لباس میں تھا۔“

حمید نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑے اور بولا۔ ”مجھے لے چلے لانچ

کہاں ہے؟“

ایک بیک انچارج کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں اور اُس نے کسی قدر بد لے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ کیپٹن حمید ہی ہیں۔“

”دیرنی گڈ..... ضرور ترقی کر دو گے۔ یہ لو یہ رہا میرا آئیڈنٹی کارڈ۔“ حمید نے کہا اور

پرس سے اپنا آئیڈنٹی کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

انچارج اُس کی تصویر کو اور اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔“
 ”میں معافی چاہتا ہوں۔“
 ”سنو.....“ دفعتاً وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”وہ اس لالچ میں نہیں مرا۔“
 ”لیکن یہ لالچ ملی کب ہے؟“
 ”آج ہی صبح۔“

”حالانکہ اُسے کل صبح ملنا چاہئے تھا۔ کیا لاش سے بدبو آ رہی تھی۔“
 ”جی نہیں..... ڈاکٹر کا خیال ہے کہ لاش ملنے سے صرف تین گھنٹے پہلے وہ مرا ہو گا۔“
 ”ہوں.....!“ حمید کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”کیا یہاں پر انس ہنری کا تمباکو مل سکے گا؟“
 ”ضرور..... ضرور.....!“ انچارج نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ اردلی اندر کو غوط خوری کا لباس پہنا کر متعدد دفاتر کئے گئے۔“
 ”آپ کر ٹل صاحب کا انتظار کریں گے یا اُس سے پہلے ہی لالچ دیکھیں گے.....“
 ”لیکن ان سوراخوں کو بھی دیکھئے ان سے خون ابلا ہے..... جسم ٹھنڈا ہو جانے کے بعد“
 ”آپ کر ٹل صاحب کا انتظار کریں گے یا اُس سے پہلے ہی لالچ دیکھیں گے.....“
 ”لیکن ان سوراخوں کو بھی دیکھئے ان سے خون ابلا ہے..... جسم ٹھنڈا ہو جانے کے بعد“

”دو سوراخوں کو کسی دوسری طرح خون آلود کر دینا ناممکن تو نہیں ہے۔ پہلے زخم سے“
 ”میں انتظار کروں گا.....“ حمید نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ”لالچ میں داخل ہونے جو خون بہا ہو گا وہ انہیں خون آلود کرنے کے لئے کافی ہوا ہو گا۔ اچھا اگر گولی یہیں لالچ پر ماری“
 ”وقت اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کسی قسم کے نشانات ضائع نہ ہونے پائیں اور نہ نئے نشانات کا“
 ”گولی تو لالچ کے کسی حصے پر خون کا کوئی دھبہ دکھاؤ۔“
 ”میں نے ایسی ہر امکانی تدبیر کی تھی کہ ایسا نہ ہونے پائے۔“
 ”میں نے ایسی ہر امکانی تدبیر کی تھی کہ ایسا نہ ہونے پائے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ آدمی جو لالچ لے اڑا تھا اب بھی محفوظ ہے اور یہ کوئی اور ہے جسے“
 ”زبردستی اس کہانی کا ایک کردار بنایا گیا ہے۔“
 ”آخر کیوں؟ وہ لالچ کو کہیں چھوڑ کر فرار ہو سکتا تھا..... اس ڈرامے کی ضرورت ہی“
 ”کیا تھی۔“
 ”عالمی..... تم نے اُس پر یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ تمہیں اُس کی آواز کچھ جانی پہچانی“
 ”میں معلوم ہوتی ہے۔“
 ”میں نے اُس پر یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ تمہیں اُس کی آواز کچھ جانی پہچانی“
 ”میں معلوم ہوتی ہے۔“

”سوال تو یہ ہے کہ یہ پرسوں رات کا سارا دن اور ساری رات لالچ کو کہاں لئے بھرا“
 ”ہو گا اور پھر مرنے کے لئے بھی وہی جزیہ منتخب کیا جہاں تمہیں پھینک گیا تھا۔“ فریدی بڑبڑاتا

”لہذا جو کچھ بھی میں کہہ رہا ہوں اس کے بھی امکانات ہیں۔“ فریدی بولا

”ڈاکٹر آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔.....!“ حمید بڑبڑایا پھر چونک کر بولا۔ ”قام“

رہا..... آپ ڈاکٹر شاپور سے ملے تھے۔“

”ملا تھا..... لیکن بے سود۔“ فریدی نے کہا اور لانچ سے اترتا ہوا بولا۔ ”آؤ.....“

اُس نے انچارج کو لاش اور لانچ کے متعلق کچھ ہدایات دیں اور آگے بڑھ

کے ساتھ چل رہا تھا۔ فریدی نے اپنی اور ڈاکٹر شاپور کی ملاقات کا ذکر چھیڑ دیا۔

وہ پیدل ہی ایک جانب چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً حمید بولا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”کہیں بیٹھیں گے۔“

وہ اب جریرے کے سب سے خوشنماھے میں داخل ہو رہے تھے۔ چاروں طرف بچ

بڑی خوبصورت عمارتیں بکھری ہوئی تھیں۔

وہ ایک اچھے سے کیفے میں جا بیٹھے۔ حمید نے پوچھا۔ ”پھر کہا ہوا۔“

”میں نے اُس آدمی پر نظر رکھی۔“ فریدی نئے سگڑ کا گوشہ توڑتا ہوا بولا۔ ”تھانا“

تین سادہ لباس والوں کو منتخب کیا، جو ہر حال میں اُس کی نگرانی کر سکیں۔ اس کے بعد ملا۔

میونسپل آفس سے جریرے کی ساری عمارتوں کے نقشے منگوائے اور ایسی عمارتیں تلاش کرنے

جس کے اندرونی حصوں تک پک اپ جیسی بڑی گاڑیاں جاسکیں، تین عمارتیں مل بھی گئیں۔“

وہ خاموش ہو کر سگار سلگانے لگا اور حمید مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”اُس میں کہیں بھی سر جاوید کے حلقے کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔“

”بہر حال انہیں میں سے کسی عمارت میں قاسم رکھا گیا تھا۔“

”یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ڈاکٹر شاپور نے غلط بیانی سے کام نہ لیا ہو۔“

”کیا آپ نے اپنی معلومات کے سلسلے میں اس کی لڑکی ویراکا بھی حوالہ دیا تھا۔“

”نہیں.....!“ فریدی نے کہا اور سگار دانتوں میں دبا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اسنیر کا کہیں کافی کشادہ تھا اور آسائش کی ہر چیز مہیا تھی۔ قاسم بھی گمن تھا بھلا اُسے کیا پرواہ ہو سکتی تھی کہ اب کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ دیے جب بھی یہ خیال الجھن کا باعث بننے لگا تو گریں جھک کر کہتا: ”واو نہہ ٹھیکے سے..... کیا میں کوئی ذرا سی چیز ہوں کہ سالے پڑیا میں

.....

مگر یہ کنوئیل تو چہرہ میں لی۔

ادھر لیڈی جاوید کا یہ عام ہالہ اں کے سرد چہری کی۔ اں ویسٹ کی دھڑکیوں کی۔

میں تنہا تھے۔

”تم نے یہ نہ پوچھا کہ اب کہاں جا رہے ہیں۔“ کیڈی جاوید نے کہا۔

”کیا جرورت ہے۔“

”تمہاری اسی سعادت مندی کی بناء پر تمہارے پیپا م سے بہت محوس ہیں۔ ورنہ یاد

داست ہو بیٹھے تھے شور ستر ابا مچاے۔

”اے اللہ! یہ شخص کہ جس نے مجھے گمراہ کیا ہے۔“

ہاں..... ہاں ہو..... حامسوں کیوں ہوئے۔

لڈکی اور معنی ان میں مسکاؤنا میں مسکاؤنا کے معنی ہیں۔ وہ سر مارا پی اسی سرور مارا ہو جاتا ہے۔

[illegible]

لگانے کی کوشش کرنا

”جب تم مجھے تھوڑے تمہیں یاد کرو۔ سوئے کہ زکا راجا شوق تھا“ لڈی ایلو لڈی۔

”اب بھی ہے۔ اب بھی ہے۔“ قاسم حارثی سے بول اٹھا۔

”اب ہم جہاں چلوں گے وہاں رہیں گے۔“

”مگر..... مقرر!“

”آپ ہی جیسی ہوں گی نا..... ہی ہی ہی“

”میں نہیں سمجھی تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”مم..... مطلب یہ کہ..... خوب لمبی ترنگی..... آپ ہی جیسی۔“

”اوہ.....!“ وہ ہنس پڑی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”یہ تو مشکل ہے مجھ جیسی تو نہیں مل سکے گی۔“

”پھر کیا پھانڈہ.....!“ قاسم مردہ سی آواز میں بولا۔

لیڈی جاوید کو پھر ہنسی آگئی دیر تک ہنسی رہی اور قاسم بھی کھسیانے انداز میں

ساتھ دیتا رہا۔ دفعتاً کسی نے کہیں کے دروازے پر دستک دی دونوں خاموش ہو گئے اور

جاوید نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے..... آ جاؤ۔“

سر جاوید دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ قاسم نے ایسا نرم امنہ بنایا جیسے کبھی نکل گیا

”منور بیٹے..... جی تو نہیں مالش کر رہا..... اوہ ضرور یہی بات ہے۔ تم منہ بتا رہے ہو۔“

”جی نہیں..... یہ تو ایسے ہی بن گیا ہے۔“

”یہ..... لیمو..... چوستے رہو۔“ اُس نے دو تین لیمو جیب سے نکال کر اُس کی

بڑھادیے۔

”کیا میں قویٰ لوٹیا ہوں؟“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”منور..... منور.....!“ لیڈی جاوید اُس کا شانہ تھپکنے لگی۔

”جی اچھا لائیے.....!“ قاسم یک بیک بیگی ملی بن گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے لبو

اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔



سیونٹھ آئی لینڈ پہنچ چکے تھے۔ اُن میں سار جٹ رمیش بھی تھا جس نے مقامی پولیس کے سادہ

لباس والوں سے فریدی کے بتائے ہوئے کاموں کا چارج لے لیا تھا۔

فریدی کی دواپی پر اُس نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ وہ اُس آدمی کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اُس

آدی نے دو تار مقامی تار گھر سے دیئے تھے جن کی نقول اُس نے حاصل کر لی تھیں۔

پہلے تار کا مضمون تھا۔ ”لاچ ابھی تک نہیں مل سکی..... مولی۔“

دوسرے تار کا مضمون تھا۔ ”لاچ..... مرتبان..... وہ چلا گیا..... مولی۔“

دونوں تار ایک ہی پتہ پر ایک ہی مقام کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔ پتہ تھا۔ ”ہنی

مون..... نومی چار آئی لینڈ۔“

”ہنی مون.....!“ حمید نے ذانت پر ذانت جھا کر سسکاری لی۔

”اُس آدمی مولی..... یا جو کچھ بھی اُس کا نام ہو..... اُس پر ہر وقت نظر رکھو۔“

فریدی نے رمیش سے کہا۔

رمیش کے چلے جانے کے بعد حمید بولا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔“

”پہلے تار کا یہی مطلب ہے کہ وہ خود یا جسے اُس نے اطلاع دی ہے لاچ کے متعلق کچھ

نہیں جانتے تھے لیکن ہم میں ضرور دلچسپی لے رہے تھے دوسرے تار سے ظاہر ہے کہ اُسے

لاچ کے مرتبان میں پائے جانے کی اطلاع ملی اور اُس نے کسی دوسرے کو اس سے مطلع کرنا

”لیکن چلا کون گیا؟“

”ہو سکتا ہے اشارہ میری طرف ہو۔ میں لاچ کی بازیابی کی اطلاع ملتے ہی یہاں سے

مرتبان کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔“

”بہر حال ان تاروں کی وجہ سے اس سلسلے کی دوسری کڑی مل گئی ہے۔“ حمید نے طویل

سانس لے کر کہا۔

”ہنی مون..... نومی چار.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ پھر حمید کی طرف دیکھ

گئے تھے۔ اس دوران میں فریدی کے طلب کئے ہوئے اُس کے اپنے محلے کے کچھ لوگ

”کبھی نومی چار گئے ہو۔“

”اب آپ کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ ویرا شاپور بھی نومی چار پہنچ جائے۔“
 ”آخری ہدایت۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے بولا۔ ”وہاں قدم قدم پر ویرائیں اگتی ہیں۔ اگر ہوش میں نہ رہے تو جہنم رسید ہو جاؤ گے۔“

”ارے جناب تو پھر آپ خود ہی کیوں نہیں تشریف لے جاتے۔“ حمید نے کہا پھر کسی خیال کے تحت چوک پڑا اور بولا۔ ”آخر یہ قاسم اس شدت سے کیوں اٹو ہو گیا ہے۔“
 ”شاگرد ہے تمہارا..... اور کیا کہوں! ڈاکٹر شاپور نے کسی لیڈی جاوید کا تذکرہ کیا تھا۔ جو اسی کی طرح لمبی ترنگی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ عمر بھی پچیس چھبیس سال ہے۔“
 ”اوہ..... یہ بات ہے..... تب تو وہ سچ مچ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہو گا۔“

”بس اب اٹھو تیاری کرو۔“

”اٹھتا ہوں..... مگر وہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟“

”کیا میں غیب داں ہوں؟“ فریدی جھنجھلا گیا۔

”وہ دونوں سی سائیڈ ہیون میں مقیم تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاپور یہاں سے جا چکا تھا۔“

ختم شد

”مگر آپ گمے ہوں گے تو میں بھی ضرور گیا ہوں..... عالم یہ ہے کہ فرشتوں نے بھی اٹھایا تو زبان سے پہلے یہی نکلے گا میاں ذرا کرئل کو بھی اٹھا دینا۔ اسی قبر میں استراحت فرما رہے ہیں۔“

”اب ہو آؤ..... میں تو کئی بار جا چکا ہوں۔“

”میں اُس زمانے میں کہاں پایا جاتا تھا۔“

”غالبا مشرق بعید کے کسی محاذ پر رہے ہو گے..... بہر حال تمہیں وہ جگہ یاد آئے گی۔ ان جزائر میں سب سے بڑا ہے۔“
 ”مجھے وہاں کیا کرنا ہو گا؟“

”سب سے پہلے تو یہ کرنا ہو گا کہ پہچانے نہ جاسکو۔ پھر ہنی مومن کے متعلق پتا کس کا پتہ ہے۔ اُس کے بعد اُس آدمی کو نظر میں رکھنا مجھے مطلع کرنا پھر میں وہیں پہنچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ یہ لوگ پوری طرح ہوشیار ہیں۔ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھ کر شش کرتے ہیں۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے میک اپ میں رہ کر تعقیب کرنی پڑے گی۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“

”میک اپ کھتا ہے مجھے۔“

فریدی اُس کی بات پر دھیان نہ دیتا ہوا بولا۔ ”بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پاپا پیٹا ورنہ اپنی اسٹائل زدگی کی بناء پر مارے جاؤ گے۔“
 ”یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔“

”سگریٹ پیپر رکھنا۔ تمباکو رول کر کے پیٹا۔ پرنس ہنری کا ڈبہ بھی تمہارے ہاتھ ہو نا چاہئے تمباکو پاؤچ میں رکھنا۔“

”اور روز صبح اٹھ کر دنبالہ دار سرمہ لگانا۔“ حمید جل کر بولا۔ ”چست چمپر اور چمپر۔“

پاجامہ پہننا..... اور یوں چلنا۔“

وہ اٹھا اور چلک چلک کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگا۔

”غصے میں ہمیشہ بھانڈ معلوم ہونے لگتے ہو۔“ فریدی مسکرایا۔

جاسوسی دنیا نمبر 94

پیشکش

ساتواں جزیرہ کے بعد اسی سلسلے کی دوسری کتاب شیطانی جھیل ملاحظہ فرمائیے۔ ساتواں جزیرہ کی کہانی قاسم کے اغواء سے شروع ہوئی تھی اور ”شیطانی جھیل“ کا اختتام اس کی بازیابی پر ہوا ہے۔۔۔۔۔ شیطانی جھیل سے متعلق اگر اس کہانی میں آپ کو اپنے کسی سوال کا جواب نہ مل سکے تو براہِ راست مجھے لکھ بھیجئے۔ اس طرح مجھے اس کے بعد والی کہانی کا ڈھانچہ تیار کرنے میں مدد بھی ملے گی اور آپ مطمئن بھی ہو جائیں گے۔

ادھر بہتیرے پڑھنے والے مجھ سے اس بناء پر فخر ہے ہیں کہ میں دھڑا دھڑ فریدی کے ناول کیوں لکھ رہا ہوں۔ آخر عمران کہاں گیا؟

عمران پھر آ رہا ہے۔۔۔۔۔ مطمئن رہئے۔

اس بار کچھ عجیب قسم کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ لاہور سے کسی صاحبہ نے اٹھائیس پیسے کے بیرنگ لفافے کے ذریعے مجھے مطلع کیا ہے کہ انہیں میری کتابیں مہنگے داموں خریدنی پڑتی ہیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے جب کہ کافی تعداد میں کتب لاہور جاتی ہیں۔ بہر حال میری استدعا ہے کہ کتاب پر چھپی ہوئی قیمت سے ایک پیسہ بھی زیادہ ادا نہ کیجئے اور مجھے اس دوکان کا پتہ لکھ بھیجئے جہاں سے میری کتب مقررہ قیمتوں میں اضافے کے ساتھ فروخت ہوتی ہیں۔ ویسے آپ نے اس کا انتقام مجھ سے بیرنگ لفافے کی شکل میں لیا ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ میں بیچارہ..... خیر اللہ آپ کو معاف کرے۔

(دوسرا حصہ)

شیطانی جھیل

دوسرا خط بمبئی سے موصول ہوا ہے۔ لفافے پر پتہ میرا ہی ہے لیکن لفافے سے برآمد ہونے والا خط کراچی کی کسی صاحبہ کے نام ہے..... ہو سکتا ہے میرا خط ان صاحبہ کے پاس پہنچا ہو۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اس غلطی کا ازالہ ممکن ہے۔

ایک صاحب نے ملتان سے پوچھا ہے کہ عمران عورتوں سے کیوں دور بھاگتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں مہربانی کر کے عمران کی شادی جو لیٹا فٹرز واٹر سے کرا دیں۔ بڑی نوازش ہوگی۔

بھلا آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ مانا کہ آپ کا نام بھی عمران ہی ہے۔ لیکن علی عمران کی شادی سے بھلا عمران احمد صاحب کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ آپ ہی نہیں اکثر خواتین و حضرات کی خواہش ہے کہ فریدی، حمید اور عمران کی شادیاں کرا دی جائیں۔ لیکن میں اس قسم کے مشوروں پر عمل کرنے پر تیار نہیں۔ اگر یہ لوگ ”بال بچے داری“ میں پڑ گئے تو میرا کیا بنے گا..... ابھی تو ان کی ساری کی ساری کمائی پر میں ہی قابض رہتا ہوں..... خدا وہ روز بد نہ لائے کہ ان کے سہروں کے پھول کھلیں..... آپ بھی ہاتھ اٹھائیے..... بددعا کیلیے۔

بھائی عمران احمد صاحب آپ خود اپنی شادی کی فکر کیجئے۔ پھر سال بھر کے بعد اگر آپ نے علی عمران کی بھی شادی کی خواہش کی تو ضرور کرا دوں گا..... (ویسے توقع ہے کہ چھ ماہ بعد ہی آپ شادی کر دریا میں ڈال کا نعرہ لگاتے پھریں گے۔ شفیق الرحمان صاحب سے معذرت کیاتھ)۔

مصطفیٰ

۱۱/۳۰/۶۵

مصنف کی سیکریٹری

سارہ سوچ رہی تھی آخر قلندر کی کوئی کل سیدھی بھی ہے۔ پھر فوراً یہ بھی سوچنا پڑا کہ دیکھئے اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ حتی الامکان وہ اسی کے لئے کوشاں رہی تھی کہ اسے قلندر کے ساتھ کہیں باہر نہ جانا پڑے۔ لیکن وہ تو اس مسئلہ کے تھقیہ کے لئے اس کے گھر آدھکا اور سارہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کا باپ حامی نہ بھر لے۔

اس کے باپ کو معلوم ہوا کہ سارہ کا پاس مکان کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے تو وہ بھی نروس ہو گیا۔ وہ ڈرا کہ کہیں وہ سارہ کو ملازمت سے الگ کر دینے کی اطلاع نہ لایا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ سارہ ایک ضدی چڑچی اور خود سر لڑکی ہے اس کے ساتھ کسی کا بندنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ خود بیچارہ ملازمت کر چکا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ ملازمت پر قرار رکھنے کے لئے آدمی کو بعض اوقات خود اپنی ہی نظر سے گرنا پڑتا ہے..... بہر حال جسم و روح کا رشتہ استوار رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ خود اس نے پورا گیری سے ترقی کر کے قانون گوئی حاصل کی تھی اور ایک سے دوسرے عہدے تک فاصلہ کس طرح طے ہوا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا ہے۔

اس نے نشست کے کمرے سے جلدی جلدی کاٹھ کباڑ اٹھا کر صحن میں پھینکا اور سالنور وہ فرنیچر کی گرد جھاڑنے لگا۔ سارہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے چند منٹ باہر ہی الجھائے رکھے..... پردہ نشین بیوی کو آنکھیں دکھائی تھیں کہ وہ اس کی موجودگی میں بچوں کو کاٹنے

کو سنے سے احتراز کرے گی۔

پھر کسی نہ کسی طرح قلندر کا استقبال کر کے نشست کے کمرے میں لایا تھا۔

”آپ ہی عبدالغفور صاحب ہیں۔“ قلندر نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

”خُشک لہجے میں کہا۔“ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”جی..... یہ..... ہماری خوش قسمتی ہے۔“

”کہ میں یہاں تشریف لایا۔“ اس بار اُس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ خشک تھا۔

عبدالغفور نے دانت نکال دیئے..... اس وقت اس کی بعینہ ایسی ہی حالت تھی اب بھی برقرار ہیں..... یہی بات تھی تو لڑکی کو تعلیم کیوں دلائی تھی..... اپنی ہی برادری ڈپٹی صاحب کے سامنے اچانک پیشی ہو گئی ہو۔

”سارہ میری سیکریٹری ہے.....“ قلندر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”آپ جانتے ہیں کہ ایک سیکریٹری کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں.....؟“ عبدالغفور جلدی سے بولا اور کھانسنے لگا۔ ٹی بی کا روتا تھا اس لئے بیجانی لمحات اُس کے لئے کھانسیوں کی یلغار لاتے تھے۔ قلندر نے جیب سے

نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ آنکھوں میں گہرا تنفر لہریں لے رہا تھا۔

وہ کھانسنے چکا تو ہانپنے لگا۔ سارہ اتنی نزوس تھی کہ دوڑ کر اس کے لئے پانی کا گلاس

لا سکی۔ بہر حال وہ ہانپتا اور بے بسی سے قلندر کی طرف دیکھتا رہا۔

”تو آپ ایک سیکریٹری کے فرائض سے واقف ہیں..... لیکن آپ نے اپنی لڑکی صحیح تربیت نہیں کی۔“

”یہ میں کیا سن رہا تھا.....!“ عبدالغفور آنکھیں نکال کر سارہ کی طرف مڑا۔

قلندر سختی سے ہونٹ پر ہونٹ جمائے بیٹھا سامنے دیوار کو گھورتا رہا۔

”مم..... میں.....!“ سارہ ہکلائی۔

”بتاؤ.....!“ عبدالغفور نے حلق پر زور دے کر کہا اور اُسے پھر کھانسی آگئی۔

”یہ مم..... مجھے..... باہر لے جانا چاہتے ہیں۔“

”جی.....!“ عبدالغفور قلندر کی طرف مڑا۔ آنکھوں میں تیر آئینہ استفہام تھا۔

”کوئی بھی سیکریٹری کو ساتھ لئے بغیر کہیں باہر نہیں جاتا۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ پھر سیکریٹری رکھنے کا فائدہ ہی کیا؟“

عبدالغفور اس بار سوچ میں پڑ گیا..... اور قلندر اُسے گھورتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد عبدالغفور نے نجیف سی آواز میں کہا۔ ”جی..... میری برادری

والے.....“

”بس بس.....!“ قلندر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا..... ارڈل طبقے کی برادریاں

اب بھی برقرار ہیں..... یہی بات تھی تو لڑکی کو تعلیم کیوں دلائی تھی..... اپنی ہی برادری

کے کسی ٹانگے والے سے بیاہ دیتے۔“

”جی..... یہ بات نہیں.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش رہ گیا۔ سارہ کا

غصے کے مارے برا حال تھا۔ بس چلتا تو قلندر کا منہ نوچ لیتی۔

”پھر کس لئے تعلیم دلائی تھی۔ کیا اس لئے بی۔ اے کی ڈگری سمیت اسے اپنی برادری

کے کسی ٹانگے والے کے حوالے کر دو گئے۔“

”جی اب میں کیا بتاؤں۔“ عبدالغفور نے بے بسی سے کہا۔

”صریحاً یہی مقصد تھا کہ وہ تمہاری کفالت کرے اور سنو اگر اسی کی سی اہلیت رکھنے والا

کوئی لڑکا ہوتا تو اُسے ڈھائی صد روپے ماہوار سے زیادہ کی ملازمت نہ ملتی۔ لیکن یہ اب ساڑھے

چار سو روپے ماہوار کمایا ہی ہے۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

”شکر گزاری میرے کس کام کی۔“

”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔“

”نومی چار..... تم جانتے ہو کہ میں مصنف ہوں۔ میرے لئے ماحول کی تبدیلی

ضروری ہے۔ میں کچھ بہت ہی اہم کتابیں لکھنا چاہتا ہوں..... لیکن سونا کی فضا اس کے لئے

سازگار نہیں۔“

عبدالغفور فوراً ہی کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ قلندر اسے گھورے جا رہا تھا۔

عبدالغفور سوچتا رہا۔ آدھی پنشن فروخت کر چکا ہوں۔ آدھی تو مہینے کے چار دن بھی نہ

اے آگے کبھی نہ بڑھاتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اس کے متعلق سب کچھ بھول گیا ہو.....
لیکن اس معاملے کو نہ جانے کیوں دوبارہ چھیڑ بیٹھا۔

”آخر تم کیوں نہیں جانا چاہتی تھیں میرے ساتھ؟“ اس نے پوچھا
سارہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ویسے ساتھ جانے پر ناراضماندی کی اس کے
علاوہ اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ چوبیس گھنٹے پور ہوتا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

”بولو..... بتاؤ مجھے.....!“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا۔

”دراصل..... مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔“

”مجھ سے.....؟“ قلندر اچھل پڑا۔

”جی نہیں..... اس سے۔“

”کس سے.....!“

”وہ جو میرا تعاقب کرتا ہے.....؟“ اس نے آج پہلے پہل قلندر سے اس کا تذکرہ کیا۔

غیر ارادی طور پر..... کچھ نہ کچھ تو بولنا ہی تھا..... یہ بات زبان سے نکل گئی۔

”کون کرتا ہے تمہارا تعاقب.....؟“ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

اور سارہ کو پوری کہانی شروع سے دہرائی پڑی پھر یہ بھی بتایا کہ وہ کس طرح کیپٹن حمید

کو دھوکا دے کر نکل گیا تھا اور پھر اس کے بعد سے نظر نہیں آیا تھا۔

قلندر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر غصیلی آواز میں بولا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں.....

یہ اسی مردود کی حرکت ہو گی۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا۔ ”میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”جی نہیں.....!“ سارہ بوکھلا گئی۔

”میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ حرکت اس نے محض اس لئے کی تھی کہ تم اُس

سے اس کا تذکرہ کرو اور وہ تمہیں اپنا ممنون کرم بنانے کے لئے تمہاری مدد کا وعدہ کر لے۔

اُسے وہ سورا کچھ..... میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ لڑکیوں سے متعارف ہونے کا ماہر

نہ؟ اگر ایسا نہیں تھا تو روزانہ دوڑ کر آتا کیوں تھا؟ یہی بات تھی۔“

نکال سکے گی۔ اگر سارہ کی ملازمت بھی جاتی رہی تو کیا ہو گا۔ بچوں کی فیس کیسے ادا ہو گی۔
کے بلوں کی ادائیگی کیسے ہو گی۔ کسی دوسری جگہ وہ ساڑھے چار سو نہیں حاصل کر سکے گی
آدمی صرف تنگی معلوم ہوتا ہے۔ تنگی اور صاف گو۔ دل کا بُرا نہیں۔ اور اوباش بھی
ہو سکتا۔ میں نے اپنے بال دھوپ میں تھوڑے ہی سفید کئے ہیں۔ صورت دیکھ کر بتا سکتے
کہ کون کیسا آدمی ہے۔ برادری والوں کا کیا ہے..... کون حرازہ یہ پوچھتا ہے
عبدالغفور مر رہے ہو یا جی رہے ہو۔ جہنم میں جائیں سب اور پھر کون سا مجھے اپنی بیٹی
جابلوں میں بیاہنا ہے۔

بالآخر اس نے سر اٹھا کر پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔ ”جی بہت اچھا۔“

”اباجی.....!“ سارہ قریب قریب چیخ پڑی۔

عبدالغفور نے منموم سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔
”زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے۔“

پھر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کہنا چاہئے۔ اتنے میں ایک جیٹ طیارہ کان پھاڑتا ہوا
سے گذر گیا اور عبدالغفور نے تھوک نکل کر کہا۔ ”لڑکیاں آج کل ہوائی جہاز اڑاتی ہیں۔“

سارہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گئی۔

بہر حال اب کوئی بہانہ باقی نہیں رہا تھا۔ قلندر چلا گیا..... لیکن سارہ بھی گھر میں
نکل سکی تھی۔ کیونکہ اس کے باپ کے فیصلے سے اس کی ماں نے اس حد تک اختلاف کیا
کہنے لگی۔ ”اس سے بہتر تو یہ تھا کہ تم بیٹی کو چپکے میں بٹھا آتے.....!“

باپ جو تالے کر جھپٹا..... سارہ بیچ میں آگئی اور وہ کھانسیوں کی پرواہ کئے بغیر چیخا

کہتا رہا۔ ”حرازہ اوی..... جاہل..... تو کیا جانے..... یہ نیاز مانہ ہے..... کتیا کی بچی۔“

بوڑھیا چیخ چیخ کر روتی اور عبدالغفور کی سات پشتوں کو نوازتی رہی۔

اور سارہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی..... اسی دن ٹھیک دو بجے اسے سونا بھی پہنچا

وہاں سے دونوں اسٹیمر پر ساتھ سفر کرتے۔

سامان ہی کیا لیتا تھا۔ ایچی میں چند جوڑے کپڑے رکھ لئے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ

عادت کے مطابق اس مسئلے پر مزید گفتگو نہیں کرے گا۔ جو بات جہاں شروع ہو کر ختم

جب حمید نے اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت ضروری ہیں۔“
پوسٹ ماسٹر کا منہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں اور وہ کچھ دیر
بعد بڑبڑایا۔ ”یہی تو میں کہتا تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“

حمید چاروں طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کسی سے بتائیں گے نہیں کہ میں کون ہوں اور

کیا جانتا ہوں۔“
”جی ہاں..... قطعی نہیں..... قطعی نہیں۔“ وہ حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پر تفکر

لجے میں بولا۔

معر تھا اور الجھے ہوئے ذہن کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

حمید نے اسے غور سے دیکھا اور اپنی اس حماقت پر افسوس کرنے لگا جب میک اپ میں
تھا تو اسے اپنی صحیح شخصیت سے آگاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ”ہنی مون“ ایک ٹیلی گرافک
ایڈریس تھا۔ اُس پتے پر تار آتے تھے لیکن انہیں موصول کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیا اس
پتے پر تار بھیجنے والے اس حقیقت سے لاعلم ہو سکتے ہیں کہ ان کے تار تقسیم نہیں کئے جاسکے؟
ایسی صورت میں ”ہنی مون“ والے تاروں کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر
کے بیان کے مطابق وہ اب بھی آتے رہتے ہیں؟

پوسٹ ماسٹر نے جلد ہی دس بارہ تار اس کے حوالے کئے اُن میں وہ دونوں تار بھی
موجود تھے جو سیونٹھ آئی لینڈ سے کسی ”موبلی“ نے روانہ کئے تھے۔
”میں انہیں لے جانا چاہتا ہوں۔“

”بالکل لے جائیے جناب۔“ پوسٹ ماسٹر نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا خیال
ہے کہ آپ مجھے ان کی رسید بھی عنایت کریں گے۔

”بالکل..... بالکل.....!“ حمید نے کہا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر رسید لکھنے لگا۔
”کیوں صاحب.....!“ پوسٹ ماسٹر بولا۔ ”پولیس اس سلسلے میں مجھ سے جواب تو نہ
طلب کرے گی۔“

”کس سلسلے میں.....!“ حمید نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

”یہی کہ میں اس معاملے کو پولیس کے علم میں کیوں نہیں لایا۔“

اس پر سارہ نے اُسے خنجر والا واقعہ بھی بتایا۔

”سب کو اس ہے؟“ وہ نمرا سامنے بنا کر بولا۔ ”اس ڈرامے میں زور پیدا کرنے کے
یہ حرکت بھی کر بیٹھا ہوگا۔ خود ہی کسی آدمی سے کہہ دیا ہوگا کہ خنجر پھینک کر بھاگ نکلے۔
”لیکن اگر وہ خنجر لگ ہی جاتا تو.....!“

”ایسا رہا ہی نہ ہوگا کہ لگ سکتا۔ کیا تم نے اُس خنجر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا۔“
”جی نہیں۔“

”تو بس اسی پر یقین کر لو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

سارہ کش کش میں پڑ گئی۔ خنجر کے بارے میں حمید کا رویہ یاد آیا۔ اس نے اس کی فہم
پرواہ نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ اٹھ کر دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر کیا قلندر سچ ہی کہہ رہا ہے۔



نومی چار سچ بڑی حسین جگہ ثابت ہوئی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ پہلے کبھی کیوں نہ آیا
اس سے بڑی تفریح گاہ شاید ملک میں کوئی دوسری نہیں تھی۔ لیکن تفریح سے پہلے
ضروری تھا۔

اس نے ہوٹل مونا کو میں قیام کیا اور اسی دن سے کام بھی شروع کر دیا..... لیکن
ہی منزل پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

تار گھر والوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اس سلسلے میں کافی بیزار ہو چکے ہیں کیونکہ ”ٹا
مون“ یہاں کسی کا بھی ٹیلی گرافک ایڈریس نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پتے پر تار آتے
ہیں اور ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتے ہیں۔

”کیا کچھ محفوظ بھی ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے..... میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔“ پوسٹ ماسٹر نے کہا۔

”آپ کیسے سمجھ لیتے کہ پولیس کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”یہی تو..... یہی تو.....“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”بس اب اس سلسلے میں قطعی خاموشی اختیار کیجئے اور اس کے بعد بھی جو ہمارا

انہیں میرے لئے احتیاط سے رکھ لیجئے۔“

”میں یہی کروں گا جناب..... یہی کروں گا۔“

حمید نے سارے تار سمیٹ کر بیگ میں رکھے اور وہاں سے چل پڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی

ایک لڑکی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ حمید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور لڑکی بھی

بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ کو دباتی ہوئی دوسری طرف مڑ گئی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اس کی یہ مسکراہٹ اسے روک بھی لیتی لیکن اس وقت

اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں رکنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تاروں کو دھکا دے کر اندر چلا آیا۔

کردینے کے لئے تو بھیجے نہیں جاتے تھے۔ ان کا کوئی مقصد تھا جو کسی نہ کسی کو ضرور مارا

ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے تار گھر ہی کے کسی فرد کے لئے وہ تار آتے رہے ہوں۔

بہر حال فریدی نے جو کام اسے سوچنا تھا اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اب وہ اُس کی ہڈی

حاصل کئے بغیر دوسرا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ویسے ذاتی طور پر اپنی اس حماقت کا ازالہ تو کرنا کی گنگو تھی طور پر سن لیتی۔

تھا کہ اس نے خود کو پوسٹ ماسٹر پر ظاہر کر دیا تھا اور یہ ازالہ اس کے علاوہ اور کیا ہوتا

موجودہ میک اپ ختم کر کے کوئی دوسری وضع اختیار کرتا۔ لیکن مسئلہ تھا ہوٹل کا.....

اس نے دو افراد کی رہائش کے لئے انگنچ کیا تھا لیکن خود بھی میک اپ میں وہاں متعارف ہوا

اس کے علاوہ کسی دوسرے میک اپ میں رہائش ناممکن ہو جاتی۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے تدبیر سوچ ہی گئی اور اس نے کاؤنٹر کلرک سے کہا اگر کوئی مسٹر

وہاں آئیں اور اسے پوچھیں تو انہیں فوراً اس کے کمرے میں بھجوا دیا جائے، کیونکہ وہ اس

ساتھ قیام ہی کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔

راتے میں اس نے خیال رکھا تھا کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا اور ہوٹل

داخل ہوتے وقت قطعی طور پر مطمئن تھا کہ کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور

اب میں بھی تبدیلی کر کے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کاؤنٹر کلرک سے کیپٹن خاور کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

”آپ مسٹر پرویز ہیں؟“ کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”کیپٹن خاور کمرہ نمبر سترہ میں آپ کے منتظر ہیں۔“

”میں پہلے یہاں کبھی نہیں آیا..... کیا آپ کسی کو ساتھ نہ کر دیں گے۔“

”ضرور..... ضرور.....“ کاؤنٹر کلرک نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کر کہا۔ ”کمرہ

نمبر سترہ میں لے جاؤ۔“

کمرہ نمبر سترہ کے دروازے پر رک کر حمید نے دستک دی۔ چند لمحے کھڑا رہا اور پھر

اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں رکنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تاروں کو دھکا دے کر اندر چلا آیا۔

اب وہ کیپٹن خاور سے مسٹر پرویز ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فریدی کو اس تبدیلی کی

اطلاع دینی چاہئے۔

لیکن اسی ہوٹل کا فون استعمال کرنا نامناسب سمجھا کیونکہ ایکس چیچنگ پر بیٹھنے والی لڑکی ان

حاصل کئے بغیر دوسرا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ویسے ذاتی طور پر اپنی اس حماقت کا ازالہ تو کرنا کی گنگو تھی طور پر سن لیتی۔

تھا کہ اس نے خود کو پوسٹ ماسٹر پر ظاہر کر دیا تھا اور یہ ازالہ اس کے علاوہ اور کیا ہوتا

موجودہ میک اپ ختم کر کے کوئی دوسری وضع اختیار کرتا۔ لیکن مسئلہ تھا ہوٹل کا.....

اس نے دو افراد کی رہائش کے لئے انگنچ کیا تھا لیکن خود بھی میک اپ میں وہاں متعارف ہوا

اس کے علاوہ کسی دوسرے میک اپ میں رہائش ناممکن ہو جاتی۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے تدبیر سوچ ہی گئی اور اس نے کاؤنٹر کلرک سے کہا اگر کوئی مسٹر

وہاں آئیں اور اسے پوچھیں تو انہیں فوراً اس کے کمرے میں بھجوا دیا جائے، کیونکہ وہ اس

ساتھ قیام ہی کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔

راتے میں اس نے خیال رکھا تھا کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا اور ہوٹل

داخل ہوتے وقت قطعی طور پر مطمئن تھا کہ کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور

اب میں بھی تبدیلی کر کے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کاؤنٹر کلرک سے کیپٹن خاور کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

”آپ مسٹر پرویز ہیں؟“ کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”کیپٹن خاور کمرہ نمبر سترہ میں آپ کے منتظر ہیں۔“

”میں پہلے یہاں کبھی نہیں آیا..... کیا آپ کسی کو ساتھ نہ کر دیں گے۔“

”ضرور..... ضرور.....“ کاؤنٹر کلرک نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کر کہا۔ ”کمرہ

نمبر سترہ میں لے جاؤ۔“

”اونہہ دیکھا جائے گا۔ وہ دوسرے دن سیونٹھ آئی لینڈ پہنچ جائے گا.....“ پھلپانے لگی تھیں۔
 ویٹر سے کافی لانے کو کہا اور ریکریشن ہال کے پروگرام کی کاپی دیکھنے لگا۔ آج ٹوئیسٹ۔
 تھی..... مغربی ٹوئیسٹوں کے ساتھ ہی ساتھ لڈی ٹوئیسٹ اور خیر ٹوئیسٹ وغیرہ پر سارہ ہی کو مرکز بنائے رہا تھا۔
 نظر آئے اور اس نے سوچا کہ شام یہیں گزاری جائے۔
 اس نے سوچا کہ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

ویٹر کافی رکھ کر چلا گیا تھا..... وہ کافی پاٹ کا ڈھکن اٹھا کر سونڈھی بھاپ اٹھانے میں اس نے دیکھا کہ قلندر اس سے جلدی جلدی کچھ کہہ رہا ہے اور وہ بھی پوری اندوز ہوتا رہا..... پھر پیالی میں شکر ڈال کر کافی اٹھیلنے جا رہا تھا کہ میساختہ چوک پر طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہے..... وہ سر ہلاتی رہی اور قلندر دونوں ہاتھ ہلا کر کچھ کہتا قلندر بیابانی کی سیکریٹری سارہ اوپری منزل کے زینے طے کر کے ڈائینگ ہال پہنچا۔ پھر وہ اٹھا اور صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔
 پر قدم رکھ رہی تھی۔
 سارہ وہیں بیٹھی رہی۔
 ہندہ میں منٹ گذر گئے لیکن قلندر کی واپسی نہ ہوئی۔

حمید نے متحیرانہ انداز میں سیٹی بجائی اور سر کا پچھلا حصہ سہلانے لگا۔
 اب سارہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک خالی میز کی طرف جا رہی تھی۔
 حمید مطمئن تھا کہ وہ اسے پہچان نہ سکے گی لیکن سوچ رہا تھا کہ یہاں اس کا کیا اب سہلا۔ ”اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ مشہور مصنف جناب قلندر بیابانی تھے۔“
 ”جی ہاں..... آپ کا خیال درست ہے.....“ سارہ جلدی سے بولی۔ وہ کچھ بوکھلا سی نہیں وہ تنہا ہے یا قلندر بھی ساتھ ہے۔
 جلد ہی یہ الجھن بھی رفع ہو گئی کیونکہ اس نے قلندر کو بھی زینے طے کر کے پہنچائی تھی۔
 ”کیا پھر تشریف لائیں گے؟“
 دیکھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک ہی میز پر نظر آئے۔ قلندر نے کاؤنٹر کلرک کو: ”جی..... پتہ نہیں۔“ وہ اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی کیونکہ وہ براہ راست ہدایات بھی دی تھیں۔
 سارہ میز اریز اسی دکھائی دیتی تھی اور وہ دونوں ہی خاموش تھے۔
 حمید سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اطلاع بھی فریدی کے لئے دلچسپ ثابت ہو سکے گی۔
 ان کا ان معاملات سے کیا تعلق۔ ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو۔ پھر اُسے وہ نامعلوم آواز
 جو سارہ کا تعاقب کیا کرتا تھا..... اور پھر وہ خنجر.....؟

غدار

”عرصہ سے ملنے کی خواہش تھی۔“ حمید نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”یوں تو ان کی دھندلی اور ٹھنڈی روشنی میں آزاد کلب کے آرکسٹرا کی ہلکی ہلکی موسیقی کچھ ساری تصانیف بھی پڑھی ہیں اور تصاویر بھی دیکھتا رہتا ہوں لیکن ملنا بھی چاہتا تھا..... غالباً وہ لگ رہی تھی۔ ذہن کے دھندلکوں میں بعض بھولی بسری یادیں اپنی مخصوص خوشبو کی اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔“
 دھندلی اور ٹھنڈی روشنی میں آزاد کلب کے آرکسٹرا کی ہلکی ہلکی موسیقی کچھ ساری تصانیف بھی پڑھی ہیں اور تصاویر بھی دیکھتا رہتا ہوں لیکن ملنا بھی چاہتا تھا..... غالباً وہ لگ رہی تھی۔ ذہن کے دھندلکوں میں بعض بھولی بسری یادیں اپنی مخصوص خوشبو کی اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔“

یہیں مقیم ہیں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... میں ان کی سیکریٹری ہوں۔“

”اوہ بڑی خوشی ہوئی۔“ حمید بڑے مخلصانہ انداز میں کھل اٹھا۔ ”کیا آپ مجھے دیں گی کہ میں کچھ دیر آپ سے اپنے محبوب مصنف کی باتیں کروں۔“ وہ کچھ ہچکچائی پھر مسکرا کر بولی۔ ”ضرور..... ضرور۔“

حمید کرسی کھسکا کر اسی میز پر جم گیا اور سعادت مندانہ انداز میں بولا۔ ”ہز شکر ہے۔“ سارہ کچھ نہ بولی۔ حمید بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ اپنی آواز کو بدلنے پر توجہ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعلق کیا پوچھوں؟ وہ کتنی واپس آئیں گے۔“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صبح واپسی ہو۔ اپنے کسی دوست کے بارے میں سنا ہے کہ وہ کبھی نہیں آئے۔“

”اوہ..... اوہ.....!“ حمید مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ”مجھے بے حد ہے کہ اس وقت ملاقات نہ ہو سکے گی کیا آپ پھر کسی وقت مجھے ان سے ملا سکیں گی۔“ ”بشرطیکہ وہ اس پر تیار ہو گئے۔“ سارہ نے جواب دیا۔ اب اس کی ہچکچاہٹ باقی رہی تھی۔

”کیا عام طور پر اپنے مداحوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔“

”میں نے تو آج تک نہیں دیکھا کہ وہ اپنے کسی پڑھنے والے سے ملے ہوں۔“

”کیا انکار کر دیتے ہیں۔“

”جی ہاں! اکثر ایسے خطوط آتے رہتے ہیں جن میں اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔“

”بہت بڑے آدمی ہیں۔“ حمید نے طویل سانس لی۔

”آخر آپ مل کر کیا کریں گے۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔“

”فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہوتا..... لیکن۔“

”تو پھر ملنا فصول ہی ہے۔“

”آپ سمجھتی نہیں..... وہ اتنے بڑے مصنف ہیں۔“

”بس صرف بڑے مصنف ہی ہیں اور کوئی خاص بات مجھے ان میں نظر نہیں آئی۔“

”آپ ہر وقت دیکھتی رہتی ہیں نا۔“ حمید نے بے ڈھنگی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”کیا آپ بھی یہیں مقیم ہیں۔“ سارہ نے پوچھا۔

”جی نہیں..... بس یونہی چلا آیا تھا۔“

”مجھے تو وحشت ہوتی ہے یہاں کے ماحول سے۔“ سارہ بولی۔

”جی ہاں..... کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو تو ہوٹل مونا کو میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔“

”دراصل میں ذاتی طور پر ہوٹلوں سے قطعی دلچسپی نہیں رکھتی۔“

”میں پھر عرض کروں گا کہ کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہریے۔ آپ یقیناً اسے پسند کریں گی۔“

”دیے میرا خیال ہے کہ آپ دلچسپی لینا ہی نہیں چاہتیں۔“

”کیوں یہ کیسے کہا آپ نے۔“

”ٹھیک ہی کہا ہے میں نے..... اس وقت آپ کی ہم عمر ساری لڑکیاں ریکریشن ہال میں ٹوئٹ کر رہی ہوں گی..... آپ یہاں بیٹھی ہیں۔“

”مجھے ٹوئٹ کرنا نہیں آتا.....!“

”ٹوئٹ میں کیا رکھا ہے..... بس موسیقی کے اتار چڑھاؤ اور لے کے ساتھ جسم کو“

”فرق کاتی اور لڑکائی رہتے۔“

”مجھے شرم آتی ہے..... سوچ کر ہی شرم آتی ہے۔“

”ٹوئٹ ناچ نہیں بلکہ ورزش ہے۔“

”کچھ بھی ہو..... مجھے وحشت ہوتی ہے ان چیزوں سے۔“

”پھر بھی دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔ اگر آپ کہیں تو ریکریشن ہال کے ٹکٹ لاؤں۔“

”جی نہیں شکر ہے۔“

”آپ واقعی عجیب ہیں۔“ حمید مسکرایا۔

”قلندر صاحب اسے پسند نہیں کریں گے..... وہ بے بسی سے بولی۔“

”کمال ہے..... کیا آپ نے ان کے ہاتھ اپنا سوچنا ہوا ذہن بھی فروخت کر دیا۔
سارہ کچھ نہ بولی۔ غالباً سوچ رہی تھی کہ جواب میں اسے کیا کہنا چاہئے۔

”نہیک اسی وقت حمید سنبھل کر بولا۔ ”معاف فرمائیے گا..... مجھے اس حد تک
تکلف نہ ہونا چاہئے..... ہم ابھی ابھی تو ملے ہیں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ سارہ مسکرائی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر لاؤں ٹکٹ۔“ حمید نے احمقانہ انداز میں خوش ہو کر پوچھا۔

”لائیے۔“ وہ آہستہ سے بولی اور صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

حمید وہاں آیا جہاں ریکریشن ہال کے ٹکٹ ملتے تھے۔ دو ٹکٹ خریدے اور پھر واپس آئے۔
”چلئے.....!“ سارہ سے اس نے کہا۔

”کہیں قلندر صاحب واپس نہ آجائیں۔“

”اد نہہ..... چھوڑئیے..... دیکھا جائے گا۔ اب تو میں ٹکٹ لے آیا ہوں۔“

”چلئے.....!“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی اور اٹھ گئی۔

ریکریشن ہال میں خاصی چہل پہل تھی۔ انڈس ویلی چاچا جانچ رہا تھا لیکن راقص اپنی
اپنی موزوں سے نہیں اٹھے تھے۔

ایک ویٹر نے ایک خالی میز تک ان کی رہنمائی کی۔

وہ بیٹھ ہی رہے تھے کہ ایک جوڑا اتر کتا ہوا اپنی میز سے اٹھا اور رقص کے فرش پر

آیا..... کچھ دیر تک صرف وہی دونوں ناچتے رہے پھر دوسروں نے بھی ان کی تقلید شروع
اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا فرش بھر گیا۔

سارہ منہ دبائے ہوئے ہنس رہی تھی۔

”آپ ہنس رہی ہیں.....!“ حمید بولا۔

”واقعی مجھے ہنسانہ چاہئے۔“ وہ یک بیک سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ ”رونے کا

ہے..... یہ لڑکیاں جو کل تک پردے میں رہتی تھیں آج یہاں سینکڑوں مردوں کی موجودگی
میں کتنی بے حیائی سے اپنے جسموں کو حرکت دے رہی ہیں۔“

حمید نے سوچا اب یہ صاحبزادی اخلاقیات پر بور کر لیں گی۔ لہذا جلدی سے بولا۔

”آپ سب سے پہلے قلندر صاحب کے ٹاول پڑھ لیتی ہوں گی۔“

”جی ہاں.....“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”میں ہی لکھتی ہوں لیکن لکھ لینے کے بعد قطعی

یاد نہیں رہتا کہ کیا لکھا تھا۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“

”مجھے کسی قسم کے بھی ٹاول پسند نہیں۔“

”یعنی آپ کو ادب سے دلچسپی ہی نہیں۔“

”یہ میں نے کب کہا ہے۔“

”تو پھر کس قسم کا ادب پسند ہے آپ کو۔“

”انتہائیہ یا پھر غنائیہ۔“

”یعنی شاعری اور تنقید وغیرہ۔“

”شاعر یا دلیر.....!“

”کون سا شاعر پسند ہے..... آپ کو۔“

”ہر وہ شاعر جو خالص شاعری کرتا ہو۔ سیاسیات! اخلاقیات یا فلسفے پر بور نہ کرتا ہو۔“

”ابھی تو آپ اخلاقیات ہی سے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”نثر میں..... ہر چیز کا اپنا الگ مقام ہوتا ہے۔ ہمیر آئل میں بال سیاہ کرنے کی ادویات

بلشبہ ملائی جاسکتی ہیں لیکن طیر یا یا ٹائیفائیڈ کی دوائیں ہرگز نہیں ملائی جاسکتیں۔ ملائی بھی گئیں

تو بے مصرف ثابت ہوں گی۔“

”آپ تو باقاعدہ بحث کر سکتی ہیں اس مسئلہ پر۔“

”جی ہاں..... کیوں نہیں؟“

”تو پھر آخر شیرانی پسند ہو گا آپ کو؟“

”مجھے پسند ہے۔“

”اگر آپ کو شش کریں تو نوٹیٹ بھی کر سکتی ہیں۔ سر سے پاک نغمگی ہی نغمگی

ہو کر رہ جائیے گا۔“

”جی نہیں شکریہ۔ آپ ٹکٹ خرید چکے ہیں اس لئے صرف دیکھتی رہوں گی۔ ویسے اگر

آپ ناچنا چاہیں تو کسی اور کو تلاش کر لیجئے۔“
”مجھے آج تک ناچنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔“
”تو بس پھر خاموشی سے دیکھتے رہئے۔“

”جی ہاں..... پھر اور کیا کروں گا۔“ حمید نے مردہ سی آواز میں کہا۔

اور وہ اس کی مسمیٰ سی شکل دیکھ کر ہنس پڑی..... ٹھیک اسی وقت پلیٹ فارم

سرے پر کھڑے ہوئے دو آدمی ان کی طرف مڑ کر تیزی سے میز کے قریب آئے اور ہر
نے اپنے دابے شانے پر کسی سخت چیز کی چیبن محسوس کی۔

”ریوالور کی نال ہے۔“ اس آدمی نے کہا جو اس کے سر پر مسلط تھا۔ حمید نے دوسرے
کی طرف دیکھا جو سارہ سے لگا کھڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کوٹ کی جیب میں ریوالور
ہو۔ حمید نے سارہ کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا۔



سارہ کی بدحواسی بڑھتی رہی لیکن اس کے باوجود بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی
تھی۔ کئی بار سختی سے دانت پر دانت جمائے لیکن آواز تھی کہ نکلے ہی جا رہی تھی۔ وہ چیختی رہی
اور ہال میں ہنگامہ برپا رہا۔

پھر دفعتاً چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہال کے سارے بلب بجھ گئے تھے۔ اس کے بعد
اس کی چیخیں بھی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ خود بخود نہیں بلکہ اندھیرے میں کسی کا ہاتھ اس کے
منہ پر پڑا تھا اور سختی سے جم گیا تھا..... پھر اس کے پیر بھی زمین سے اکھڑ گئے تھے۔ کسی نے
اسے اپنی کمر پر لا لیا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا اس لئے اس کے اعصاب اسے برداشت نہ
کر سکے اور اس کا ذہن بھی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

دوسری بار ہوش آنے پر محسوس ہوا جیسے وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہی ہے۔ انجن کی تیز
آواز کان کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

اس نے اٹھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئی کیونکہ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور
”ہائیں کروٹ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی اور ساتھ ہی محسوس ہوا کہ
”میں حلق تک کپڑا ٹھونس دیا گیا ہے۔ اب تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے
تھوڑی سی دیر میں جان نکل جائے گی۔ پھر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنا دھیان بٹاتی

”ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے۔“

”کچھ بھی نہیں! کچھ ہی دیر پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“

”کیوں کیا یہ صحیح ہے۔“ اس نے سارہ سے پوچھا۔

سارہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”چلو اٹھو..... تم دونوں۔“ اس نے حمید کے شانے پر مزید دباؤ ڈال کر کہا۔

”نکلت لے کر آئے ہیں جی..... یہ دیکھو۔“ اس نے اپنے کوٹ کی جیب

رہے..... لیکن یہ ہوا کیا؟ وہ دونوں کون تھے اور کیا چاہتے تھے۔ اس بچارے کا پتہ
حشر ہوا ہو۔ کیا یہ لوگ قلندر کے دشمن ہیں؟ اور اس دشمنی کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن
کیوں پکڑا گیا ہے۔ یہ لوگ اس سے کیا برتاؤ کریں گے؟

ذہن سوچنے کے قابل ہوا تو گھگھکی بندھ گئی۔ نرمی طرح رعبہ پڑ گیا تھا سارے
میں۔ انجن کی تیز آواز ذہن پر ہتھوڑے چلاتی رہی۔ خدا خدا کر کے گاڑی رکی اور کسی
اسے اٹھایا..... کھلی فضا کی خشکی اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔ لیکن آنکھیں کچھ
دیکھ سکیں کیونکہ باہر بھی اندھیرا ہی تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے خود کو ایک عمارت میں پایا۔ یہ کافی کشادہ کمرہ تھا اور سیٹے
گیا تھا۔ ایک آدمی نے اس کے حلق سے کپڑا نکالا۔ پھر اسے ایک آرام کرسی میں ڈال دیا
کچھ دیر بعد کمرے میں اس آدمی کے علاوہ اور کوئی نہیں رہ گیا تھا اور وہ خاموشی سے
گھورے جا رہا تھا۔ لیکن یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔

یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جنہوں نے ہوٹل میں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ سارہ کے
میں کانٹے پڑ گئے تھے اور کنپٹیاں سنسنار ہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا جا رہا تھا۔
وہ آدمی میز کی طرف بڑھا جس پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاس میں
انڈیلا اور خاموشی سے سارہ کی طرف بڑھا دیا۔ گلاس لیتے وقت سارہ کا ہاتھ نرمی طرح
رہا تھا۔ گلاس پر گرفت مضبوط ہونے کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھی جیسے گلاس ہاتھ
پھسلا جا رہا ہو۔

بدقت تمام اس نے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور گلاس ہاتھ میں لئے سر
ہٹھی رہی۔ اس آدمی نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔
ہو رہی ہے..... آپ اسے پی کر سکون محسوس کریں گی۔“

لہجے کی نرمی نے سارہ کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ دراز قد اور جسم آدنی
جبرے بھاری تھے اور بائیں جبرے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔
”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس آدمی نے اسے اپنی جانب منہ
کہا۔ ”آپ نرمے آدمیوں میں نہیں ہیں۔“

”لیکن..... لیکن.....!“ سارہ ہلکائی۔
”ہاں..... ہاں..... کہئے..... ڈریئے نہیں۔ یہاں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“
”مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟“

”میں بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ پہلے کافی پی لیجئے۔ اس طرح آپ سکون سے گفتگو بھی
سارہ کچھ نہ بولی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں آ پھنسی ہے۔ تھوڑی دیر بعد
ایک بوڑھی عورت کافی کی ٹرے لائی۔ دراز قد آدمی نے اس سے ایک پیالی بنانے کو کہا اور خود
دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز سے بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات
یہ نہ ہو۔ سارہ ایک معزز مہمان کی حیثیت سے یہاں آئی ہو اور اب وہ اس کی مدارات کر رہا
ہو۔ کافی پی کر اس نے سچ مچ کافی سکون محسوس کیا اور اب وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھی
کہ وہ پراسرار آدمی اس سے کیا چاہتا ہے۔

”میں آپ کو زیادہ دیر الجھن میں نہیں رکھنا چاہتا۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”آپ کب سے
قلندر کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔“
”چھ ماہ سے۔“
”کیا کرتی ہیں.....!“
”اپنے ناولوں کے مسودے ڈکٹیٹ کرتا ہے۔“
”ہوں.....!“ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔

میں یہ پوچھ رہی تھی کہ مجھے اس طرح یہاں لانے کا مقصد کیا ہے۔
”میں نے اس طرح نہیں لانا چاہا تھا۔ میرے آدمیوں سے غلطی ہوئی۔ انہوں نے
خت بدتمیزی سے کام لیا۔ انہیں اس کی سزا مل رہی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو میرے ساتھ
آئیے۔ دکھاؤں آپ کو۔“ وہ اٹھ گیا۔ سارہ بھی غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی اور اُس کے
ساتھ چلنے لگی..... وہ دوسرے کمرے میں آئے اور سارہ نے ان دونوں کو چھت سے الٹا لٹکا
دیکھا جنہوں نے ہوٹل میں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ قریب ہی ایک آدمی ہنر لئے کھڑا تھا۔
”انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی.....“ سارہ کے ساتھ والے آدمی نے کہا اور وہ

”میں تیار ہوں..... کسی سے بھی تذکرہ نہیں کروں گی۔“
 ”یوں نہیں..... ٹھہریئے.....!“ اس نے کہا اور میز کی دراز کھول کر ایک چھوٹا سا

قوی پرچم نکالا اور اسے ساڑھ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”اسے ہاتھ میں لے کر رازداری کی قسم کھا جائے۔“

ساڑھ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر پرچم ہاتھ میں لے کر رازداری کا حلف اٹھایا۔
 ”اچھا تو سنئے..... میں سیکرٹ سروس کا چیف ہوں..... قلندر کے سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں لیکن بعض دشواریوں کی بناء پر اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہمارے لئے قریب قریب ناممکن ہوتا جا رہا ہے..... لہذا اب آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“
 ”مم..... میں..... بھلا میں کیا کر سکوں گی۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے آپ کہہ رہی تھیں کہ وطن کے لئے جان بھی دے سکتی ہیں۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن اس سلسلے میں کیا کر سکوں گی۔“
 ”قلندر کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کیجئے اور اس کی مصروفیات سے ہمیں باخبر رکھئے ورنہ اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا تو یہ ایک بہت بڑا قومی نقصان ہو گا۔“
 ساڑھ کافی دیر تک اس مسئلے پر غور کرتی رہی پھر اس نے ہامی بھری اور کہا۔ ”اب میں سمجھی کہ وہ اپنے یہاں کیپٹن حمید کی آمد کیوں پسند نہیں کرتا تھا؟“
 ”اس کا کیا قصہ ہے؟“ وہ چونک پڑا۔

ساڑھ نے قد آور اور جسیم آدمی کی گمشدگی کی کہانی دہرائی جسے وہ غور سے سنتا رہا پھر بولا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ محکمہ سراغ رسانی والے بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ لیکن دیکھئے آپ اس معاملے کا تذکرہ کیپٹن حمید یا اس کے چیف کرنل فریدی سے نہ کیجئے گا۔ ہمارے ہنگے الگ الگ ہیں۔ خصوصیت سے ہم سیکرٹ سروس والے کسی پر بھی اپنی شخصیت ظاہر نہیں کر سکتے۔“

”جی ہاں..... میں جانتی ہوں۔ میں نے اس کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔“
 پھر وہ ساڑھ کو بتانے لگا کہ وہ کس طرح اس سے رابطہ قائم رکھ سکے گی اور وہ کس طرح وقتاً فوقتاً اس سے ملتا رہے گا۔

دونوں گڑگڑانے لگے۔ لیکن وہ انہیں کوئی جواب دیئے بغیر دروازے کی طرف مڑ گیا۔
 ساڑھ بھی اس کے ساتھ ہی پہلے والے کمرے میں آئی۔

”بیٹھے۔“ اس نے آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان بد بخوں گیا تھا کہ آپ سے قلندر کے متعلق معلومات حاصل کریں اور اگر کسی طرح ممکن ہو تو آپ تک لائیں..... لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اس طرح لائیں جیسے لائے ہیں۔“
 ”آخر آپ چاہتے کیا ہیں..... قلندر صاحب کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”پہلے آپ مجھے بتائیے کیا آپ کو اپنے وطن سے محبت ہے۔“
 ”ہے کیوں نہیں؟“
 ”تو پھر آپ وطن کے لئے کیا کر سکتی ہیں۔“

”جان تک دے سکتی ہوں.....!“ ساڑھ نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا۔
 ”مجھے یہی توقع تھی..... میں آپ کے چہرے پر دیانتداری کا نور دیکھ رہا ہوں۔ ایسی ہی محبت وطن معلوم ہوتی ہیں کہ وطن کے لئے سب کچھ قربان کر دیں۔“
 وہ خاموش ہو گیا اور ساڑھ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔
 ”کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غریبا۔“ قلندر غدار ہے..... وطن فروش ہے!“
 ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ساڑھ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی۔
 ”میں غلط نہیں کہہ رہا اچھی لڑکی.....!“ اب اس کا لہجہ پھر پہلے ہی کی طرح نرم نہ
 ”مجھے حیرت ہے۔“

”غدار اپنے گلے میں تختیاں نہیں لٹکائے پھرتے۔ وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق بھی نہ جاسکے..... وہ ایک غیر ملک کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔“
 ”میرے خدا.....!“ ساڑھ اچھل پڑی۔
 ”جی ہاں.....!“

”تنت..... تو..... آپ کون ہیں؟“
 ”میں..... اپنے متعلق کیا بتاؤں..... اچھا بتاؤں گا..... لیکن آپ کو اسے پڑے گا۔“

نصوبت سے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

وہ سارہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ روشنی ہو جانے پر وہ اس پاس نہیں دکھائی دی تھی۔ یہاں ڈاننگ ہال میں بیٹھ کر بھی اس نے اسے ریکریشن ہال سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے اپنے کمرے میں چلی گئی ہو۔

کانی پی کر وہ پھر اٹھا اور دوبارہ ٹکٹ لے کر ٹھہلا ہوا ریکریشن ہال میں آیا۔

یہاں پولیس آگئی تھی۔ ایک طرف پوچھ گچھ ہو رہی تھی اور دوسری طرف فلور شو جاری تھا۔ سارہ کہیں نہ دکھائی دی۔ اس نے سوچا کاؤنٹر پر کمرے کا نمبر معلوم کرنا چاہئے۔ لہذا قہری دروازوں کا پھر ڈاننگ ہال میں آگیا۔

کاؤنٹر کلرک سے پوچھا کیا آپ مجھے فلنڈر بیابانی صاحب کے کمرے کا نمبر بتا سکیں گے۔ ایک آدمی جو اس کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا کاؤنٹر کلرک بولنے سے پہلے بول پڑا۔ ”چلے“ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

حمید نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ دبلا پتلا اور متوسط قد والا آدمی تھا۔..... شخصیت ایسی تھی کہ پہلی نظر پڑنے کے بعد دوسری غیر ضروری ہوتی۔ ”چلے.....!“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”ہو زینے طے کر کے دوسری منزل پر آئے اور حمید کا ساتھی پہلی راہداری میں مڑ گیا۔ وہ آگے تھا حمید اس سے شائد دو یا تین قدم پیچھے رہا ہو گا۔“

دفعتاً وہ مڑا اور رک گیا۔..... حمید نے اس کے ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کاربو اور دیکھا۔

اس کا بایاں ہاتھ ایک کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

گویا اسے اشارے سے اندر جانے کو کہا جا رہا تھا۔

حمید نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے اور چپ چاپ دروازے میں مڑ گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ ریوالور والے نے اس سے کہا۔ ”دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ..... تمہارا منہ دیوار کی طرف ہونا چاہئے۔“

”بڑی منحوس رات ہے۔“ حمید نے بڑبڑاتے ہوئے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔

واپسی

اندھیرا ہو جانے کے بعد حمید مختلف قسم کی چیخیں سنتا رہا کئی لوگ دوڑتے ہوئے اس سے ٹکرائے تھے لہذا فوری طور پر اسی میں عافیت نظر آئی کہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جائے۔ ”خبردار..... خبردار“ کی صداؤں سے ہال گونج رہا تھا۔ کئی نسوانی چیخیں بھی اس نے سنی تھیں۔ دفعتاً مائیکروفون پر کسی نے کہا۔ ”دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ فیوز باندھا جا رہا ہے..... آپ لوگ جہاں ہیں وہیں ٹھہریں۔“

حمید نے سوچا یہ تو بہت بُرا ہوا۔ ہو سکتا ہے لوگوں نے اسے ان دونوں پر گھونے ”برساتے دیکھ لیا ہو اور روشنی ہونے پر اسے پہچان بھی لیں لہذا وہ بڑی زحمت میں پڑ جائے گا۔ پھر کیا کرنا چاہئے۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا سوچتا رہا۔ اتنے میں روشنی ہو گئی۔ لیکن اس کی طرف کون دھیان دیتا۔ لوگ تو ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے تھے جنہوں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر وہاں دوسری بیہودگیاں شروع کر دی تھیں۔ حمید نہایت اطمینان سے ڈاننگ ہال میں چلا آیا۔

کئی میزیں خالی تھیں..... ایک پر نہ صرف جم گیا بلکہ بیٹھتے ہی اس انداز میں کافی طلب کی جیسے اس دوران میں محض ہلکی پھلکی تقریحات میں وقت گزارا ہو۔

کچھ لوگ چاروں طرف پوچھ گچھ کرتے رہے تھے! حمید نے نہایت اطمینان سے بیٹھ کر وہ اسپرنگ ٹکالے جنہیں ناک کے نتھوں کے اندر دفن کر لینے سے ناک کی نوک اوپر اٹھ جاتی تھی..... اور اوپری ہونٹ بھی اس طرح سکڑ جاتا تھا کہ دانت نظر آنے لگتے تھے۔ چھان بین کرنے والے کئی لوگ اس کے قریب سے بھی گزرے لیکن کسی نے بھی

وہ اس کی پشت سے ریوالتور کی نال لگائے ہوئے اس کی جامہ تلاشی لیتا رہا۔ پھر
کر بولا۔ ”میری طرف مڑو۔“

”کیا قصہ ہے..... میں نہیں سمجھ سکتا۔“ حمید غصیلے لہجے میں کہتا ہوا مڑا۔
”تم کون ہو.....!“ ریوالتور والے نے پوچھا۔

”عبدالودود.....!“

”قلندر سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔“

”میرے خدا..... تو کیا کسی ایسے مصنف سے جو جاسوسی ناول لکھتا ہو ان مرا

گذرے بغیر ملاقات نہیں ہو سکتی۔“

”مگر کیوں ملنا چاہتے تھے؟“

”یار بس کیا بتاؤں..... شامت ہی سمجھ لو..... تصویر دیکھ رکھی تھی پچھلا

ڈاننگ ہال میں ملنا چاہا لیکن وہ حضرت کہیں چلے گئے۔ جس لڑکی کے ساتھ تھے وہ پرا

سکریٹری نکلی..... کچھ دیر اس سے بھی باتیں رہیں اس نے وعدہ کیا کہ کل ملو اے گی

اسے ریکریشن ہال میں لے گیا۔ وہاں دو آدمیوں نے ریوالتور کی نالیں چبھا کر قلندر

پتہ پوچھا۔ سیکریٹری نے لاعلمی ظاہر کی..... وہ زبردستی پر آمادہ ہوئے میں لڑ گیا۔ ان

اندھیرا ہی ہو گیا۔ پھر جو روشنی ہوئی تو وہ محترمہ غائب تھیں۔ میں نے سمجھا شاید اچ

میں چلی گئی ہوں۔ کمرے کا نمبر معلوم کر رہا تھا کہ تم ٹپک پڑے اور اب تم بھی ریوالتور

رہے ہو۔ آخر قصہ کیا ہے؟“

”قصہ میں تم سے پوچھ رہا ہوں دوست! مگر تم تو نہیں تھے اس کے ساتھ ریکریشن

میں۔“

”میں ہی تھا۔“

”ہرگز نہیں۔“

”تم آخر ہو کون! اور تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کر

میں اس ہوٹل کا خانگی سراغ رساں ہوں..... سمجھے۔“

”اوہ.....!“

”لو کی تمہارے ساتھ ہرگز نہیں تھی..... لیکن جھگڑا اسی کی میز سے شروع ہوا تھا۔“

”جہنم میں گئی لڑکی۔ میں پوچھ رہا تھا تمہیں مجھے یہاں اس طرح لانے کی جرأت کیسے ہوئی۔“

”ہوٹل کے نظم و نسق کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔“

”لیکن اس طرح کسی شریف شہری کو ریوالتور دکھا کر.....!“

”لو کی کہاں ہے؟“ خانگی سراغ رساں غریبا۔

”میں کیا جانوں۔“

”میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”یار کیوں خواہ مخواہ دھمکا رہے ہو..... خدا ارادے کرنا..... نہیں تو بڑی بدنامی ہوگی۔“

میرے ہونے والے خسر کی دوکان یہاں سے قریب ہی ہے۔“

”مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے میں تم سے لڑکی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“

”بہت اچھی ہے..... تبھی تو میں کہتا ہوں کہیں میرے ہونے والے خسر کونہ علم

ہو جائے۔“

”کیا تم سیدھی طرح گفتگو نہیں کرو گے۔“

”میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا کہ مجھے کس طرح گفتگو کرنی چاہئے۔ ویسے ان دونوں

ملہ آدمیوں میں سے ایک بہ آسانی پہچانا جاسکے گا۔“

”وہ کیسے.....؟“

”جھگڑے کے دوران میں اس کا پرس جیب سے نکل کر گر گیا تھا جس میں اُس کی تصویر

موجود ہے۔“

”کہاں ہے..... لاؤ نکالو.....!“

حمید نے کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنا پرس نکالا..... وہ جانتا تھا کہ اُس کی جامہ تلاشی

لے جا چکی ہے اس لئے خانگی سراغ رساں غیر مطمئن نہ ہو گا۔ یہی ہوا بھی۔ اس نے پرس فرش

پاؤں دینے کے لئے کہنے کی بجائے آگے بڑھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا..... حمید کا بالیاں

ہاتھ پرس سمیت آگے بڑھا اور ساتھ ہی دایاں بھی پوری قوت سے اس کی کپٹی پر پڑا اور وہ

کسی قسم کی آواز نکالنے بغیر چکر کر ڈھیر ہو گیا۔

پھر حمید یہ دیکھے بغیر کہ فرش پر گرنے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا ہے۔ ”ٹھیک ہے..... اچھی بات ہے۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”لیکن آپ اسے اس کے بارے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں راہ داری طے کرتا ہوا زینوں کی طرف جا رہا تھا۔ تاکہ ایک مخصوص عہدے دار کے علاوہ اور کسی کو بھی نہ ہونا چاہئے۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔“

ڈانٹنگ ہال سے بھی گذر گیا اور اب وہ سڑک پر تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے وقت اس نے سوچا اب شاید ہی اس میک اپ میں یہاں آ سکے۔ میں اسپرنگ موجود نہ ہوتے تو خانگی سراغ رساں نے اسے پہچان ہی لیا ہوتا کہ ساتھ وہی تھا۔

”ہوٹل مونا کر.....!“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔

قلندر کی شخصیت اچانک بہت زیادہ پراسرار ہو گئی تھی۔ وہ لوگ کون تھے اور انہ

اتنے جارحانہ انداز میں اس کے متعلق کیوں پوچھا تھا اور پھر سائرہ کہاں غائب تھی؟..... کیا وہ اسے اٹھالے گئے تھے؟

وہ سوچتا اور پاپ میں تمباکو بھرتا رہا۔ فریدی کی اس ہدایت پر اس نے عمل نہیں کیا۔ وہ سوچ رہی تھی پتہ نہیں اس بیوقوف سے آدمی کا کیا حشر ہوا ہو جو مونٹی کارلو کے ریکریشن ہال میں اس کے ساتھ تھا..... ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اس نے اُسے ضرور تلاش کیا ہوگا۔

قدموں کی آہٹ پر وہ چونک پڑی۔ وہ آدمی واپس آیا تھا۔ اس نے براؤن رنگ کا ایک ہاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اُسے رکھ لیجئے..... ہماری طرف سے تحفہ ہے؟“

”اس میں کیا ہے؟“ سائرہ نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

”دو ہزار کی حقیر رقم.....!“

”ہرگز نہیں جناب..... میں جو کچھ بھی کروں گی ملک و قوم کے لئے ہوگا۔ اس کا معاوضہ لینا ہرگز پسند نہ کروں گی۔“

”یہ معاوضہ نہیں ہے.....“ بے حد نرم لہجے میں کہا گیا۔

”کچھ بھی ہو..... یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ نے پھر اس کا نام لیا تو میں آپ کے لئے کچھ بھی نہ کر سکوں گی۔“

سائرہ اب اس پروکار اجنبی سے بالکل خوفزدہ نہیں تھی۔

اس نے اسے ہدایت دی تھیں کہ کس طرح اس سے رابطہ قائم رکھ سکے گی۔

خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

سائرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کہنا چاہئے۔ دفعتاً یونہی بول پڑی۔

”کیپٹن حمید سے میری اچھی خاصی ملاقات ہے۔“

”واقعی.....!“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”آپ بہت اونچی ہیں..... قوم آپ مجھے پور کرنے سے کیا فائدہ..... تم لوگ خود سوچو کہ اس اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں ایسا واقعہ بھی فخر کرے کم ہے۔ میں اپنی اس حرکت پر تادم ہوں..... خدا را اسے بھول جائیے! بی بی کیوں آیا۔“

”کوئی بات نہیں.....!“ سارہ ہنس پڑی۔

”خفا ہونے کی ضرورت نہیں محترمہ۔“ خانگی سراغ رساں بولا۔ ”ہم صرف یہ معلوم

”اچھا آئیے میرے ساتھ.....!“ وہ دروازے کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔

”میں کیا جانوں! میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”بھلا کیوں ہوا تھا۔“

”مجھ سے میرے باس کے متعلق پوچھ رہے تھے۔“

”مگر یہ تو ایسی بات نہیں جس پر چنگامہ ہو جائے۔“

”وہ ایک طویل اور عریض راہداری میں آئے۔ یہاں ایک وین کھڑی تھی جس پر دروازہ کھول کر اس نے اسے اندر بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بیٹھ جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ وین چل پڑی..... اُس کی کھڑکیاں بھی بند تھیں اور اندر ایک دھندلا روشن تھا۔“

سارہ سوچ رہی تھی واقعی بہت محتاط لوگ ہیں۔ اگر اب وہ کوشش بھی کرے تو یہ نہیں بتا سکے گی کہ کس عمارت میں اُسے لے جایا گیا تھا۔ وین عمارت کے اندر دینی سے روانہ ہوئی تھی..... اور اس کا قطعی امکان نہیں تھا کہ وہ باہر سے عمارت بھی سکتی۔

اُس وین کی بناوٹ بھی عام گاڑیوں سے مختلف تھی۔

اُس کے اندازے کے مطابق وین آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں رکی تھی۔ پچھلا کھول کر کسی نے بڑے ادب سے کہا تھا۔ ”نیچے اتر آئیے۔“

وہ اتری اور دروازہ کھولنے والے نے کہا۔ ”ہم ہوٹل موٹی کار لو کی پشت پر ہیں۔“

جانب والی گلی سے گذر کر آپ عمارت کے سامنے مین روڈ پر پہنچیں گی..... اب ہمیں اب

”بیس کی واپسی کب تک ہوگی۔“ پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے کہا اور تیز رفتاری سے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا کمرہ قلندر کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ اس کے روشندان بھی تاریک ہی تھے۔ قلندر غالباً ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

اس نے اپنا کمرہ کھولا..... اندر داخل ہو کر سوچ آں کیا..... اور دروازہ بند کر کے زمین خاموش کھڑی رہی۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا..... بڑی الجھن محسوس کر رہی تھی۔

شام سے اب تک کتنی غیر متوقع چیزیں سامنے آئی تھیں۔

سڑک پر پہنچ کر ہوٹل کے صدر دروازے کا رخ کیا۔

اندر کئی الجھنیں منتظر تھیں۔ سب سے پہلے خانگی سراغ رساں نکریا۔ اس سے پوچھا

ہوتی رہی اور پھر سراغ رساں نے پولیس انسپکٹر کو بھی بلوایا۔

”یہ کیا مصیبت ہے۔“ سارہ جھنجھلا کر بولی۔ ”یہ ہوٹل ہے یا بد معاشوں کا کھانا

اس نے طویل سانس لی اور الماری سے شبِ خوابی کا لباس نکالنے لگی۔
اُسے یقین تھا کہ اب وہ لوگ قلندر کی واپسی سے قبل اسے بور کرنے کی ہزار
کریں گے۔ لباس تبدیل کر کے وہ لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو بور ہوتی رہی تھی پھر
غنودگی نے بلہ بول دیا تھا۔
اسے احساس تھا کہ وہ سو نہیں رہی لیکن پھر بھی وہ بیداری کی کیفیت بھی نہیں
دفعۃً ذہن کو جھٹکا لگا اور آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا
بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھنے کی کوشش کی کہ دستک دینے
ہے..... لیکن آواز نہ نکلی۔
دستک جاری رہی۔ بلا آخر وہ اٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر حلق
دیا اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بدقت پوچھ سکی ”کون ہے؟“
”دروازہ کھولو.....!“ باہر سے قلندر کی آواز آئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چنٹی کر
قلندر دروازہ کھول کر اندر آیا۔
وہ اسے گھورتا رہا اور سارہ خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر چونکی اور
کر تو یہ اٹھا۔ اسے شانوں کے گرد لپٹتی ہوئی مسمری کی طرف مڑ گئی۔
”کیا قصہ تھا.....؟“ آخر کار قلندر نے سر دلچے میں پوچھا۔
”میں صبح واپس جا رہی ہوں..... ملازمت گئی جہنم میں۔“ سارہ نے تلخ لہجے میں
شائد پہلی بار اس انداز میں قلندر سے گفتگو کر رہی تھی۔
”بتاؤ بھی تو کیا بات تھی؟“
”میں نہیں جانتی تھی کہ کچھ ایسے دشمن بھی آپ نے پال رکھے ہیں۔“
”کیسے دشمن.....!“
”وہ جو ریوالور دکھا کر دوسروں سے آپ کا پتہ پوچھتے پھریں۔“
”یہ میرے لئے ایک حیرت انگیز اطلاع ہے۔ تفصیل سے بتاؤ۔“
سارہ نے سنبھالا لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اب
سے اُس آدمی کے متعلق بھی بتانا پڑے جس نے خود کو سیکرٹ سروس کا سربراہ ظاہر کیا

پھر سوچا اس آدمی کے متعلق تو قلندر کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا جس کے ساتھ وہ
ریکریشن ہال میں گئی تھی لہذا اس کے متعلق کچھ چھپانا فضول ہی ہوگا۔
”تم خاموش کیوں ہو۔“ قلندر نے جھنجھلا کر کہا۔
”کہانی آپ کے ایک فنن سے شروع ہوتی ہے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد اس نے
مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ وہی مشہور مصنف ہیں نا جس کے ناول وہ بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔
اس نے بتایا کہ وہ آپ کی تصویر پہلے کہیں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کے اندازے کی تائید کی۔“
”نکواس ہے! میری تصویر آج تک شائع نہیں ہوئی۔“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔
”ہاں تو پھر.....؟“
سارہ نے اُسے بتایا کہ کس طرح اُس نے اُسے ریکریشن ہال میں چلنے کی دعوت دی اور
وہاں کس طرح دو اجنبیوں سے جھگڑا ہوا جو اس کا پتہ پوچھ رہے تھے..... پھر یہ کہانی اس طرح
نہم ہوئی کہ ہال میں اندھیرا ہو جانے کے بعد وہ بے تحاشہ باہر کی طرف بھاگی۔ اندھیرے میں
ٹوکریں کھاتی اور اندازے سے چلتی ہوئی ڈانگ ہال سے بھی گذر کر سڑک پر آگئی تھی.....
پھر بدحواسی میں جدھر منہ اٹھا چل پڑی..... پتہ نہیں کتنی دور پیدل چلنے کے بعد ایک کیفے میں
جانچھی تھی..... کیفے میں تقریباً ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد جب وہ دوبارہ سڑک پر آئی تھی تو
اُسے سمت کا اندازہ بھی نہیں تھا، مجبوراً ایک ٹیکسی میں بیٹھی اور ڈرائیور کو مونٹی کارلو کا پتہ بتا
کر اس طرح دوبارہ یہاں تک پہنچی۔
سارہ کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس بدحواسی کے عالم میں بھی اس نے کتنی
فصاحت سے کہانی کو دوسری ڈگر پر لگا دیا تھا۔
”پھر وہ تینوں آدمی تمہیں دوبارہ بھی یہاں دکھائی دیے تھے۔“ قلندر نے پر تھکر لہجے
میں پوچھا۔
”نیکل پھر وہ نہیں دکھائی دیے۔“
”مجھے حیرت ہے..... مجھے حیرت ہے۔“ قلندر بڑبڑاتا ہوا مسمری کے ایک گوشے پر
مک گیا۔
”کس بات پر حیرت ہے۔“

”اسی پر کہ ہمارے ملک کے پبلشرز ایسی چھچھوری حرکتیں بھی کر سکتے ہیں۔“
”پبلشرز.....!“ سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”پھر اور کون میرا دشمن ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اب میری کتابیں مار کر آئیں..... انہیں بڑا خسارہ ہو رہا ہے۔ میرے علاوہ لوگ اور کسی کو پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ سائرہ دل ہی دل میں ہنسی۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔

”لیکن..... میں انہیں دیکھ لوں گا۔“ قلندر منٹھیاں بھیجنے کر غصیلے لہجے میں بولا۔
”میں تو ایسے حالات میں یہاں نہیں رک سکتی۔“

”تم پاگل ہو..... فکر نہ کرو۔“

”یہی حالات رہے تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ میں کہتی ہوں اگر اس دھینگا مٹتی ہے، میں ریوالور چل جاتے تو کیا ہوتا۔“

”ریوالور.....!“ وہ حقارت سے ہنسا۔ ”محض دھمکی! تم کہتی ہو کہ ریوالور ان کی ہڈیوں میں تھے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے ان کی نالیں تمہارے چبھورے تھے..... کیا؟ وہ فائنٹین پن رہے ہوں..... شش شش..... لا حول و لا قوۃ..... اچھا اب سو جاؤ..... کی دبا پھلائی تھی۔ دیکھو ہماری طرف دیکھو ضرور..... ہم صرف چہرہ ہی تو نہیں ہیں..... دیکھو گا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے چلا گیا۔

پھر لڑکی

دوسری صبح خوشگوار تھی۔ حیدر سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ ضروری سے فارغ ہو کر ناشتے کے لئے فون کیا۔ کچھلی رات موٹی کارلو سے واپس آنے نے فریدی سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔ زیادہ رات گزر چکی تھی اس لئے سیونٹھ آئی بلندہ

لے نور آئی لائن کلیر مل گئی تھی..... کال ایک ڈرگ سٹور سے کی تھی اور خاص خاص باتیں کوڈرڈز میں ہوئی تھیں۔ پوری رپورٹ سننے کے بعد فریدی نے کہا تھا کہ دوسری ہدایات ملنے تک وہ اس معاملے سے کوئی سروکار نہ رکھے۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ دن کس طرح گزرا جائے۔ نومی چار بڑی دلچسپ جگہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں تفریحاً آنے والے محض یہاں آکر روپیہ اڑانے کے لئے کماتے ہوں۔ کاسینوز میں اعلیٰ پیمانے پر جوا ہوتا تھا..... راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔

سروں پر بالوں کے منارے بنانے والی لڑکیاں چست لباسوں میں تھرکتی پھرتیں۔

سٹریٹ اور شیرمی پتی ہوئی اس طرح چکارتیں جیسے بحری پرندے اپنے شکار کا گوشت نوچتے

وقت لڑتی ہوئی آواز میں سیٹیاں سی بجاتے ہیں۔ حیدر ان کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ چلتی ہوئی

بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا..... بس کسی ایک کے پیچھے ہو لیتا

اور کر کے نیچے کی ہر تھرکن پر قربان ہوتا رہتا..... چہرے دیکھ کر کیا کرتا۔ وہ اگر ڈھنگ کے

ہوتے تو چست لباسوں کی وبا ہی کیوں پھیلتی۔ اسی احساس کمتری نے تو اس گھٹیا قسم کی خود نمائی

کی دبا پھلائی تھی۔ دیکھو ہماری طرف دیکھو ضرور..... ہم صرف چہرہ ہی تو نہیں ہیں.....

چروں کا کیا..... وہ تو کچھ دنوں پہلے برقعوں میں چھپے رہتے تھے..... اب ہم نے اچانک

برقعے اتار چھینے ہیں تو کیا اس بناء پر ہماری طرف نہیں دیکھو گے کہ ہمارے چہرے پر کش

نہیں ہیں..... تمہیں دیکھنا پڑے گا..... برقعے اس لئے تو نہیں اتارے کہ تم نظریں نیچی کئے

ہوئے ہمارے قریب سے گزر جاؤ..... چروں میں کیا رکھا ہے..... یہ دیکھو۔

وہ سوچتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں گدگدی سی ہوتی رہی۔ ریڑھ کی ہڈی میں

گدگدی کیوں نہ ہوتی۔ وہ کوئی مبلغ اخلاق تو تھا نہیں کہ ایسی باتوں پر اس کا خون کھولنے لگتا۔

لیکن اتنا تو وہ بھی سوچتا تھا کہ اس گھٹیا قسم کی نقابی کا کیا حشر ہوگا۔ یہ غیر متوازن آزاد

روئی کہاں لے جائے گی..... اچانک یہ چگاڑا اندھیرے سے اجالے میں نکل آئی

تھا..... ایک بیک اتنی روشنی..... اب..... اب کدھر جائیں کیا کریں؟

وہ چونک پڑا۔ غالباً ویر نے دستک دی تھی۔
”آ جاؤ.....!“ حیدر نے بلند آواز میں کہا اور ایک ویٹر ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے

کمرے میں داخل ہوا۔

کر رہا تھا۔ اسی آدمی کی وساطت سے ایک ایسے ٹیلی گرافک انڈریس کا پتہ چلا جس پر آئے
ہوئے تار رسی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی اس پتے پر نئے تار آتے
ہوتے تھے۔ اب صرف یہ رہتے تھے۔

ہوں۔“ حمید نے کہا۔
کیا قاسم کی کشدگی بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی تھی۔ یا اُس کا ان واقعات سے کوئی تعلق

”بہت بہتر جناب۔“ ویٹر نے مودبانہ کہا۔ ”میں ایک سیٹ واپس لے جاؤں گا۔“ نہیں تھا۔
لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔

”کیا برتن لے کر ہی جاؤ گے۔“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔
پھولوں کا چھوٹا سا گچھا لگا ہوا تھا۔

ویٹر نے جواب دینے کی بجائے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف دیا۔
جس پر سیاہ رنگ کی بلی کی تصویر تھی۔

”اوہ.....!“ حمید سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑ کر رہ گیا۔ یہ فرار کوٹ کے کار پر بھی جمبیلی کے پھول نظر آرہے تھے۔

بلیک فورس کا مخصوص نشان تھا۔
وہ ایک جانب چلنے لگا..... حمید تھوڑے فاصلے سے اُس کا تعاقب کرتا رہا۔..... کچھ دور

”کیا کہنا ہے؟“ اس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
چلے کے بعد وہ ایک کیفے میں داخل ہوا۔ حمید نے دیکھا کہ اب پھولوں کا گچھا اس کے کار پر

”اطلاع ملی ہے کہ آج پھر ہنی مون کے پتے پر ایک تار آئے گا۔ ہمارا ایک آدمی دیکھ رہا ہے۔ حمید بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کیفے میں داخل ہوا۔ وہ آدمی ایک کیمین میں بیٹھ رہا

کہ اُسے کسی طرح کار آمد بنایا جاتا ہے..... ٹھیک نوبے آپ کو تار گھر کے آس پاس ملے گا..... حمید نے بھی اسی کیمین کا پردہ ہٹایا اور ویٹر کو چائے کا آرڈر دیتا ہوا اسی کے سامنے والی

رہنا چاہئے۔ کوٹ کے کار میں جمبیلی کے پھولوں کا چھوٹا سا خوشہ لگا لیجئے گا۔“
کری پر بیٹھ گیا۔

”اچھا.....!“
اس آدمی نے اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور حمید کے سامنے ڈال دیا اور پھر

فریدی کی طرف سے خاص طور پر حمید کو پہلے ہی ہدایت مل چکی تھی کہ بلیک فورس۔ کچھ کے بغیر اٹھ کر دوسرے کیمین میں جا بیٹھا۔
اب حمید تنہا رہ گیا تھا۔ اُس نے کاغذ کی تہہ کھول کر اُسے میز پر پھیلا دیا اور پڑھنے لگا۔

کچھ.....؟“ پر اکتفا کی۔
پیغام نمبر ۱ ”وہ کہیں چلا گیا ہے..... اس بار مجھ سے غفلت ہوئی..... موبی۔“

یہ تار سیونٹھ آئی لینڈ سے آیا تھا۔ اس کے بعد ہی دوسرا پیغام تھا۔
”جمیل پر نظر رکھی جائے..... اجمل فشریز.....!“

یہ پیغام سونا سے آیا تھا۔
ان پیغامات کے بعد لکھنے والے کا نوٹ تھا۔

”ٹیلڈیز کاؤنٹر پر بیٹھنے والی لڑکی نے یہ پیغام سادہ کاغذ پر تحریر کر کے اپنے دہشتی بیگ میں

سے بھاگنے والے ہی کی ہو سکتی ہے؟ پھر فریدی کو ایک ایسے آدمی کا علم ہوا جو اس کی

ڈال لئے تھے۔ دوسرا پیغام غیر متوقع طور پر آیا ہے۔ مجھے اس کی اطلاع نہیں تھی۔
 ویٹر چائے لایا۔..... اس نے اس سے بل لانے کو بھی کہا اور جلدی جلدی ایک
 کی..... اب اُسے کاؤنٹر پر بیٹھنے والی لڑکی کی نگرانی کرنی تھی..... لڑکی کو اس نے پھر
 بھی دیکھا تھا۔ کافی اسماٹ اور دلکش تھی۔ تھی تو ایسی ہی لیکن اسکرٹ اور بلاؤز میں
 تھی۔ حمید نے محسوس کیا تھا کہ اپنی رنگت کی مناسبت سے لپ اسٹک کے انتخاب
 رکھتی ہے۔ بھرے بھرے سے سلگتے ہوئے ہونٹ تھے۔

یہ کام دلچسپ ثابت ہو گا۔ حمید نے سوچا۔ لڑکیوں کی نگرانی کر کے اسے بیٹھ
 خوشی ہوتی تھی خواہ وہ اپنے دہنی بیگ میں اعشاریہ دو پانچ کے پستول ہی کیوں نہ رکھتی ہو
 کینے سے نکل کر اس نے پھر تار گھر کی راہ لی اور ٹھیک اس وقت پھانک پر پہنچا جب
 باہر نکل رہی تھی۔

اُس نے سوچا ستارے موافق ہیں۔ خواہ مخواہ جھک نہیں مارتی پڑی۔

لڑکی کچھ دور تو پیدل چلی..... پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ یہاں بھی ستاروں نے
 کا ساتھ دیا ورنہ ضروری نہیں تھا کہ ٹھیک اسی وقت اُسے بھی کوئی ٹیکسی مل ہی جاتی۔
 تعاقب جاری رہا۔ آخر ایک جگہ اگلی ٹیکسی رک گئی۔ لڑکی نے کرایہ ادا کیا اور
 جانب والی دوکانوں میں سے ایک میں داخل ہو گئی۔

حمید نے بھی اپنی ٹیکسی رکوا دی تھی اور ڈرائیور معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔
 حمید کرایہ ادا کرنے لگا تو اس نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ ”صاحب کیا رکھا ہے ان کو
 میں..... شوق ہو تو میرے ساتھ چلیے۔“

”چھہ مہینے سے اس کے چکر میں ہوں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور خود
 اسی دوکان کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن جیسے ہی اس کے سامنے پہنچا پیروں تلے سے زمین نکل
 دوکان کے دو دروازے تھے۔ ایک اس سڑک کی طرف اور دوسرا عمارت کی کٹ
 سڑک پر کھلتا تھا۔ دوکان کے کاؤنٹر پر ایک آدمی نظر آیا اس کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں
 ”چوٹ ہو گئی.....!“ وہ بڑبڑایا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا..... شاید اب وہ اس کی گرد کو بھی نہ پاسکتا۔

طو عا و کر اہاد وکان میں داخل ہوا۔

”فرمائیے جناب۔“ دوکاندار اسٹول سے اٹھتا ہوا بولا۔

”کیا ابھی آئی تھی یہاں۔“ حمید نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔ ورنہ اُسے کیا پتہ کہ وہ کئی
 تھی یا نہ تھا۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ دوکاندار نے چڑچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”اُدھر کا دروازہ کھلا رکھئے کا یہ
 مطلب تو نہیں ہے کہ یہ عام راستہ ہے۔ میں آپ کو تو ہر گز نہ جانے دوں گا۔“

وہ کاؤنٹر پر چڑھ کر نیچے اترا اور حمید کی راہ میں حائل ہو گیا۔

”تم غلط سمجھے..... سائنس بیکٹ کا ایک ڈبہ دینا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔



علائے کے تھانے کا انچارج قلندر بینا بانی سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ
 اس طرح آپ جیسے بڑے مصنف سے ملاقات ہو گئی ورنہ عام آدمیوں کی پہنچ آپ تک کہاں؟“
 قلندر گردن اکڑائے سنتا رہا..... سارہ شدت سے بور ہو رہی تھی کیونکہ پچھلی رات
 ہی قلندر کی عظمتوں کے منارے اس کے ذہن میں منہدم ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ
 اگر اس پولیس انسپکٹر پر اصلیت واضح ہو جائے تو اچانک کیا ہو گا۔

”میں کہتا ہوں آپ صرف اشارہ کر دیجئے پھر میں دیکھ لوں گا۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔
 ”بھئی میں کیا بتاؤں..... میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ دشمن بھی وہی شخص بنا سکتا ہے جو
 دوست بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو..... میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں.....
 کسی سے کسی قسم کا تعلق ہی نہیں رکھتا..... پھر بتائیے میں کیا بتا سکوں گا؟“

”تب تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ یہ سب کچھ محض آپ کی سیکرٹری صاحبہ کیلئے ہوا تھا۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”کیا عرض کروں..... جب سے عصمت فروشی قانونی طور پر ممنوع قرار پائی ہے۔
چکلے اٹھا دیئے گئے ہیں ایسی بد نظمی پھیل رہی ہے..... ایسی بد نظمی پھیل رہی ہے۔
بتاؤں۔“

سائرہ کو غصہ آگیا لیکن کچھ بولی نہیں۔
”ہو سکتا ہے..... یہی بات ہو۔“ قلندر نے لاپرواہی سے کہا۔
اس پر سائرہ کو اور زیادہ تاؤ آیا۔ لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
قلندر نے بھی چپ سادھ لی تھی اس لئے پولیس انسپکٹر اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد سائرہ نے کہا۔
”سخت بد تمیز آدمی معلوم ہوتا ہے۔“
”کیوں بد تمیز کیوں؟“

”بیہودہ باتیں کر رہا تھا۔ اس کا سلیقہ بھی نہیں رکھتا کہ کن لوگوں کی موجودگی میں
قسم کی گفتگو کرنا چاہئے۔“
”ہر ایک کے سامنے ہر قسم کی گفتگو کی جاسکتی ہے۔“ قلندر نے لاپرواہی سے ٹانوں
جنش دی۔

سائرہ نے اسامہ بنا کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”میں تو ایسے حالات میں یہاں نہ
ٹھہر سکتی۔“
”کیسے حالات میں۔“

”ارے..... بچھلی رات.....!“
”اُسے بھول جاؤ..... یقیناً وہ کسی قسم کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔“
”میں کیسے یقین کر لوں۔“

”میں کہہ رہا ہوں۔“ قلندر آنکھیں نکال کر بولا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور سائرہ کا
کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی ہو۔ اس وقت قلندر کی آنکھیں کسی فوڈ
لگ رہی تھیں۔

اس نے سر جھکا لیا..... وہ ڈرپوک نہیں تھی۔ ڈرپوک ہوتی تو بچھلی ہی رات اس

بہن کے دوسرے پڑنے لگتے۔ اُس نے جس کام کے لئے سیکرٹ سروس کے چیف سے ہامی
برلی تھی کسی ڈرپوک لڑکی کے بس کا روگ نہیں تھا۔

بہر حال ڈرپوک نہ ہونے کے باوجود بھی قلندر کے بدلے ہوئے تیور کی تاب نہ
لا سکی۔ وہ ہمیشہ سے اس کی شخصیت میں کوئی عجیب سی چیز محسوس کرتی رہی تھی۔ وہ چیز جو کھل
کر سامنے نہ آتی ہو۔ وہ اُسے کوئی نام بھی نہیں دے سکتی تھی۔

اُسے وہ دہریا یاد آئی جب قلندر نے اپنی پالتو بلی کو بے دردی سے مار ڈالا تھا۔ اُس وقت
اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے قلندر کی شخصیت کا وہ ڈھکا چھپا پہلو کسی قدر واضح ہو گیا ہو۔
اس چویشن کو یاد کر کے وہ کانپ گئی۔ اس وقت بھی اُس کے بدلے ہوئے تیور میں اسی
نیت کی جھلک نظر آئی تھی۔

”سنو.....!“ کچھ دیر بعد قلندر غرایا۔ ”اگر اُس واقعہ کا تعلق میری ذات سے تھا بھی تو
”میں کچھ اور کہہ رہی تھی.....!“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مناسب یہی ہے کہ تم کچھ بھی نہ کہو..... تمہاری واپسی میری تو ہین ہو گی۔“
”تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کون تھے؟“
”قطعاً نہیں..... لیکن میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں اور
اب تم مجھے اُس تیسرے آدمی کے بارے میں دوبارہ بتاؤ جو تمہیں ریکریشن ہال میں لے
گیا تھا۔“

”میں اُس کے بارے میں کیا بتاؤں؟“
”وہ کیا چاہتا تھا۔“

”کہا یہی تھا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“
”اُس کا طبع بیان کرو۔“

”طبع کیا بتاؤں..... جو ان آدمیوں کا جیسے تھا۔“
”کوئی ایسی خاص بات جس کی بناء پر وہ بیچنا جاسکے
”ایسی تو کوئی چیز یاد نہیں آ رہی۔“

”ہاؤز ڈسٹیکٹو کہتا ہے کہ اس کی ناک کی نوک اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ اوپری ہونٹ مجھے رکنا پڑے گا کہ میں بھی دیکھ سکوں کہ وہ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“
 طرح اٹھا ہوا تھا کہ اگلے دانت نظر آتے تھے۔“

”نہیں.....!“ سارہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

قلندر نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں.....؟ کیا تم ایسے کسی آواز.....؟“ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”سچ بتاؤ تم کون ہو۔“

جانتی ہو۔“

”نہیں..... تو۔“ سارہ ہلکائی۔ وہ کیپٹن حمید کے متعلق سوچ رہی تھی جو ایک

اُسے ایسے ہی میک اپ میں ملا تھا۔

”تم اس کے تذکرے پر کسی قدر متحیر نظر آئی تھیں۔“

”نہیں تو.....!“

”اس کے باوجود بھی میں تمہیں نہیں جانتا۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

”خیر میں دیکھوں گا کہ تم کون ہو۔“

اس ساری گفتگو کے دوران میں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہیں

”بہر حال اس نے ہاؤز ڈسٹیکٹو کی کیپٹی پر اتنے زور سے گھونسا مارا تھا کہ وہ بیہوش ہو گئی تھی اور بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔“

”میں کس جہال میں پھنس گئی ہوں.....!“ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

”میں نے بہت بڑے بڑے معسے حل کئے ہیں۔ جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔ اسے بھی

دیکھوں گا..... فکر نہ کرو۔“

”کس بات کی فکر نہ کروں؟“ سارہ نے کہا اور محسوس کیا کہ وہ خواہ مخواہ بکواس کئے

باری ہے۔ کیوں نہیں اس معاملے کو یہیں ختم کر دیتی۔

”اس بات کی فکر نہ کرو کہ کہیں تمہارا راز ظاہر نہ ہو جائے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں

کہ کوئی بات میری ذات سے آگے نہ بڑھے گی۔“

”اگر آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”یقین کرو سارہ..... میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن فی الحال یہ نہیں سمجھ سکا

کہ تم ایسی زندگی کیوں گزار رہی ہو اور عبدالغفور کو اس پر کس طرح آمادہ کیا؟“

”کس بات پر کس طرح آمادہ کیا۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”کہیں میں پاگل

”آخر یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں..... یقین کیجئے وہ آدمی اس طے کا نہیں تھا۔“

ہاؤز ڈسٹیکٹو نے بیان کیا ہے؟“

”تمہارا خیال صحیح ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہاؤز ڈسٹیکٹو بھی یہی

ہے کہ وہ اس آدمی سے مختلف تھا جو تمہاری میز پر دیکھا گیا تھا۔“

”پھر آپ مجھ سے ایسی گفتگو کیوں کر رہے تھے۔“

”جاننا چاہتا تھا کہ کہیں وہ لوگ تم سے تو کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے.....“

پولیس انسپکٹر کا خیال صحیح ہو۔“

”اچھی بات ہے۔“ سارہ جھنجھلا گئی۔ ”پہلے میں واپس جانا چاہتی تھی اب اس بات

نہ ہو جاؤں۔“

قاسم نے میز کے دوپائے مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میز اس کے سر
بلند ہو گئی۔ لڑکیاں چیخیں اور قہقہے لگاتی رہیں..... کچھ دیر وہ اُسے اسی طرح اٹھائے رہا پھر
اس نے کہا۔ ”اچھا اٹھو چلو میرے ساتھ..... ابھی بتائے دیتا ہوں۔ لیکن پھر تم مجھے لیڈی جاوید اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔“ اب بس بھی کرو.....
بھی نہ چھپا سکو گی۔“

منور.....!

”ہاں..... آ بھی..... تو..... مائیں..... دوڑ..... لا گاؤں..... عا.....!“ قاسم

دک رک کر بولا۔

دونوں اوپری منزل پر آئے۔ قلندر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

”بیٹھ جاؤ.....!“ وہ کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں اُس

کیس رکھا ہوا تھا۔
”منور میز رکھ دو.....!“ لیڈی جاوید نے ذرا ڈپٹ کر کہا اور یہ بگڑا ہوا ہاتھی قابو میں

واپسی پر سارہ نے اس کے ہاتھ میں کینٹ سائز کی ایک تصویر دیکھی اور پھر اُسے جیسے وہ ڈپٹ مہاوت کا آنکس ثابت ہوئی ہو۔

تصویر خود اس کے ہاتھوں میں آئی تو وہ بے ساختہ اچھل پڑی۔ تصویر خود اس کی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میز کو نیچے لایا..... اور اس کے چاروں پائے فرش پر ٹک گئے۔ ایسا
پر تاج تھا اور اس نے جو لبادہ اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا وہ یاشاند کبھی خواب میں بھی نہ دیکھنے کے لئے اسے بیٹھنا پڑا تھا اس لئے توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل میز کے نیچے
اُس پر زردوزی کا گھنا کام دور سے بھی واضح تھا..... تصویر فلمی نہیں بلکہ کیرے کی نمونہ چلا گیا ایسا اگر کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ لڑکیوں نے میز سے کود کود کر اُسے اٹھایا۔

”یہ..... یہ.....“ سارہ ہلکائی۔
”اب بتاؤ.....!“ قاسم نے آنکھیں نکال کر لیڈی جاوید سے پوچھا۔ ”تم جھوٹ سمجھتی

تھیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں شہزادی صاحبہ۔“ وہ پر معنی انداز میں مسکرایا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ گزران اسٹیٹ کی شہزادی ہیں..... شہزادی دردناک.....“
”میں سچ پاگل! ہو جاؤں گی۔“ وہ اس طرح بولی جیسے نیند میں بڑبڑا رہی ہو۔
”کتنی ہوں حیرت کے مارے مری جاتی ہوں..... یادداشت کھو بیٹھے سے پہلے تم
اُسے مانتور نہیں تھے۔“

”نہیں پڑ گئی یادداشت..... واداشت..... مجھے بھونکتی ہے۔“

”کوہ..... چلو..... چلو..... ڈائننگ روم میں۔ اب ہم کھانا ہی کھائیں گے.....“

”ہمارے پیاشاند اس وقت باہر کہیں کھائیں گے۔“

”چلو صبح ہے۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”اتنے کسں پیاشاند زہر لگتے ہیں۔“

وہ ڈائننگ روم میں آئے۔ قاسم کے لئے الگ میز لگائی گئی تھی جس پر وہ تنہا نظر آیا۔
چاروں عورتیں دوسری میز پر تھیں۔ غالباً اب یہاں اُس کی خوش خوراک کا مظاہرہ ہونے

قاسم نے ”اُون ہپ“ کا نعرہ لگایا اور بڑی سی میز اوپر اٹھتی چلی گئی جس پر لیڈی جاوید

اپنی ہی جیسی تین لمبی ترنگی لڑکیوں سمیت بیٹھی ہوئی تھی۔
لیکن قاسم کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ذرا سی

شہزادی کی کہانی

دیر میں یہ بھی بھول گیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔

”کیا ہڈیاں بھی نکل لیتے ہیں۔“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

”جی عاں.....“ تبھی تو اتنا دچوڑا ہوں..... عاؤں..... عاؤں..... عاؤں.....

نوالہ چباتا ہوا بولا۔

”بھئی کھالینے دو جین سے۔“ لیڈی جاوید بولی۔

”کیا یادداشت ختم ہو جانے سے پہلے بھی اتنا ہی کھاتے تھے۔“

”ہر گز نہیں۔“ لیڈی جاوید غمناک لہجے میں بولی۔ ”یہ نہیں..... اب کیا ہو گا۔“

”قیہے قیا ہو گا.....!“ قاسم جواب ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ منہ چلاتا ہوا۔

”کچھ نہیں تم کھانا کھاؤ..... بات نکل ہی آتی ہے..... ورنہ میں تو اب یہ پاؤں

کہ کوئی تمہارے سامنے تمہاری بیماری کا نام بھی نہ لے۔“

”ہا ہا ہا.....!“ قاسم نے بھاڑ سامنے پھیلا کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں بیمار ہوں

یہ بیمار ہوں..... کہو تو میز اور کرسیاں تک چاؤالوں۔“

”نہیں تم بیمار نہیں ہو..... کھانا کھاؤ.....!“ لیڈی جاوید نے کہا۔ اتنے میں ایک

نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی۔

”صاحب واپس آگئے ہیں..... کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔“

”ہائے.....!“ قاسم کراہا۔ ”آگئے صاحب واہب.....!“

”آخر تم ان سے بھاگتے کیوں ہو.....!“ لیڈی جاوید نے پوچھا۔

”مجھے بیٹا کہنا چھوڑ دیں نہیں بھانگوں عا.....!“

”کیوں نہ کہیں..... جب تم ہو۔“

”بیٹے تو آپ ان کے بھی ہیں۔“ ایک لڑکی نے ہنس کر کہا۔

”کیا.....؟“ قاسم غرا کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے..... ارے.....!“ لیڈی جاوید بھی کھڑی ہو گئی۔ لیکن قاسم اس کی

متوجہ ہوئے بغیر اسی لڑکی سے بولا۔ ”جرا کہہ کر تو دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے؟“

”ارے نہیں نہیں! میں نہیں کہوں گی۔ تم بیٹھو۔“

”میں کہتا ہوں اب میرا پیچھا بھی چھوڑو..... تمہارا بیٹا منور سالا کہیں مر کھپ گیا

ہو گا۔“

”یہ تم نے کہاں کی باتیں چھیڑ دیں.....“ لیڈی جاوید نے اسی لڑکی سے غصیلے لہجے میں

کہا جس نے قاسم کو چھیڑا تھا۔ وہ ہنس کر رہ گئی۔

”نہیں میں تو ابھی جاؤں گا..... دیکھتا ہوں کون سالا روک لیتا ہے.....“ قاسم کی

زبانی رد ہیک گئی اور وہ کرسی الٹ کر دروازے کی طرف چھینا۔

اس کے بعد وہ تینوں لڑکیاں بھی اس کے پیچھے دوڑیں اور بالآخر تیسرے کمرے میں

آئے جہاں لیا..... ایک نے جھپٹ کر اس کی کمر تھام لی اور دوسری نے گدگدانا شروع کیا۔

قاسم دہیں رک کر اچھلنے کو دہانے لگا۔

وہ بڑی طرح ہنس رہا تھا۔

”ارے نہیں..... ہی ہی ہی..... ہا ہا..... باغ..... غما..... ہا ہا۔“

تیسری نے پیچھے سے دھکا دیا اور وہ اس لڑکی سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا جس نے کمر تھام

رکھی تھی۔

پھر وہ دونوں بھی اس پر ٹوٹ پڑیں..... اور قاسم دہاڑ دہاڑ کر قہقہے لگاتا رہا..... تینوں

لگا لگا رہی تھیں..... وہ فرش ہی پر پڑا اچھلتا اور قہقہے لگاتا رہا۔ بھلا ایسے میں اٹھ بیٹھنے کی

مجب کے تھی۔

”نہیں..... ہا ہا ہا..... جاؤں عا..... عا ہا ہا..... الا قسم..... نہیں..... جاؤں

عا..... ارے باپ رے..... ماچھ کر دو۔“

”نہیں نہیں..... تم جاؤ گے۔“

”کبھی نہیں جاؤں گا..... الا قسم۔“

وہ اسے چھوڑ کر ہٹ گئیں..... لیکن وہ پیٹ دبائے ہنستا ہی رہا۔

اتنے میں لیڈی جاوید بھی کمرے میں داخل ہوئی اور بگڑ کر ان سے بولی۔ ”جاؤ..... نکلو

تم سب یہاں سے..... کیوں اسے پریشان کر رہی ہو۔“

”تم خواہ مخواہ ہو رہی ہو۔“ ایک بولی۔ ”وہ تو چاہتے ہی ہیں کہ پریشان کئے جائیں۔“

”غاں..... غاں.....!“ قاسم ہانپتا ہوا بولا۔ ”آپ جانیے..... سب ٹھیک ہے۔“
 ”دیکھا..... دیکھ لیا..... خواہ مخواہ مری جا رہی ہو۔“

لیڈی جاوید پھر کچھ کہنے والی تھی کہ ایک نے بڑھ کر بلب بجا دیئے۔
 ”قیوں..... یہ کیا ہوا.....؟“ اندھیرے میں قاسم کی آواز گونجی اور پھر یک بیک
 کے حلق سے بے ساختہ قسم کے ہلکے بھاری ہر قسم کے قہقہے پھوٹنے لگے۔
 ”ارے..... ارے..... عی عی عی عی..... الا قسم..... یہ نہیں..... عی عی عی عی.....
 عی..... ارے باپ رے..... ہلہلہا..... عی عی عی عی..... باغ..... باغ..... غمپ.....!“



سارہ آنکھیں پھاڑے تصویر کو گھورتی رہی تھی پھر کھینائی سی ہنسی کے ساتھ بولی تھی۔
 ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“
 ”ہوں.....!“ قلندر غرایا۔ ”میرے متعلق آئندہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے
 جرأت نہ کرنا سمجھیں..... میں تم سے مذاق کر رہا ہوں۔“
 ”پھر..... یہ سب کیا ہے۔“
 ”تمہاری تصویر.....!“

”نا ممکن ہے..... مجھے خواب میں بھی کبھی ایسا المبوس نصیب نہ ہوا ہو گا۔“
 جواؤ تاج..... یقیناً کسی فوٹو گرافر کے ہاتھ کی صفائی ہے۔“
 ”وہ کس طرح۔“
 ”کسی دوسرے جسم پر میرا چہرہ فٹ کر دیا گیا ہے۔“
 ”اور یہ تاج بھی اسی طرح پہنایا گیا ہے..... کیوں؟“

سارہ کی الجھن بڑھتی رہی۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”آپ نے مجھے یہ تصویر کیوں دکھائی ہے اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“

”یہی کہ حالات کا پامردی سے مقابلہ کرو..... تم اسٹیٹ کی صحیح وارث ہو۔“
 ”ارے میں عبدالغفور کی لڑکی ہوں..... محلے والے شہادت دیں گے کہ وہ مجھے بچپن
 سے جانتے ہیں۔“

”میں نہیں بھی جہنم میں جھوٹو اور عبدالغفور کو بھی۔ ایک روشن ترین مستقل تمہارا منتظر ہے۔“
 ”میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔“
 ”وہ لوگ تمہیں درغلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
 ”کون لوگ.....!“ سارہ چونک پڑی۔

”وہی..... جو..... بچپلی..... رات..... تمہیں..... اپنے..... ساتھ..... لے گئے۔“

سارہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ قلندر کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ خوفناک ہو گئی
 تھیں۔ وہ تو سمجھی تھی کہ بات بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے..... اس کی اس کہانی پر یقین کر لیا
 گیا ہے کہ ہنگامے کے بعد وہ ہوٹل سے نکل بھاگی تھی اور ایک کینے میں دم لیا تھا..... تو یہ
 قلندر سب کچھ جانتا ہے؟ اب کیا ہو گا۔

اس کا سر چکراتا رہا تھا..... اور آنکھوں کے سامنے تاریکی کے بادل امنڈتے
 رہے..... سر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔
 کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ قلندر اُسے آواز دے رہا ہے..... اس کا شانہ ہلا
 رہا ہے۔

”سارہ..... سارہ..... لو پانی..... پی لو.....!“
 یقیناً وہ پیاسی تھی..... اتنی کہ حلق میں کانٹے پڑے جا رہے تھے۔
 پھر گلاس اس نے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا اور وہ ایک عی سانس میں خالی کر گئی
 تھی..... ذہن پر اب بھی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔
 ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے.....!“ قلندر نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہ بولی بدستور آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت گاہ سے نکلی رہی۔

قلندر بھی خاموش ہو گیا تھا۔ دس منٹ گزر گئے..... گھڑی کی ٹنگ ٹنگ اس پر ہتھوڑے سے لگ رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کیا اسے سب کچھ بتا دینا پڑے گا۔ لیکن خود اس کی کیا پوزیشن ہے..... قلندر نے تصویر کا کیسا چکر چلایا ہے..... مقصد کیا ہے۔

”اب کیسی طبیعت ہے۔“ قلندر نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ تھوک نگل کر مردہ سی آواز میں بولی۔

”گفتگو جاری رکھو..... یا پھر کسی وقت۔“

”کہئے کہئے..... جو کچھ کہنا ہو۔“

”اس کے علاوہ اور کیا کہوں کہ مجھے تم سے شکایت ہے۔ آخر تم نے یہ بات مجھ سے کہ چھپائی..... میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ تمہیں لے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خود ہی داہن دینے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی تمہارے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ ضرور ہوا ہوگا۔“

”میں نہیں جانتی وہ لوگ کون ہیں۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”پھر آپ ہی بتائیے کہ ہمارے درمیان کس قسم کا سمجھوتہ ہوا ہو گا۔“

”سارہ.....!“

”وہ سنہل کر بیٹھ گئی..... اتنی دیر میں بھول ہی گئی تھی کہ کس سے ہم کلام ہے۔“

”مم..... میں..... مطلب یہ کہ..... میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”قطعاً نہیں سمجھ سکو گی میری رہنمائی کے بغیر۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی دلدل میں پھنس جاؤ۔“

”پھر بتائیے..... میں کیا کروں۔“

”مجھے سب کچھ بتادو۔“

”نہیں نہیں..... میں غدار کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔“

”غدار.....!“ قلندر چونک پڑا..... ”کس سے غدار..... تم میری پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔“

”اوہ..... میں کیا بک گئی..... میرے خدا“ وہ اپنی پیشانی مسلتی ہوئی بولی۔

”سارہ.....!“

”جی.....!“ وہ خوفزدہ سی آواز میں بولی۔

”میری طرف دیکھو.....!“

آنکھیں چار ہوئیں اور سارہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی قوت ارادی جواب دے گئی ہو۔ وہ اس طرح بولی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ ”وہ سیکرٹ سروس والے تھے۔ اُن کے

ہنٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ غدار ہیں..... ایک غیر ملک کے لئے جاسوسی کر رہے ہیں۔

میں آپ پر نظر رکھوں اور آپ کی مصروفیات سے انہیں مطلع کرتی رہوں۔“

دعاؤں کا آواز بلند ہنس پڑا..... عجوبہ..... عجوبہ۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اسے قہقہہ

لگنے نہیں دیکھا تھا۔ بواؤں کا قہقہہ تھا جیسے بیک وقت ہزاروں خبیث روہیں چیخ پڑی ہوں۔

اس نے بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد قلندر نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے اس

غلبے کی قدر کرتا ہوں کہ تم نے مجھے غدار سمجھ لینے کے بعد میری دفا دار رہنے کا ارادہ ترک

کر دیا تھا۔ مگر اچھی لڑکی..... وہ بد معاش خود غدار ہیں۔ میں عرصہ سے اُن کی تاک میں

ہوں۔ جہاں کوئی واضح ثبوت ہاتھ آیا وہ سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ سیکرٹ سروس والے

اس طرح ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو نہیں اٹھواتے پھرتے۔“

سارہ کچھ نہ بولی۔

قلندر نے پھر کہا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا مجھے آگاہ کر دیا۔ اب میں انہیں دیکھوں گا۔ کیا

اسی شخص نے خود کو سیکرٹ سروس کا چیف ظاہر کیا تھا جس کے بائیں جیزے پر زخم کا گہرا داغ

ہے۔“

”تمی ہاں..... وہی۔“ سارہ چہرے سے ہاتھ ہٹائے بغیر بولی۔

”کہاں جائے گا..... مجھ سے بچ کر۔“

”یہ سب کیا ہے..... مجھے بھی بتائیے۔“

”کچھ نہیں..... اب تم ان کے لئے میری سراغ رسی کرو گی۔“ اس نے زہیر علی کے ساتھ کہا۔

”نہیں مجھ سے کچھ نہ ہوگا..... مجھے گھر بھجوا دیجئے۔“

”اب گھر گئیں تو پوری طرح تباہی کے غار میں گرو گی۔ میری ہی حفاظت میری زندگی بسر کر سکو گی..... تم بالکل نہیں سمجھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔“

”خدا را آپ ہی سمجھا دیجئے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

”اچھا تو سنو..... یہ کہانی اب سے دو سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ گذران طبر

شہزادی دردانہ یورپ گئی تھی۔ وہاں حیرت انگیز طور پر غائب ہو گئی۔ اُس کے ساتھ جو شخص گیا تھا اس نے یہ بات چھپا ڈالی۔ وہ اب تک اسٹیٹ کے سربراہ کو دھوکے میں رہے ہوئے ہے۔ وہ کہتا ہے شہزادی کی ضد ہے کہ وہ پانچ سال یورپ میں گذاریں گی۔ اسٹیٹ

باقاعدہ طور پر اس کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے اور شہزادی تلاش میں ہے۔ لیکن اب اسے بھی یقین آگیا ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ تم حیرت انگیز طور شہزادی سے مشابہہ ہو۔ یہ اسی کی تصویر ہے جو میں نے تمہیں دکھائی ہے..... میں

بد معاش سے جس کا تم نے تذکرہ کیا ہے عرصہ سے واقف ہوں۔ مجھے سن گن ملی کہ لوگوں نے شہزادی کی کسی ہم شکل کو تاز لیا ہے اور اسے شہزادی بنا کر پیش کر دیں گے۔ جو

میں کرنے پر پتہ چلا کہ وہ تم ہو۔ اسی دوران میں اتفاق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ میرے ایک دوست کے گھرانے سے تمہارے مراسم ہیں۔ پھر میں نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ میری پرائیویٹ سیکریٹری بن سکو۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے کبھی کوئی مرد سیکریٹری بھی نہیں

رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تمہاری حفاظت کر سکوں..... تمہیں ان کا آکھ کار نہ بننے دوں۔“

قلندر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”لیکن وہ مجھے ورغلا نا چاہتے تو درغلا ہی سکتے تھے..... میں اپنا سارا وقت تو آپ

ساتھ نہیں گذارتی۔“

”قطعی نہیں..... انہیں موقع کون دیتا ہے..... میں روزانہ اپنی حفاظت میں

نہارے گھر پہنچا تھا اور اپنی ہی نگرانی میں گھر سے واپس لاتا تھا..... ادھر کچھ دنوں سے نہیں احساس ہو سکا تھا کہ کوئی تمہاری نگرانی کرتا ہے۔“

”تو..... وہ ڈاڑھی والا۔“

”ہاں..... وہ میں ہی تھا..... جب تم نے اس کا تذکرہ کیپٹن حمید سے کر دیا اور وہ

میرے پکر میں پڑ گیا تو پھر مجھے دوسرا بھیس بدلنا پڑا۔“

”اس کے بعد بھی آپ میری نگرانی کرتے رہے تھے۔“

”یقیناً.....!“

”لیکن میں اندازہ نہیں کر سکی تھی۔“

قلندر کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد سارہ نے کہا۔ ”ایک دن جب میں کیپٹن حمید کے

ساتھ تھی تو کسی نے اس پر خنجر پھینکا تھا۔“

”محض اس لئے کہ وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے..... مقصد مار ڈالنا نہیں تھا..... ورنہ میرا

قلندر بھی خطا نہیں کرتا..... میں نے کرسی کے فریم کے اوپری ہی حصے کا نشانہ لیا تھا۔“

”میرے خدا..... اگر وہ مر جاتا تو..... لیکن آپ نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا تھا۔“

”محض تمہارے لئے..... میں نہیں چاہتا کہ تم بھی روتی پھرو۔ وہ بیک وقت شہر کی

نیم سو لکیوں سے عشق کرتا ہے۔“

”اوہ..... مگر وہ کتنا ذہین اور چالاک ہے۔“

”کیا مطلب.....!“

”اس نے یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ خنجر پھینکنے والا آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”ہوگا.....!“ قلندر نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔ ”مجھے پرواہ کب ہے۔“

پھر کمرے کی فضا پر بوجھل سا سکوت طاری ہو گیا۔

سارہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

”اور اب.....!“ قلندر کچھ دیر بعد بولا۔ ”وہ دوسرے ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہتے

تھے۔ تم سے اس طرح رسم و رواج پیدا کر کے تمہیں اپنے اعتماد میں لیں گے لیکن کیا تم کسی کو

دھوکا دینا پسند کرو گی؟“

”میں نہیں سمجھی۔“

”کیا تم شہزادی دردانہ بننا پسند کرو گی۔“

”ہرگز نہیں۔“

”شکریہ..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

”آخر وہ مجھے اس پر آمادہ کیسے کرتے۔“

”پیسے میں بڑی قوت ہے..... اور اگر تم اس پر بھی نہ مانتیں تو وہ تمہیں بلیک مار کرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیتے۔“

”کون سا ذریعہ..... میرے ساتھ ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے جس کی بناء پر بلیک مار کی جاسکوں۔“

”وہ تم سے کسی کو قتل کرا سکتے ہیں..... اور اس قتل کے معنی شاہد بن کر ہونے لگے۔“

”دھمکیاں دے سکتے ہیں۔“

”ارے نہیں.....!“ اس نے مردہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”اُن جیسے لوگوں کے لئے سب کچھ ممکن ہے..... خیر یہ تو بتاؤ کہ تم انہیں ہر متعلق کوئی اطلاع کیسے دو گی۔“

”ان کا کوئی آدمی ہر وقت یہاں ہوٹل میں میری نگرانی کرتا رہے گا۔ میں کوئی چیز چوکیٹ کے کور کی پشت پر اپنی رپورٹ لکھوں گی اور ڈانگنگ ہال کے ڈسٹ بن میں ڈال دوں گی..... وہ اسے وہاں سے نکال کر چیف تک پہنچا دے گا۔“

”کیا اس عمارت کی نشاندہی کر سکو گی جہاں لے جانی گئی تھیں۔“

”نہیں..... گاڑی عمارت کے کسی اندرونی حصے میں مجھے لے گئی تھی اور وہیں سے نکلتی تھی۔“

”اور یہ محض اس لئے ہوا تھا کہ تم عمارت کی نشاندہی نہ کرو..... لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اُن کے حالات سے بہت زیادہ باخبر ہوں۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ مجھے وقت اپنی نگرانی میں رکھیں۔“

”تو کیا وہ آپ کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”میں انہیں نہیں سمجھی۔“

”کیا تم شہزادی دردانہ بننا پسند کرو گی۔“

”ہرگز نہیں۔“

”شکریہ..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

”آخر وہ مجھے اس پر آمادہ کیسے کرتے۔“

”پیسے میں بڑی قوت ہے..... اور اگر تم اس پر بھی نہ مانتیں تو وہ تمہیں بلیک مار کرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیتے۔“

”کون سا ذریعہ..... میرے ساتھ ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے جس کی بناء پر بلیک مار کی جاسکوں۔“

”وہ تم سے کسی کو قتل کرا سکتے ہیں..... اور اس قتل کے معنی شاہد بن کر ہونے لگے۔“

”دھمکیاں دے سکتے ہیں۔“

”ارے نہیں.....!“ اس نے مردہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”کر سکتے ہوتے تو کبھی کے کر چکے ہوتے۔ میں ان جیسے درجنوں پر بھاری ہوں۔“

سارہ اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔

”اچھا دیکھو.....!“ قلندر کچھ دیر بعد بولا۔ ”میرے متعلق تم وہی رپورٹیں لکھا کرو گی جو میں ڈکٹیٹ کروں گا۔ پھر تم یہ رپورٹیں پوری آزادی کے ساتھ ڈسٹ بن کی نذر کر سکو گی..... میں ان کے جرائم ان کے منہ پر مارنا چاہتا ہوں..... اچھی لڑکی کیا تم میری مدد کر دے گی..... میں پورے معاشرے کو ایسی گندگیوں سے پاک کرنا چاہتا ہوں.....!“

”جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا ضرور کروں گی۔“

”لیکن تم مجھے اطلاع دیئے بغیر ان جگہوں پر ہرگز نہیں جاؤ گی جہاں وہ تمہیں طلب کریں گے..... ورنہ تمہیں اپنی اس غلطی کا خیاظہ بھگتنا پڑے گا..... وہ تمہیں بلیک مار کرنے کے لئے کسی قسم کا مواد ضرور مہیا کر لیں گے۔“

”بہت بہتر.....!“ سارہ نے کائنیتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

خوفزدہ بیٹی

”دوسرے دن حمید نے پتہ لگایا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے وہ دونوں بیگمات کہاں پہنچائے تھے..... فرمان منزل کے ایک فلیٹ میں تنہا رہتی تھی..... آنا گریس نام تھا۔ ملنے والے اپنی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ڈیوٹی پر جاتی تو بہت ہی معمولی قسم کے لباس میں نظر آتی لیکن جب شام کو اپنے فلیٹ سے برآمد ہوتی تو پچاننا دشوار ہو جاتا۔ وہ آنا گریس تو معلوم ہی نہ ہوتی، جو تار گھر کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہونے والے تار وصول کیا کرتی تھی..... بالوں کا اسٹائل بدل دیتی..... ایسی لپ اسٹک استعمال کرتی کہ ہونٹ انکارے معلوم ہوتے۔ اسکرٹ اور بلاؤز اتر جاتے۔ ان کی جگہ نفیس قسم کی

ساریاں لیتیں..... اور ان پر بغیر آستین کے بلاؤز پہنے جاتے۔

”ہاں بڑا کاسینو ہے..... اور یہ روزانہ تاش نہیں بدل سکتے۔“ حمید نے کہا اور چوں کے

ساتھ اس کی کاروائی جاری رہی۔

”کیوں کیا خرابی ہے..... چوں میں۔“

”میں ہمیشہ نئی گڈی استعمال کرنے کا عادی ہوں۔“

”چلو بانٹو..... ابھی دوسری طلب کر لیں گے۔“

حمید نے پتے بانٹے..... شارپنگ کر گیا تھا..... خود ایک کی تریل لگائی تھی اس کی

طرف بادشاہ کی بڑھادی..... پتے اٹھاتے ہی مقابل کا چہرہ بل بھر کے لئے کھل اٹھا پھر ایسا

معلوم ہوا جیسے اس پر مردنی چھا گئی ہو..... اس نے بُرا سامنہ بنا کر چال چلی..... حمید نے

اس کی میز پر کھیل شروع ہو چکا تھا۔ حمید کی میز پر صرف ایک آدمی تھا اور سونیڈا بڑھ کر رقم لگائی۔ مقابل نے اس بار اس کی دو گنی رقم لگائی اور مقابل نے جھنجھلا شو کر لیا.....

کاسینو کی کا کوئی شارپ تھا..... اس نے حمید سے کہا آؤ..... ”کیا ضروری ہے کہ کچھ اور رقم جمنے پتے دکھائے اور کل رقم کھیٹ کر سامنے رکھ لی۔“

مقابل اسے کینہ توڑ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعاتیابی کی میز سے قہقہے بلند ہوئے۔ حمید اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اپنی کی میز کے

نہیں جواری بُری طرح ہنس رہے تھے اور اپنی ان پر دانت پیس رہی تھی۔ دفعات اس نے اپنا

دشمن بیک اٹھایا اور ہنسنے والے جواریوں میں سے ایک کے منہ پر کھینچ مارا۔

وہ کسی قدر نشتے میں بھی تھا..... بچاؤ کے لئے اس نے پیچھے کھسکا چاہا لیکن توازن

باز نہ رکھ سکے کی بناء پر کرسی سمیت الٹ گیا۔

اس کے منہ سے منقلحات کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اپنی کے بال

چمکے

حمید اپنی میز سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا..... دوسرے دور سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اس نے کچھ کہے سنے بغیر بال پکڑنے والے کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا..... اس وقت وہ قطعی طور

پر بھول چکا تھا کہ یہاں اس کی موجودگی کا مقصد کیا ہے..... وہ تو بس ایک خوبصورت لڑکی پر

اس قسم کی زیادتی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ محض کلائی پر ہاتھ ڈال دینے سے مقصد حاصل نہ

ہوا تو اس نے اس کے ساتھیوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر جڑ

دیا۔ پھر تو نہ صرف اپنی کے بال چھوٹ گئے بلکہ وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم کے فاصلے پر

پھر وہ ہوتی اور نومی چار کا کوئی بڑا قمار خانہ..... لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ لگا کر

ہلکے کش لیتی اور اس طرح مسکرا کر داؤں پر پیسے جھونکتی تھی جیسے خود کسی نکسال کی مالک ہو

تیسری رات حمید بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک کاسینو میں داخل ہوا۔ یہاں بڑے

پر کاسینو ہی کا ایک آدمی ضرور موجود رہتا تھا۔ تین باہر کے کھلاڑی ہوتے تھے اور ایک وہ

زیادہ تر فلتش ہوتا تھا۔ بڑی لمبی چالیں ہوتیں۔ حمید کو اس کے قریب ہی کی ایک میز کی

ملی۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی کے ساتھی اُسے پہلے سے جانتے ہیں اور ابھی تک اس

منتظر رہے ہوں۔

اس کی میز پر کھیل شروع ہو چکا تھا۔ حمید کی میز پر صرف ایک آدمی تھا اور سونیڈا بڑھ کر رقم لگائی۔ مقابل نے اس بار اس کی دو گنی رقم لگائی اور مقابل نے جھنجھلا شو کر لیا.....

کاسینو کی کا کوئی شارپ تھا..... اس نے حمید سے کہا آؤ..... ”کیا ضروری ہے کہ کچھ اور رقم جمنے پتے دکھائے اور کل رقم کھیٹ کر سامنے رکھ لی۔“

مقابل اسے کینہ توڑ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعاتیابی کی میز سے قہقہے بلند ہوئے۔ حمید اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اپنی کی میز کے

نہیں جواری بُری طرح ہنس رہے تھے اور اپنی ان پر دانت پیس رہی تھی۔ دفعات اس نے اپنا

دشمن بیک اٹھایا اور ہنسنے والے جواریوں میں سے ایک کے منہ پر کھینچ مارا۔

وہ کسی قدر نشتے میں بھی تھا..... بچاؤ کے لئے اس نے پیچھے کھسکا چاہا لیکن توازن

باز نہ رکھ سکے کی بناء پر کرسی سمیت الٹ گیا۔

اس کے منہ سے منقلحات کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اپنی کے بال

چمکے

حمید اپنی میز سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا..... دوسرے دور سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اس نے کچھ کہے سنے بغیر بال پکڑنے والے کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا..... اس وقت وہ قطعی طور

پر بھول چکا تھا کہ یہاں اس کی موجودگی کا مقصد کیا ہے..... وہ تو بس ایک خوبصورت لڑکی پر

اس قسم کی زیادتی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ محض کلائی پر ہاتھ ڈال دینے سے مقصد حاصل نہ

ہوا تو اس نے اس کے ساتھیوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر جڑ

دیا۔ پھر تو نہ صرف اپنی کے بال چھوٹ گئے بلکہ وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم کے فاصلے پر

”پتہ نہیں.....!“

جاگرا..... ہلچل مچ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی حمید پر جھپٹے اور حمید نے انہیں گھونس لیا..... پھر پہلے جس کے منہ پر ہاتھ پڑا تھا وہ بھی آکر اُن میں شامل ہو گیا۔
دفتا ایک گرجدار آواز اس شور سے ابھری۔

”خبردار..... الگ ہٹ جاؤ..... ورنہ فائرنگ شروع کر دوں گا۔“

”دوسرا شور فوری طور پر دب گیا اور صرف وہی آواز سنائی دیتی رہی۔ ہٹ ہٹ داخل ہوا۔

الگ ہو..... ایک..... دو..... تین۔“

حمید نے ہاتھ روک لئے لیکن اس سے پہلے ہی دوسروں کے ہاتھ رک گئے تھے۔ مڑی ہوئی۔
نے اس کی آواز کی طرف مڑ کر دیکھا..... ایک قد آور جسیم آدمی اعشاریہ چار پانچ کا۔

سنجھالے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کی گھٹی ڈاڑھی تھی..... اور آنکھوں پر بھی کی ہت کیسے کی تھی۔
کروکس کی عینک..... آنکھیں واضح طور پر نہیں نظر آرہی تھیں۔
”جھگڑا کس نے شروع کیا تھا.....!“ وہ کھٹکنے انداز میں غرایا۔

اُن میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ حمید نے اپنی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں.....
”یہ سب کچھ میرا ہے..... جی سس کرائسٹ کا نہیں۔“ وہ میز پر ہاتھ مار کر
جھگڑا کرنے والوں کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ وہ تو اتنے نروس ہو گئے تھے کہ اس کے ہاتھ ہلکا ہوا۔
جواب ہی نہ دے سکے۔

”بکو جلدی سے.....!“ وہ ریوالبور والے ہاتھ کو جنبش دے کر پھر غرایا۔

”ان لوگوں نے ان خاتون کی توہین کی تھی۔“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
”کیا تم اس کے ساتھ تھے۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہیں۔“ حمید نے جواب دیا۔

”کیا تم اس کاسینو کے قواعد و ضوابط سے واقف نہیں ہو۔“

”نہیں..... میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔“

”اچھا تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ریوالبور جیب میں رکھ کر ایک جانب مڑ گیا۔

”کیا یہ ضروری ہے۔“ حمید نے تیز لہجے میں پوچھا۔

وہ رک کر مڑا۔ نیچے سے اوپر تک اُسے دیکھا۔ پھر ہال کا اچھتی نظروں سے

ہاتھ اٹھا کر کسی کو کچھ اشارہ کیا اور خاموشی سے اسی جانب مڑ گیا جدھر جا رہا تھا۔
دفتا حمید نے اپنی پشت پر کسی چیز کی چھین محسوس کی اور کسی نے آہستہ سے کہا۔
”چلتے رہو..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“

حمید نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے..... اور اس کے اشاروں پر چلتا ہوا ایک وسیع کمرے

داخل ہوا۔

ڈاڑھی والا ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا اسے گھورے جا رہا تھا۔ اپنی بھی اسی کے برابر

حمید نے ہاتھ روک لئے لیکن اس سے پہلے ہی دوسروں کے ہاتھ رک گئے تھے۔ مڑی ہوئی۔

نے اس کی آواز کی طرف مڑ کر دیکھا..... ایک قد آور جسیم آدمی اعشاریہ چار پانچ کا۔

سنجھالے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کی گھٹی ڈاڑھی تھی..... اور آنکھوں پر بھی کی ہت کیسے کی تھی۔

کروکس کی عینک..... آنکھیں واضح طور پر نہیں نظر آرہی تھیں۔

”جھگڑا کس نے شروع کیا تھا.....!“ وہ کھٹکنے انداز میں غرایا۔

اُن میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ حمید نے اپنی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں.....

”یہ سب کچھ میرا ہے..... جی سس کرائسٹ کا نہیں۔“ وہ میز پر ہاتھ مار کر

جھگڑا کرنے والوں کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ وہ تو اتنے نروس ہو گئے تھے کہ اس کے ہاتھ ہلکا ہوا۔

جواب ہی نہ دے سکے۔

”بکو جلدی سے.....!“ وہ ریوالبور والے ہاتھ کو جنبش دے کر پھر غرایا۔

”ان لوگوں نے ان خاتون کی توہین کی تھی۔“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اس کے ساتھ تھے۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہیں۔“ حمید نے جواب دیا۔

”کیا تم اس کاسینو کے قواعد و ضوابط سے واقف نہیں ہو۔“

”نہیں..... میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔“

”اچھا تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ریوالبور جیب میں رکھ کر ایک جانب مڑ گیا۔

”کیا یہ ضروری ہے۔“ حمید نے تیز لہجے میں پوچھا۔

وہ رک کر مڑا۔ نیچے سے اوپر تک اُسے دیکھا۔ پھر ہال کا اچھتی نظروں سے

اطلاع مجھے دی جائے گی۔ خود ہی اسے بچانے کی کوشش کرنے والے کو جرم نہ ادا کرے گا۔
یہاں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم نوٹس پر لکھی ہوئی داخلے کی شرائط سے مرے فیصلوں کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔

”یہ تو تم کسی انعامی معصے کے کمپائلر کی سی حرکت کر بیٹھے ہو۔“ حمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”بگو اس بند کرو۔۔۔۔۔!“ وہ غرایا۔ ”چپ چاپ ایک ہزار روپے یہاں رکھ دو۔“
”یہاں آئے دن لاشیں گٹر میں بہائی جاتی رہتی ہیں۔“ اپنی پھر بولی۔
”خوب۔۔۔۔۔!“ حمید کی مسکراہٹ تضحیک آمیز تھی۔۔۔۔۔ وہ دانت پیتا ہوا تھا۔

”ہو۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔“ حمید کا لہجہ غصیلہ تھا۔
”مجھے تو ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے۔۔۔۔۔ خدا کے لئے چلو۔۔۔۔۔ مجھے بچالو۔“ وہ گھورتا ہوا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔۔۔ لیکن حمید کے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ دفعتاً مقابل کا ہاتھ اٹھ گیا لیکن حمید کے تیور کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا اس سے پہلے ہی غوطہ لگا گیا۔ پھر قبل اس کے کہ حمید حملہ کرتا۔۔۔۔۔ اس کے پیٹ پر زور دار قسم کی ٹکر ماری۔۔۔۔۔ چاروں شانے چت اٹھنے کی مہلت کیسے ملتی۔ حمید جانتا تھا کہ اگر ایک بار بھی اس کی گرفت میں آجائے مشکل ہو گا۔۔۔۔۔ مختلف قسم کے جسموں کی بناوٹ ہی سے وہ اُن کے ٹائپ کا اندازہ لگا لے گا۔

لہذا اس کے دوبارہ اٹھنے سے پہلے ہی ایک کرسی اٹھائی اور سر پر دے ماری۔ پھر پے پیسے اٹھائے۔
”جواب دیئے بغیر کمرے کے ایک گوشے کی جانب بڑھی۔۔۔۔۔ اور پھر اسی گوشے کا گوشہ۔۔۔۔۔“
”تم عجیب آدمی ہو۔۔۔۔۔!“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو پھر کیا نقب لگائیں گے۔۔۔۔۔ اس میں اس کے علاوہ اور کون سا دروازہ ہے۔“

”جواب دیئے بغیر کمرے کے ایک گوشے کی جانب بڑھی۔۔۔۔۔ اور پھر اسی گوشے کا گوشہ۔۔۔۔۔“
”اسے اٹھاؤ۔۔۔۔۔!“ اس نے قریب پہنچنے پر فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
حمید نے جھک کر دیکھا۔۔۔۔۔ گٹر کے ڈھکن سے مشابہت رکھنے والا ایک فولادی شعلہ فرش پر نصب تھا۔

اسے اس کی جگہ سے ہٹا دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔۔۔۔۔ اس طرح نمایاں ہونے والے علاوہ سے ایک آدمی باسانی گذر سکتا تھا۔ اپنی نے اس میں اترتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
”میں نے پیچھے چلے آؤ۔“

حمید نے اس کی تقلید کی۔
”مجھے گہری تاریکی تھی۔۔۔۔۔ لیکن وہ بائیں جانب والی دیوار ٹٹولتا ہوا آہستہ آہستہ زینے سے اتر رہا۔“

اپنی کھڑی نرمی طرح کانپ رہی تھی۔۔۔۔۔ پھر یک بیک چوکی اور چھت کی جانب والے دروازے کی سٹکنی چڑھا دی۔ حمید اب بھی گرتے ہوئے آدمی کے سر پر ضربیں لگاتے جا رہا تھا۔
اپنی نے دیکھا اب اس نے دوبارہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش ترک کر دی ہے۔



پھر سطح زمین سے پیر لگے اور اپنی کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میرا ہاتھ پیر چلتے رہو۔“

حمید نے آواز کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اندھیرے میں دو ہاتھ ٹکرائے۔ پھر وہ اندھیرے میں ریختے رہے۔

تھوڑی دیر بعد شدید قسم کی بدبو کا بھپکا آیا۔۔۔۔ اور اپنی جلدی سے بولی۔ ”اب ہاتھ دھو کر آنا۔۔۔۔۔“

پتلون اوپر چڑھا۔۔۔۔۔ یہ ضرور ڈوبیں گے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ رک کر اس نے پتلون کے پائینچے جتنی اونچائی تک موڑنے کے لئے پانی ٹخنوں سے اوپر تھا۔۔۔۔۔ جو تے ڈوب گئے تھے۔ بدبو

رہا۔۔۔۔۔ سختی سے ہونٹ پر ہونٹ جمائے وہ چلتا رہا۔

کچھ دیر بعد اپنی نے کہا۔ ”اب یہاں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر گٹر کا دہانہ تلاش کرو۔“

”لڑکیوں کے ساتھ ہمیشہ گٹر ہی میں گرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ کاش میرا باپ کو اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور انہیں ادھر ادھر گردش دیتا رہا۔ بلا آخر گٹر کا ہی گیا۔“

حمید نے دونوں ہاتھ ٹکا کر زور کرنا شروع کیا اور اسے اپنی جگہ سے اٹھانے کا میاب ہو ہی گیا۔۔۔۔۔ کھلے ہوئے دہانے سے دھندلی روشنی نیچے آئی۔

کچھ دیر بعد وہ گٹر سے باہر تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے لٹکائے اور اپنی اوپر کھینچ لیا۔ گلی سنبان پڑی تھی۔۔۔۔۔ گلی کے دونوں سروں پر ایک ایک لٹکے تھے۔ اور دو پولوں کی روشنی اتنی بڑی گلی کے لئے ناکافی تھی۔۔۔۔۔ گٹر کا دہانہ گلی میں تھا اس لئے یہاں اتنی تیز روشنی نہیں تھی کہ کوئی ان دونوں کا مفصل جائزہ لے سکے۔

نے جلدی سے گٹر کا ڈھکن پھر اس کی جگہ پر دبا دیا۔۔۔۔۔ اور پتلون کے پائینچے نیچے گرائے۔ اپنی ہانپ رہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب میں اس جگہ سے نہیں رہ سکتی۔۔۔۔۔ وہ مجھے کتے کی موت ماریں گے۔ خدا کے لئے یہاں سے جلدی نکلیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ دونوں نے تیزی سے گلی طے کی اور سڑک پر آ گئے۔

دونوں کے جوتے پھینکے ہوئے تھے اور ان پر کہیں کہیں گندگی بھی نظر آرہی تھی۔ جلدی ایک ٹیکسی مل گئی۔ حمید نے اپنی کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود بھی

اندھیرے میں بیٹھا ہوا ڈرائیور سے دلا۔ ”ہوٹل مونا کو۔۔۔۔۔!“

”م۔۔۔۔۔ میرے خدا۔۔۔۔۔!“ اپنی آہستہ سے بڑبڑائی اور حمید نے اس کا ہاتھ دبا کر

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

”میں تمہیں سیدھے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔“

بل فائزر رہا ہے..... یہاں کے لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔“

”اور تم اب تک اس کے لئے کام کرتی رہی ہو۔“

”ہاں..... یہ ایک مجبوری تھی۔ میرا باپ جو سیونٹھ آئی لینڈ میں رہتا ہے۔ مقروض ہے۔ اتنا کہ شائد ساری زندگی مقروض ہی رہے۔ اتنی بڑی رقم ادائیگی نہیں کر سکا۔ کیا کام کرتی ہو۔“

”کیا تم نے دیکھا نہیں..... کسی موٹی آسامی کے ساتھ کھلتی ہوں اور میرے کاسینو کا ایک شار پر بھی ہوتا ہے..... ہم اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے لڑا رہے ہیں۔“

”آج تم آپے سے باہر کیوں ہو گئی تھیں۔“

”میں بہت بُری ہوں..... لیکن دنیا کے نجات دہندہ کی شان میں گستاخانہ کلام سن سکتی..... وہ سونٹے میں تھا..... اور اس نے کرائسٹ پر پھینکی کبھی تھی..... میں کاخون پی لیتی۔“

”نی الحال چائے پیو۔“ حمید نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یا کھا۔“

”مجھے بھوک لگی ہے..... لیکن ٹھہرو..... ویٹر کو یہاں نہ بلاؤ..... خود چلے جاؤ۔“

”تم فکر نہ کرو..... اگر وہ تمہیں پہچانتا بھی ہو گا تو کسی سے کچھ نہ کہے گا۔“ حمید نے فون پر دو آدمیوں کے کھانے کے لئے ہدایات دیں۔

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر جب

”صورت سے کافی باحوصلہ معلوم ہوتی ہو۔“

”لیکن اب فومان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔“

”وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔“

”زندہ نہیں چھوڑے گا..... لیکن اب میرے باپ کا کیا ہو گا۔ میرے خدا۔“

وہ اسے بھی زندہ نہ چھوڑے۔“

”کیا وہ بھی اس کے لئے کوئی کام کرتا ہے۔“

جلد نمبر 31

”ہاں..... اس قرض کی وجہ سے ہم سب اُس کے غلام ہیں..... اگر وہ اُس وصولیابی کے لئے عدالت میں کیس دائر کر دے تو ہم کوڑی کوڑی کو محتاط ہو جائیں گے۔“

”وہ کیا کام کرتا ہے؟“

”اس کے لئے پیغام رسانی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”پیغامات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔“

”کیا تمہاری ہی توسط سے آتے ہیں۔“

”ہاں میں انہیں ضرور دیکھتی ہوں..... یہ سرکاری طور پر تار کی شکل میں آتے ہیں۔“

مطلب یہ کہ تار گھر میں موصول ہوتے ہیں..... اور میں ان کے مضمون فومان تک پہنچاتی ہوں۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”وہ ایک ایسے پتہ پر آتے ہیں جو باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ نہیں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ

کون کا پتہ ہے۔ پیغامات وصول کر کے ردی کی نوکری میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔“

”لیکن حقیقتاً وہ پتہ فومان کا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں..... ٹیلی گرافک ایڈریس..... ہنی مون۔“

”تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“

”موبلی گریس..... اب بتاؤ کیا ہو گا..... وہ اُسے مار ڈالیں گے۔“

”نہیں مار سکیں گے..... تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔“

وہ اسے بغور دیکھ کر رہ گئی۔ کچھ بولی نہیں..... اتنے میں ویٹر نے دستک دی۔ پھر حمید سے اندر آنے کی اجازت پا کر دروازہ کھولا۔

جب وہ چلا گیا تو حمید نے طویل انگڑائی لے کر کہا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ میں عرصہ سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں؟“

”نہیں تو..... کیوں؟“ وہ چونک پڑی۔

”اور تم منگل کو مجھے چرک دے کر ڈائمنڈ اسٹور میں داخل ہوئی تھیں اور دوسری سڑک

پر نکل گئی تھیں؟“

”وہ تو میرا راستہ ہی ہے۔ کون اتنا لمبا چکر کاٹے..... لیکن تم میرا پیچھا کیوں کر.....“

”ہو۔“

”محض یہ دیکھنے کے لئے کہ تم دراصل کون ہو..... تار گھر میں لکڑی کے علاوہ ہمارا نام موبی ہے..... اور تم نوی چار کے بل فائٹر فومان کے لئے کام کرتے ہو۔“

کرتی ہو۔ بس اب کھانا کھاؤ..... بقیہ باتیں پھر ہوں گی۔“

”نہیں.....!“ موبی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”نہیں.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”تم اس کے لئے میری نگرانی کرتے رہے

لیکن اب ہنی مون کا راز فاش ہو چکا ہے..... اور تمہاری لڑکی آنا گریس کی بھی

فرے میں ہے۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ ہدیانہ انداز میں چیخا۔

”بل فائٹر کی دانست میں تم دونوں ہی اس کا راز فاش ہو جانے کا باعث بنے ہو۔“

”میرے خدا میں کیا کروں.....!“ موبی مضطربانہ انداز میں بڑبڑایا۔

”نہیں.....!“ فریدی نے اظہارِ تمہاری لڑکی محفوظ ہے..... میرے آدمیوں کی پناہ میں۔“

فرش پر گرا کر پیر سے رگڑتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ بہت اچھا ہوا..... بہت اچھا ہوا..... کرئل صاحب میں آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے دوسرے ہی لمحے میں دروازہ کھولنے والے کے حلق سے تھیر زدہ سی آواز نکلی اور وہ لڑکھانا نہیں۔“

پیچھے ہٹ گیا۔

”نہیں.....!“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”اوہ.....!“

”جج..... جی..... تت..... تشریف لائیے.....!“ صاحب خانہ ہلکایا۔

فریدی نے اندر داخل ہو کر خود ہی نہ صرف دروازہ بند کیا بلکہ سکتی بھی چھانڈنے لگی۔“

صاحب خانہ خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ نشست ہی کے کمرے میں تھے۔ فریدی نے اس سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ.....“

”میں نے کی ضرورت نہیں..... ویسے تمہارے لئے ایک بُری ہی خبر لایا ہوں۔“

”م..... میں نہیں سمجھا۔“

”مجھے جانتے ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

صاحب خانہ کے چہرے پر ایسے آثارِ نظر آئے جیسے اس سوال کے جواب سے..... سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی دین میں بیٹھے اور نامعلوم منزل کی طرف

باپ بیٹی

”کیا اب تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہے۔“ اینی نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”حمہ بھی مسکرایا۔“

میرا آخر کون ہو..... اور میرا تعاقب کیوں کرتے رہے تھے۔“

ایہ نعل اتفاق ہے کہ اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہوں..... ورنہ ساری زندگی یہ ہماری رہتا اور تم میرے وجود سے لاعلم رہتیں۔“



نہیں نہیں سمجھی۔“

صبح وہ دن چڑھے تک سوتی رہی..... جاگی تو اس پر اسرار آدمی کو بھی سچا کہتا ہوں..... آج تک یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوتا وہ سوچنے لگی آخر کس قسم کا آدمی ہے..... رات سونے سے قبل اس سبھی کوئی لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے اس کا تعاقب شروع کر دیتا ہوں..... اُسے زیادہ اس سے کم از کم اپنی مہربانیوں کا بدلہ ضرور طلب کرے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور کہا جاتا ہوں..... اور یہ نہیں چاہتا کہ اُسے اس کا علم ہو سکے۔“

اپنے بستر پر لیٹا تھا اور کسی مصوم بچے کی طرح سو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مسکرائی۔ ”اب تک کتنی لڑکیوں بھی گیا تھا اور واپسی پر اطلاع دی تھی کہ اس کے باپ کی حفاظت کا انتظام نہیں ہوا۔“

لیکن ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ خود اُس کا تعاقب کیوں کرتا رہا تھا۔ ”تم نمیری ہو۔“

پھر اسے بل فاسٹر فومان کا پٹنایا د آیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ اجنبی پوری طرح انکواریقہ دو کہاں ہیں۔“

سے واقف نہیں تھا ورنہ شاید اس کا ہاتھ بھی اس پر نہ اٹھ سکتا۔

ٹھیک اسی وقت اجنبی نے کراہ کر کروٹ بدلی اور پھر اس کی آنکھیں کھلیں۔۔۔۔۔!

اس کی طرف دیکھتا رہا..... اپنی نے پچھلی رات جو کپڑے پہن رکھے تھے ان کے بھی..... ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اسی شہر میں رہیں جہاں میرا قیام ہو۔ اب سو گئی تھی۔

”صبح بخیر.....!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”صبح بخیر.....!“ ایسی مسکرائی۔

”کیا وقت ہوا ہے؟“

”سازمے آٹھ۔“

”اوہ.....!“ وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔“

پھر تھوڑی سی دیر بعد وہ ضروریات سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر چکا۔

”میں جانتا تھا تم یقین نہیں کرو گی۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔
 ”اور..... نہیں..... تم ٹھیک کہتے ہو گے..... میں نے تھوڑی سی
 کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔“

”کیسے ہوتے ہیں۔“ حمید نے پہلے کے سے لہجے میں ہی پوچھا۔
 انہیں ایسی عورتیں پسند آتی ہیں جو ان کی ماؤں یا بہنوں سے کسی حد تک
 ہوں۔ لیکن وہ ان سے اظہار عشق نہیں کر سکتے کیونکہ لاشعور میں وہ مشابہت
 جو عموماً شعور کی سطح تک آتے آتے شرم اور خوف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔
 ”دھت.....!“ حمید جی جی جھینپ گیا۔ ”میں تمہیں اٹھا کر کھڑکی
 دوں گا۔“

”کچھ بھی کرو..... بات یہی ہے۔“
 حمید نے اٹھ کر گھونسلہ تان لیا..... اور وہ ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔
 پھر یک بیک بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی..... حمید بیٹھتا ہوا بڑبڑایا۔
 ”یہ خوبصورت لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ ہر ایک ان کے پیچھے دم داتا
 ہو نہ۔“

”سنو..... میری بات سنو.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔
 ”سنو.....!“ حمید نے پھاڑ کھانے والے انداز میں آنکھیں نکالیں۔
 ”جانتے ہو میرا کیا حشر ہوتا اگر تم نہ ہوتے۔“
 ”میں کچھ نہیں جانتا۔“ حمید پہلے ہی کے سے لہجے میں غرایا۔
 ”تم تو بُرا مان گئے۔“ وہ ٹھک کر بولی۔ ”میں تو نفسیات کا ایک نکتہ بیان
 تمہیں نفسیات سے دلچسپی نہیں۔“

”میں آم کھانے کا شائق ہوں درخت گنتے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔“
 ”خیر ہو گا..... اگر تم نہ ہوتے تو ایک معزز گاہک کی توہین کرنے کے
 مجھے بڑی سخت سزا دیتا..... اب اس وقت اس کے شکاری کتے میری تلاش
 راہ چلتے گولی مار دیتے ہیں۔“

”یہاں سزا ملتی تمہیں۔“
 ”مجھے کئی گھنٹوں کے لئے الٹا لٹکا دیا جاتا..... یہ وہ سزا ہے جو بہت آسانی سے ہر ایک کو
 دی جاسکتی ہے اس کے لئے عورت مرد کی تخصیص نہیں۔“

”اپنی لٹکی ہوئی کیسی لگتیں تم.....!“ حمید آنکھیں بند کرتا ہوا بولا۔
 ”تصور کرو..... اور اپنا منہ نوچ لو.....“ وہ جھلا کر بولی۔ ”لغت ہے ایسی زندگی پر آخر
 ہم آدمی کیوں کہلاتے ہیں۔“

”تم ہی کوئی مناسب سا نام تجویز کرو۔“ حمید نے لا پرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔
 ”کچھ نہ بولی۔“ کچھ سوچتی رہی پھر یک بیک چوک پڑی۔ حمید کو غور سے دیکھا اور بھرائی
 ہوئی آواز میں بولی۔ ”تم نے میرے باپ کے لئے کیا کیا۔“
 ”ہو سکتا ہے تم کچھ دیر بعد موتی سے فون پر گفتگو کر سکو..... وہ محفوظ ہے؟“
 ”خدا کے لئے جی بتاؤ..... تم پیڈرو کے آدمی تو نہیں ہو۔“

”میں نے یہ نام بھی نہیں سنا۔“
 ”پھر تمہارا پیشہ کیا ہے اگر تم نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔“
 ”میرا پیشہ.....!“ حمید مسکرایا۔ ”اگر فومان کا کوئی دشمن قیمت ادا کرنے پر تیار ہو تو میں
 فومان کو قتل بھی کر سکتا ہوں۔“

”تب تو پیڈرو تمہیں ہر قیمت پر خرید سکے گا۔“
 ”مجھے اسی کا پتہ بتا دو..... آج کل تک دست ہوں۔“
 ”کیا تم جی جی کوئی بُرے آدمی ہو؟“
 ”اچھے آدمی نہ تو لڑکیوں کا تعاقب کرتے ہیں اور نہ فومان جیسے آدمیوں پر اُن کے ہاتھ
 لٹکھ سکتے ہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکی ہوں؟“ اپنی نے
 پرتشویش لہجے میں کہا۔
 ”کیا مطلب.....!“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔ کچھ سوچتا رہا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”سمجھ
 گیا..... اچھی بات ہے..... تم ناشتہ کر کے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”لک..... کیوں؟“

”اب کھجور سے چھوٹ کر زمین پر گرو اور چور چور ہو جاؤ..... یا جہنم میں جاؤ۔“

”تم نما مان گئے..... میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ کہنا کچھ چاہتی ہوں زبان سے نکلتا ہے..... بتاؤ..... میں کیا کروں۔“

”ناشتہ.....“ حمید نے کہا اور اٹھ گیا۔ کیونکہ شائد ویٹر دروازے پر دستک دے گا۔ دروازہ کھولا..... لیکن ویٹر کی بجائے ایک نئی شکل دکھائی دی۔ وہ حمید کو دکھانا اندر گھس آیا..... اور قبل اس کے کہ حمید سنبھلتا اس نے ریو اور بھی نکال لیا۔

”دروازہ بند کر کے بولٹ کر دو.....!“ اس نے تحکمانہ لہجے میں حمید سے کہا۔ حمید نے اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھا..... مضبوط جسم اور متوسط قد رکھتا تھا۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ تیور بہت بُرے تھے۔ حمید نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔

”میں کہہ رہا ہوں..... دروازہ بند کر کے بولٹ کر دو۔“

”میں قطعی نہیں سن رہا۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔

”یہ ریو اور بے آواز ہے..... آتا اگر لیس تم دروازہ بند کر دو۔“

آتا اس طرح دروازے کی طرف بوہی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

حمید نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ ریو اور کو گھورتا رہا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ.....!“ اجنبی نے سر دلہجے میں کہا۔

حمید نے ہاتھ اٹھا دیئے..... لیکن نظر ریو اور ہی پر جمی رہی۔ آتا اگر لیس دروازہ

کر کے پھر اسی جگہ پہنچ گئی جہاں پہلے کھڑی تھی۔

”اب اس کی جامہ تلاشی لو.....!“ اجنبی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اور جو؟“

بھی جیبوں میں دھنکال کر میز پر رکھ دو۔“

آتا پھر کسی مشینی جسم کی طرح آگے بوہی اور حمید کی جیبیں ٹٹول ٹٹول کر نوٹ بک

اور پتہ وغیرہ نکالتی رہی۔

”بہ تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے۔“ اجنبی نے حمید کی جیبیں خالی ہو جانے کے

”وہ کس تقریب میں۔“ حمید نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

”جو اس سنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ نہیں چلو گے تو یہیں ختم کر دوں گا۔ ورنہ

ہو سکتا ہے باس معاف ہی کر دے۔“

”کس باس کا تذکرہ کر رہے ہو۔“

”آریئل فومان کا.....؟“

”اچھا..... اچھا.....!“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اُس مسخرے بل فائٹر کا قصہ ہے۔ کیا

اے ہوٹل آگیا۔“

”چلو.....!“ اجنبی نے آنکھیں نکالیں۔

”اچھا..... اچھا.....!“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”لیکن کم از کم میرا پرس تو مجھے اپنی

جیب میں رکھ لیئے دو..... میں خالی ہاتھ مرنا پسند نہیں کرتا۔“

”آتا اگر لیس..... پرس اس کی جیب میں رکھ دو۔“

اپنی میز کے قریب آئی۔ پرس اٹھایا اور حمید کی طرف بوہی۔ ٹھیک اسی وقت غسل

خانے کا دروازہ بھی بہ آہستگی کھلا اور وہی ویٹر دے پاؤں کمرے میں داخل ہوا جسے سامنے کے

دروازے سے ناشتہ لانا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے کی بجائے ایک وزنی

اور کئی دھات کی موگری تھی۔ پھر وہ اتنی آہستگی سے چلتا ہوا اجنبی کے قریب پہنچا تھا کہ اُسے

اُس کی موجودگی کا علم بھی نہ ہو سکا..... اپنی کارخ حمید کی طرف تھا۔ وہ اس کے کوٹ کی

اندرونی جیب میں پرس رکھ رہی تھی۔

دفنٹائیک تیز قسم کی آواز نے اُسے چونکا دیا..... وہ تیزی سے مڑی..... اجنبی ریو اور

میت فریش پر اوٹھ ہوا پڑا نظر آیا..... اور ہوٹل کا ایک ویٹر غالباً دوسرے وار کے لئے دوبارہ

موگری کی تول رہا تھا۔

”بس کافی ہے۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور جبکہ کر گرنے والے کی مٹھی سے ریو اور

نکل لیا..... اجنبی بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ اپنی جگہ کا کھڑی تھی۔

”اب تم ناشتہ لاؤ.....!“ حمید نے ویٹر سے کہا اور وہ غسل خانے کی طرف چلا گیا..... غسل خانے کا ایک دروازہ برابر کے دوسرے کمرے میں بھی کھلتا تھا۔ اپنی کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی بیہوش اجنبی کی طرف۔

حمید نے اُس کا ریوالتور اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ..... کھڑی کیوں ہو۔“ اس نے اپنی سے کہا۔

”یہ..... یہ.....!“ وہ بیہوش آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر ہلکائی۔ ”اُس کا کیا ہوگا“ ہوش ہی آنے پر معلوم ہو سکے گا۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانے جھٹکائے۔ ”میں کہتی ہوں تمہیں اس کی فکر نہیں کہ کہیں اس کے دوسرے ساتھی بھی موجود ہوں۔“

”مجھے تو اس کا بھی علم نہیں تھا کہ یہ خود یہاں اس طرح گھس آئے گا۔“

وہ پھر فرش پر پڑے ہوئے آدمی کی طرف دیکھنے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اس بار حمید نے قریب پہنچ کر کچھ کہا اور اس وقت دروازہ نہیں کھولا جب تک کہ دوسری طرف سے جواب نہیں مل گیا..... اس بار ویٹر اس نے اندر آکر ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور وہیں رک کر بیہوش آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔

حمید نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اُس کے چلے جانے پر دروازہ بند کر کے بولٹ کیا اور میز کی طرف مڑتا ہوا

”ارے تم بیٹھی کیوں ہو..... چائے اٹھیلو۔“

”مم..... میں!“

”اُسے پیچانتی ہو۔“

”ہاں یہ..... فومان کا خاص آدمی ہے۔ تنہا بڑے سے بڑا معرکہ سر کرنے کا دعویٰ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فومان کے سامنے لاف و گزاف کرنے کے بعد یہاں تنہا ہو گا۔“

”لیکن سیدھا یہیں کیسے چلا آیا۔“

”پورے جریرے میں اس کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔“

”چلو یہی اچھا ہوا کہ ہم رات پوری نیند سو سکے تھے۔“

”لیکن اب کیا ہو گا۔“

”فومان..... اپنے ایک خاص آدمی سے ہاتھ دھو چکا۔“

”کیا مطلب.....!“

”یہ مرچکا ہے؟“

”نہیں.....!“ اپنی اچھل پڑی۔

”قریب سے جا کر دیکھ لو۔“

وہ بوکھلا کر اٹھی۔ اُس کے قریب گئی۔ جھک کر دیکھتی رہی۔ پھر سیدھی ہوئی تو ایسا

محسوس ہوا جیسے چکر اکر گر پڑے گی۔ حمید نے اٹھ کر سنبھالا۔

”وہ مر گیا ہے..... سچ مچ مر گیا..... بالکل مر گیا ہے.....!“ وہ ہدیانہ انداز میں کہتی

رہی۔ ”اب کیا ہو گا..... اس لاش کا کیا ہو گا..... ہمارا کیا ہو گا۔“

”فی الحال ہم ناشتہ کریں گے۔“ حمید نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم بیٹھ جاؤ..... اس نے

اُسے میز کے قریب والی کرسی پر بٹھا دیا۔ اپنی کی آنکھیں بند تھیں اور سر کرسی کی پشت گاہ پر ٹکا ہوا تھا۔“

”محترمہ آنا گریس.....“ حمید نے اس کا شانہ ہلا کر کہا۔ ”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اپنی نے آنکھیں کھولیں اور اس طرح اُسے دیکھتی رہی جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

”میں چائے نہیں پیوں گی۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

”کیا اس لئے کہ وہ نہ تو ہمیں مار سکا اور نہ اپنے مالک کے پاس لے جاسکا۔“

”تم کتنے درندے ہو..... وہ بہر حال آدمی تھا؟“

”آدمی کے لئے تم کوئی دوسرا نام تجویز کرنے والی تھیں۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں خوف نہیں معلوم ہوتا۔“

”کس چیز سے۔“

پیڈرو

قلندر ٹہل ٹہل کر ڈکٹیت کر رہا تھا اور سائرہ کا ڈبیری چو کلیٹ کے ریپر کی پشت پر لکھ رہی تھی۔

ڈکٹیت کر اچکا تو بولا۔ ”اب پڑھ کر مجھے سناؤ۔“
سائرہ تحریر پڑھنے لگی۔

”آج صبح نوبے ایک آدمی میرے باس سے ملنے آیا تھا..... عجیب سی صورت تھی ناک پھولی ہوئی پکڑے جیسی..... آنکھیں خونخوار..... دونوں آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے تھے اور میں نے دونوں کی زبانوں سے ایک عجیب سا نام سنا تھا..... پیڈرو..... وہ پیڈرو آج رات کو نوبے جھیل پر میرے باس سے ملنے والا ہے..... وہ آدمی یہی پیغام لایا تھا۔“
”ٹھیک.....!“ قلندر مسکرا کر بولا۔ ”اب اسے ٹھکانے لگا آؤ..... سائرہ اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم بہت ذہین ہو..... میرا دہناتا تھا بن کر رہ گئی ہو۔ شاید تمہارے بغیر اب میرا کام بھی نہ چل سکے۔“

سائرہ ریپر کو موڑ کر مٹھی میں دبائی ہوئی اٹھ گئی۔ کمرے سے نکل کر راہداری میں آئی اور زینوں سے گذرتی ہوئی ڈانگنگ میں داخل ہوئی۔ گروسری کے کاؤنٹر پر کا ڈبیری چو کلیٹ کا ایک پکٹ خرید اور بے خیالی کی ایکٹنگ کرتی ہوئی اسے پھاڑتی رہی..... پھر اس کے ریپر کو تو دوسری مٹھی میں دبایا اور اس ریپر کو ڈسٹ بن میں ڈال دیا جس پر قلندر کی ڈکٹیت کرائی ہوئی تحریر تھی۔

”اگر ہم اس لاش سمیت پکڑ لئے جائیں تو۔“
”پکڑ لئے جانے ہی پر اس کے متعلق بھی کچھ سوچا جاسکتا ہے..... اس سے پہلے کیڑ کہا جائے کہ کیا ہوگا..... لو..... یہ پیشتریاں کھاؤ..... میں سینڈوچ بنا رہا ہوں۔“
”میں اس لاش کی موجودگی میں کچھ کھاپی نہیں سکتی۔“
”آف فوہ..... میں نے کب چاہا تھا کہ وہ مر ہی جائے..... یہ محض اتفاق تھا۔“
”تو گویا تمہاری نظروں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“
”اہمیت ہوتی تو فومان جیسے آدمی سے کیوں ٹکراتا۔“
”اب مجھے یقین آگیا..... تم پیڈرو ہی کے آدمی ہو۔“
”اگر اب تم نے یہ نام معقول نام پھر دہرایا تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا..... سمجھیں۔“
”مجھے بتاؤ..... تم اس لاش کا کیا کرو گے۔“
”بھون کر کھاؤں گا..... تم چائے اٹھاتی ہو..... یا..... میں۔“
”ٹھہرو..... ٹھہرو..... میرے جسم میں بالکل سکت نہیں..... یہ ٹی پاٹ بھی نہ اٹھ سکے گا..... مجھ پر رحم کرو۔“

”ارے بابا! کچھ دیر بعد یہ لاش یہاں سے چلی جائے گی۔“
”کیسے چلی جائے گی..... اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔“
”مکڑوں میں چائے گی..... چھوٹے چھوٹے پیکٹوں میں..... کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ مطمئن رہو۔“ حمید نے کہا اور سینڈوچ کھانے لگا۔
تھوڑی دیر بعد غسل خانے کا دروازہ پھر کھلا اور وہی ویٹر ایک بڑا سا تھیلا لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

”میرے خدا میں کیا کروں.....“ اپنی آہستہ سے بڑبڑائی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
اس کا ذہن آہستہ آہستہ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا..... پھر وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل علی بے خبر ہو گئی۔

کر مزی۔

قلندر مجسم سوالیہ نشان بنا اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”اوہ..... کچھ نہیں.....“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ ہکلاتی رہی۔ ”مک..... کچھ نہیں..... بس یونہی..... پتہ نہیں کیوں؟“

”اگر تم تھک گئی ہو تو تمہیں آرام کرنا چاہئے.....“ قلندر نے نرم لہجے میں کہا۔

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”لو کیا عموما کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ اچھی بات ہے میں تمہیں گھر بھجوا دوں گا۔“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”خیر..... آرام کرو..... میں جا رہا ہوں۔“

”نہیں..... آپ بیٹھے..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

قلندر اُسے پر تشویش نظروں سے دیکھتا ہوا قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی خاموش

بیٹھی رہی بلا آخر قلندر رکھکار کر بولا۔ ”اگر تم کسی قسم کا خوف محسوس.....!“

”نہیں..... میں ڈرتی نہیں ہوں۔“ سارہ نے اُسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

”ڈرنا بھی نہ چاہئے..... یہ میرا تہما ذرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

دفعتاً سارہ کو کچھ یاد آیا اور اس نے پوچھا۔ ”یہ پیڑرو کون ہے؟“

”گذران اسٹیٹ کا ایک ہمدرد نمک خوار..... میں ان لوگوں پر جتنا چاہتا ہوں کہ

اسٹیٹ کے بعض آفیسر بھی میری پشت پر ہیں۔“

”میں شہزادی کا نام بھول گئی۔“

”دردانہ..... اور سنو..... میرے ذہن میں ایک شاندار اسکیم ہے..... میں نے ایک

شاندار عمارت کرایہ پر حاصل کی ہے..... تم اس میں پرنسز دردانہ آف گرزان اسٹیٹ کی

نشیبت سے قیام کرو گی..... بالکل شہزادیوں کی طرح..... ملازموں کی فوج سمیت۔“

”کیوں.....؟“ وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔

”ان لوگوں کو ہر اسماں کرنے کے لئے..... میں اب یہ قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری

انتہائی مصروفیات ہیں۔“

چو کلیٹ کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈالتی ہوئی پھر زینوں کی طرف مڑ گئی۔ پچھلے دنوں کہانی کے بعد سے قلندر بالکل بدل گیا تھا۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کسی آئینے کی سطح سے گرد صاف کر دی گئی ہو..... شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی اب وہ مسکراتا بھی تھا۔ سارہ نے اس کے بلند بانگ قہقہے بھی سنے تھے..... باتیں کرنے کے موڈ میں آتا تو سارہ چاہتی کہ بولتا ہی رہے..... بڑی دلچسپ باتیں ہوتی تھیں..... بات بات پر لطیفے اور کہانیاں۔

وہ سوچتی کہ قلندر ایک اچھا باس ہے..... وہ اُسے اب تک غلط سمجھتی رہی تھی۔ وہ بچر ایڈونچر کا شائق ہے..... محض اس لئے اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہا ہے کہ کچھ لوگ بغیر نامعلوم آدمیوں کے دھوکہ میں نہ آسکیں۔

اس وقت وہ اس ریاست کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس کی شہزادی اس کی ہر شکل تھی۔ نہ جانے کیوں اس شہزادی کا نام بھی اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ مگر کتنی عجیب بات تھی کیسی حیرت انگیز مشابہت تھی۔

اُسے یاد آیا کہ وہ تصویر اسے ایسی ہی معلوم ہوئی تھی جیسے آئینہ سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اگر وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو؟

اُس کے سارے جسم میں ایک سردی لہر دوڑ گئی..... شہزادی؟ لیکن امی اور ابا کا کہنا ہوتا..... چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں سے پھر مل بھی پاتی یا نہیں؟ کانپ گئی اور شاندار زندگی میں پہلی بار اس نے محسوس کیا جیسے وہ اپنے بھائی بہنوں سے بے اندازہ محبت رکھتی ہو۔ سب سے چھوٹا بھائی یاد آیا جس کی عمر تین سال تھی۔ جو اُسے دن رات چلایا کرتا تھا..... ابا ٹاپا..... آپا کی آئے گی بارات سہانی ہو گی رات..... اور وہ جوتی اتار کر اسے ملانے دوڑتی..... دل کی گہرائیوں سے ایک طوفان سا اٹھا۔ دم گھٹنے لگا اور آنکھیں موٹے موٹے قطروں کی وجہ سے دھندلا گئیں۔ بے اختیار دوڑتے ہوئے اُس نے زینے طے کئے سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ منہ کے بل مسہری پر جاگری..... بند ٹوٹ گیا تھا۔ آنسو بہہ نکلے..... وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی..... پھر ہچکی بندھ گئی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا..... وہ روئے جاری تھی۔ دفعتاً کسی نے آہستہ سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک پڑی۔ نکلے سے سارا

شہرادیوں کی طرح رہنے کا تصور بھی مسرت انگیز تھا۔ وہ خوابوں میں کھو گئی۔



موبی سراسیمگی کے عالم میں کرنل فریدی کی طرف دیکھ کر جا رہا تھا۔
فریدی سگارسلا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
”میں کہاں ہوں۔“ موبی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”توئی چار میں.....!“ کرنل فریدی نے جواب دیا۔ ”لیکن تم اس عمارت سے باہر قدم
لگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“
”نہیں جناب..... یہ خود کشی کے مترادف ہو گا۔“
”مجھ دار آدمی ہو۔“
”میں آہنی کے لئے پریشان ہوں۔“
”تھوڑی دیر بعد تم اس سے فون پر گفتگو کر سکو گے۔ وہ قطعی محفوظ ہے۔“
موبی کچھ نہ بولا۔ صرف نچلے ہونٹ پر زبان پھیر کر رہ گیا۔
”تو تم اس طویل قامت اور بہت زیادہ جسم آدمی کی بھی دیکھ بھال کرتے رہے ہو۔“
ایڈی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔
”ہم..... میں نہیں سمجھا۔“
”میری مراد اس آدمی سے ہے جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔“
”میں ایسے کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں جناب۔“
”جرجائیڈ کو جانتے ہو۔“
”مئی نہیں..... میرے لئے یہ نام بھی نیا ہے۔“

”بھلا وہ اس طرح ہر اسماں کیسے ہوں گے۔“

”میں اُن پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ میں خود تمہاری ذات سے
اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اس سے کیا فائدہ ہو گا۔“

”بس دیکھنا..... اپنی موت آپ مر جائیں گے۔“

”میں بالکل نہیں سمجھی۔“

”وہ خود ہی مجھے فراڈ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح خود ہی اپنے

سمیت فنا ہو جائیں گے۔“

”بات تو ٹھیک ہے.....!“

”بس تو پھر تم تیار ہو جاؤ۔“

”خاصائیڈ وچر رہے گا.....!“ وہ ہنس پڑی۔

”لیکن.....!“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ایک دشواری ہے۔“

”پولیس کے دو آفیسر جو تمہیں پہچانتے ہیں آج کل غالباً یہیں مقیم ہیں۔ اگر اُن کا

مدد کیا تو تم کیا کرو گی۔“

”کون پولیس آفیسر.....!“

”کرنل فریدی اور کیپٹن حمید۔“

”آپ ہی بتائیے کہ کیا کروں گی۔“

”اُن کی طرف قطعی متوجہ نہ ہونا..... اگر خود ملنے کی کوشش کریں تو بالکل اچھے

سایر تازہ ہونا چاہئے۔“

”لل..... لیکن.....!“

”پردہ امت کرو..... میں ماہر قانون بھی ہوں۔“

”اگر انہوں نے گرز ان اسٹیٹ والوں سے رابطہ قائم کیا تو۔“

”پیڈر دیکھے گا کہ انہیں مطمئن کر دیا جاتا ہے۔“

”ہو گا..... مجھے کیا۔“ وہ لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر بولی۔ ”اٹنی سیدھی

”برٹش ایسٹ افریقہ کا ایک تاجر ہے۔“

”نہیں جناب میں قطعی نہیں جانتا۔“

”فقہہ آئی لینڈ کے ڈاکٹر شاپور کو جانتے ہو۔“

”نام سنا ہے جناب..... کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا..... صورت آشنا کی بڑی

ہوں۔“

”پھر تم کس مرض کی دوا تھے۔“

”میں تو صرف آپ کی نگرانی کرتا رہا تھا فومان کے حکم سے.....!“

”کیا وہ اُن دنوں سیونٹھ آئی لینڈ میں مقیم تھا۔“

”جی نہیں..... یہاں سے پیغام بھیجا تھا۔“

”فون پر.....!“

”جی نہیں..... اُس کے ایک آدمی نے مجھے ہدایات دی تھیں۔“

”اس سے پہلے جناب میرا اس کے گردہ سے کوئی تعلق نہیں..... بس اُس کا منہ

ہوں اور یہ قرض اتنا زیادہ ہے کہ شاید ساری زندگی قسطوں میں بھی ادا کرنا چاہوں تو

نہ ہو۔“

”لڑکی کو اس غلاظت میں دھکیلنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”میں نہیں جانتا تھا جناب کہ وہ براہ راست اس کی ملازم ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ

چار کے تار گھر میں ایک آسانی خالی ہے کہو تو اپنی کو وہاں لگوا دیا جائے۔ میں نے کہا کیا

ہے..... اب آپ کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ وہ اُس کے جوئے خانے میں بھی کام کرتی

ہے۔ خود اپنی نے مجھے اس کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔“

”ہوں..... کیا وہ صرف جوئے خانہ ہی چلاتا ہے۔“

”پتہ نہیں جناب..... ویسے سنا ہے کہ اسمگلنگ بھی کرتا ہے۔“

”اوہ..... تو وہ گردہ..... فومان ہی کا ہے۔“

”میری معلومات کے مطابق..... یہاں دو گردہ ہیں۔ پہلے دونوں شرکت

کرتے تھے پھر جھگڑا کر بیٹھے..... اب دونوں الگ ہیں۔“

”پیڈرو کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔“

”یہ تو شاید فومان کو بھی نہ معلوم ہو۔ وہ خود کبھی سامنے نہیں آیا۔ اس کا کوئی کارپرداز

کے حصے کی دیکھ بھال کرتا تھا۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ فومان بھی اس سے واقف ہوگا۔“

”جناب عالی اس نے یہ بات خود مجھے بتائی تھی۔ وہ اکثر پریشان رہتا تھا۔ کہتا تھا پارٹنر

پ مجھے بالکل پسند نہیں جب کہ میں نے آج تک اپنے پارٹنر کی شکل تک نہیں دیکھی.....

اس سے خائف بھی رہتا تھا حالانکہ لفظ ’خوف‘ ہی فومان کے لئے مضحکہ خیز ہے۔“

”دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہوا تھا۔“

”اس کا علم تو نہیں مجھے۔“

”فومان کے آدمیوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کے بائیں جبڑے پر چوٹ کا گہرا نشان ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے ایسے کسی آدمی کو ان لوگوں میں نہیں دیکھا۔“

”اس آدمی پیڈرو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میں کیا عرض کروں جناب۔“

”اُن دونوں گردہوں میں اب بھی جھگڑا ہوتا رہتا ہوگا۔“

”جی ہاں..... اکثر بڑی خونریزی ہوتی ہے۔ لیکن فومان پیڈرو کے کسی آدمی کی نشاندہی

کی نہیں کر سکتا۔ ویسے اگر چاہتا تو ان میں سے ہر ایک کو گرفتار کر سکتا۔“

”ہاں میں جانتا ہوں کہ یہاں کی پولیس فومان کے کاروبار سے بخوبی واقف ہے اور شاید

اس کے ایک ایک آدمی سے بھی شناسائی رکھتی ہے۔“

”جی ہاں..... آپ کا خیال قطعی درست ہے۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی دونوں اس کی مٹھی

نہا رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی پیڈرو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”آخر کیوں؟“

”پیڈرو کی دھمکی..... اُس نے جھگڑے کے بعد ہی فومان کو وارننگ دی تھی کہ اگر اُس

کی کوئی آدمی پولیس کی نظروں میں آیا تو وہ فومان کو گولی مار دے گا۔ خواہ وہ سات پردوں میں بھی

لیاں نہ چاہیے۔“

”ہوں..... بڑی عجیب بات ہے۔“

”فومان نے اگر کبھی اُس کی ایک جھلک بھی دیکھ لی ہوتی تو شاید اتنا خائف نہ ہو۔ وہ سوچتا ہے پتہ نہیں کب اور کہاں اپنا کام کر جائے۔ زہری دلوادے۔“

”خوب.....! تو تمہاری دانست میں اس کے کسی آدمی کی بھی نشاندہی کر ہے۔“

”ہرگز نہیں..... فومان کے علاوہ انہیں اور کوئی جانتا بھی نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ اب تم آرام کرو..... لیکن کھڑکیوں کے قریب جانا.....! فریدی نے کہا اور اٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ نومی چار کے سب سے بارونق حصے میں نظر آیا۔ فومان کا وہ قمار خانہ اُس سے ملاقات ہو سکتی تھی یہیں واقع تھا۔

فریدی قمار خانے میں داخل ہوا..... دن کو یہاں عموماً سناٹا ہی رہتا تھا..... ایک کسی گوشے سے جھپٹا اور فریدی کی راہ میں حائل ہوتا ہوا بولا۔ ”اس وقت یہاں کھلے ہو تا۔“

فریدی نے اسے گھور کر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”مجھے فومان سے ملنا ہے۔“

”وہ کسی اجنبی سے نہیں ملتے۔“

”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں اس کے لئے اجنبی ہوں۔“

”وہ سور ہے ہیں۔“

”اچھا شام کو مل لوں گا.....“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

”ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل سکے گا۔“

”پانی کا یہاں کیا کام جناب..... البتہ بار آور ہے۔“

”کبھی کبھی شراب پانی کا بدل نہیں ثابت ہوتی.....“ فریدی مسکرایا۔

”اچھا..... ٹھہریے میں دیکھتا ہوں۔“ وہ آدمی کہتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

فریدی جہاں تھا وہیں کھڑا اگر دو پیش کا جائزہ لیتا رہا۔

دفعتاً چار آدمی اُسے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ لیکن اُس کے بے تعلقاتانہ انداز

فریدی نے فریق نہ آیا۔

”قریب پہنچے اور اس طرح کھڑے ہو گئے کہ فریدی ان کے گھیرے میں آگیا۔“

”کیا بات ہے؟“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

”میں فومان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں.....؟“

”ہوش میں ہوا نہیں۔“ فریدی اسے نیچے سے اوپر تک گھورتا ہوا بولا۔ ”تمہیں یہ کیوں

”اچھا بات ہے۔ اب تم آرام کرو..... لیکن کھڑکیوں کے قریب جانا.....! فریدی نے کہا اور اٹھ گیا۔

”اس کے بغیر باس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

”یہاں اس تک میرا کارڈ بھی نہیں پہنچاؤ گے۔“

”کیا وہ آپ کو جانتے ہیں۔“

”اس جیسے سارے آدمی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ فریدی نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے کارڈ ہاتھ میں لیا اس پر نظر ڈالی اور دوسرے ہی لمحے میں کارڈ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر آ رہا..... جھک کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُسے اٹھایا اور سیدھے کھڑے ہو کر اٹھائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”آپ تشریف رکھئے جناب میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔“

پھر وہ دوڑتا چلا گیا اور اس کے تینوں ساتھی حیرت سے وہیں کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی سراسیمگی کے آثار تھے۔

”تشریف لے چلئے جناب۔“ اس نے کہا اور فریدی اُس کے ساتھ چل پڑا۔

فومان استقبال کے لئے اپنے دفتر سے باہر آگیا تھا۔

”نہیں..... نصیب.....!“ وہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ پھر وہ اُسے اپنے

”نہیں..... فریدی ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا۔“

”نہیں..... فریدی کی آرزو پوری ہوئی۔ تشریف رکھئے جناب۔“ فومان بچھا جا رہا تھا۔

فریدی نے بیٹھتے ہوئے چاروں طرف اچھتی سی نظر ڈالی۔

”فرمائیے..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”ایک لڑکی..... آنا گریس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”آنا گریس..... جی ہاں..... میں یہاں اس کا سرپرست ہوں..... وہ تارک مہجرت کرتی ہے۔ میں نے ہی اس کے لئے سفارش کی تھی۔“

”وہ عرصہ سے مرکزی سی آئی ڈی کی نگرانی میں رہی ہے۔“

”کیوں جناب.....!“ فومان نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ کسی نامعلوم آدمی کے لئے غیر قانونی پیغام رسانی کرتی رہی ہے۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا جناب..... ذرا ایک منٹ آپ کیا پیس گئے۔“

”شکریہ..... کسی چیز کی خواہش نہیں۔“

”پھر بھی.....!“ فومان مسکرایا۔ ”بڑے آدمیوں کے لئے بہت پرانی پرٹیکل رکھتا ہوں۔“

”میں شراب نہیں پیتا.....!“

”حیرت ہے اتنا دماغی کام کرنے کے باوجود بھی.....!“

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر پیغام رسانی کرتی تھی..... یہاں گھر میں ہنی مون کے ٹیلی گرافک ایڈریس پر پیغامات آتے ہیں۔ حالانکہ یہ پتہ رجسٹرڈ ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس پتے کی پشت پر کون ہے..... اس لئے پیغامات آتے ہیں اور کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے ہیں..... لیکن یہ لڑکی ان پیغامات کو الگ نوٹ کرتی دیکھی گئی ہے..... اس کے علاوہ تارک گھر کا اور کوئی فرد ان کی طرف توجہ تک نہیں دیتا۔“

”بس اتنی سی بات جناب.....!“ فومان ہنس پڑا۔ ”دراصل آنا گریس وہ پیغامات لئے نوٹ کرتی رہی ہے۔“

”تو یہ ہنی مون والا پتہ تمہاری ہی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔“

”ہرگز نہیں.....!“ فومان سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔ ”اُس نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا..... میں نے کہا لکھ لایا کرو..... بڑے عجیب و غریب پیغامات ہوتے ہیں۔“

”بوزھی ہوئی جارہی ہے..... کتا مسکرانے لگا ہے..... ہنڈیا پک رہی ہے.....“

دُفیرہ..... میں نے تو فائیل بنالیا ہے۔ کہئے تو دکھاؤں..... فرصت کے اوقات میں ان پیغامات کے معنی حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ..... مگر میں خواہ مخواہ اپنا ذہن یوں ظاہر کروں پتہ نہیں آپ کا نظریہ کیا ہو۔“

”فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔“

”یقین کیجئے.....!“ فومان سر ہلا کر بولا۔ ”چونکہ پیغامات پر اسرار معلوم ہوئے تھے اس لئے میں انہیں اکٹھا کر رہا ہوں۔“

”پرسوں رات یہاں کیا ہوا تھا.....؟“

”میں نہیں سمجھا۔“

”آنا گریس کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا.....؟ یہاں..... اس قمار خانے میں۔“

”مجھے علم نہیں..... وہ اکثر آتی ہے۔ کھیلتی بھی ہے..... ٹھہریئے..... میں یہاں کے گراں سے پوچھتا ہوں۔“

فومان نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔

شہزادی اور نوا بزاہدہ

مطلوبہ آدمی تھوڑی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا۔ فومان نے اس سے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ فریدی نے اس کا سر سری جائزہ لے کر فومان کی طرف دیکھا۔

”کیوں..... کیا پرسوں یہاں کسی سے آنا گریس کا جھگڑا ہوا تھا.....؟“ فومان نے آنے والے سے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

”کیا بات تھی۔“

”کسی ایسے آدمی کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گئی تھی جو نشے میں تھا۔ اُس نے شاید کوئی ویسی بات جیسس کرائسٹ کی شان میں کہہ دی تھی وہ بگڑ گئی اور اپنا پرس اس کے منہ پر مارا تھا.....!“

”میں نے تم سے کیا کہا تھا.....!“ فومان غصیلی آواز میں بولا۔

”وہ مانتی ہی نہیں باس..... کہتی ہے میں محدود ہو کر کھیلتی ہوں۔“

”چلے جاؤ.....!“ فومان ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

وہ چپ چاپ باہر چلا گیا..... فومان ایسے انداز میں خاموش بیٹھا رہا جیسے غصے کی زبا کی وجہ سے کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی رخصت ہو گئی ہو۔

”کل آئی تھی.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جناب.....“ فومان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”ہر آنے والے پر نظر میرے لئے ممکن نہیں۔“

”وہ کہاں رہتی ہے۔“

”غالباً فرحان منزل کے کسی فلیٹ میں..... فلیٹ کا نمبر مجھے معلوم نہیں۔“

”وہ کل اور آج..... تارگھر میں بھی نہیں دکھائی دی۔“

”جنم میں جائے..... یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اپنے یہاں کسی قسم کے جھگڑے

اطلاع ملی ہے..... میرا موڈ خراب ہو گیا ہے..... اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”اُس کے کسی قریبی عزیز کا پتہ بھی بتا سکو گے۔“

”اس کا باپ موبی سیونٹھ آئی لینڈ میں رہتا ہے.....!“ فومان نے کہا اور کاغذ کے

ٹکڑے پر اس کا پتہ لکھ کر فریدی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”اس سے میرے اچھے تعلق

رہے ہیں..... اور انہیں تعلقات کی بناء پر میں نے آتا کے لئے سفارش کی تھی۔“

”بہت بہت شکریہ.....!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔

فومان بھی اٹھ گیا..... اس کے ساتھ دروازے تک آیا۔

سڑک پر پہنچ کر فریدی نے ایک ٹیکسی رکوائی اور اس میں بیٹھتا ہوا ڈرائیور سے ہوا

”فرحان منزل۔“

تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے پھر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔
”چوراہے والے ٹیلی فون بوتھ کے قریب ذرا دو منٹ کے لئے روکنا۔“
”اچھا صاحب۔“

بوتھ خالی تھا۔ فریدی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ انڈیٹ پروف بھی ہے۔

ہوٹل مونا کو کے نمبر ڈائیل کر کے آپریٹر کو حمید کے کمرے کا نمبر بتایا۔ دوسری طرف سے نرانی جواب ملا۔ حمید بول رہا ہوں۔

”مناسب یہی ہے کہ اب اسے بھی دیں بھجوادو.....“ فریدی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”اور میں کھیاں ماروں.....“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”آخر اب میری زندگی

کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر کیوں نہیں رکھتے۔“

”مجھے اس کی تنخواہ نہیں ملتی۔“

”تہائی مجھے کھا جائے گی۔ میں فنا ہو جاؤں گا۔“

”بکو مت..... میری بات سنو۔“

”اُسے وہیں پہنچا دو..... دونوں کا یکجا رہنا ہی مناسب ہے اور اب تم اپنی اصل حیثیت

نما رہ سکتے ہو..... اس ہوٹل سے کہیں اور چلے جاؤ..... میری دانست میں مونٹی کارلو ہی

مناسب رہے گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

”نور ہاں دیکھو..... تمہیں شہزادی دروانہ آف گزران اسٹیٹ پر بھی نظر رکھنی ہے.....“

”نور ہاں دیکھو..... یہاں کی ایک مشہور عمارت نور محل میں مقیم ہے۔“

”کیا دوری سے دیکھنا ہے۔“

”اُن کا فیصلہ دیکھ کر ہی کر سکو گے.....“ فریدی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔



بدی کی قیام گاہ کے نمبر ڈائیکل کئے۔
دوسری طرف سے جواب ملنے پر بولا۔ ”حمید اسپیکنگ..... کام تو شروع کر دیا
لیکن وہ برق رفتار اور خاکسار پیدل۔ آخر کار برق جعدہ کی طرح نگاہ سے اوجھل

نور محل شاندار عمارت تھی۔ ایسی نہیں کہ ساڑھے تین کمروں کی مکانیت پر مبنی
جائے۔ ”زینت محل“ یا ”قصر سلیمان“۔ حمید عمارت کے سامنے پہنچ کر رکا اور سوچنے لگا
اسے عمارت کی نگرانی کرنی ہے یا شہزادی دردانہ کی۔

وہ عمارت کے آس پاس منڈلاتا رہا..... پھانک پر دو مسلح اور باوردی پہرے دار
تھے اور دیوار سے لگی ہوئی نیم پلیٹ پر چلی حروف میں شہزادی دردانہ تحریر تھا۔
یہ کہاں کی شہزادی ہو سکتی ہے؟..... حمید کا ذہن سوال پر سوال کرتا چلا گیا۔
ہوگی۔ چہرہ مہرہ قابل قبول بھی ہو گیا نہیں؟ لفت مل سکے گی یا نہیں۔ شام کے پانچ بجے۔
وہ سوچنے لگا۔ کیا شام بھی گھر ہی پر گذارتی ہے؟

دفعتاً اسے پھانک کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا..... ایک لمبی سی کھلی ہوئی کار پھانک
برآمد ہو رہی تھی..... اگلی سیٹ پر ڈرائیور تھا اور پچھلی سیٹ پر؟ حمید کی کھوپڑی ناچ گئی۔
اگر دوسری بار آنکھ مل کر دیکھنے کا موقع ہوتا تو حمید یہ بھی کر گذرتا۔ خدشہ تھا کہ وہ آگ
ہی ملتا رہ جائے گا اور گاڑی کہیں کی کہیں جا پہنچے گی۔
وہ شہزادی دردانہ تھی یا قلندر کی سیکریٹری سائرہ عبدالغفور..... گاڑی اُس کے ز

ہی سے گذر گئی۔ سائرہ نے اس کی طرف دیکھا تھا اور منہ پھیر لیا تھا۔ حمید نے محسوس کیا
اس نے دردانہ یا سائرہ سے نظر ملتے ہی اُس کی آنکھوں میں شناسائی کے اعتراف کی
دیکھی ہو۔



اُس نے پر معنی انداز میں سر کو جنبش دی اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔
ٹیکسی نظر آجائے۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ شہزادی دردانہ کی گاڑی نکلی چلی گئی۔
”لا حول ولا قوۃ.....!“ وہ بڑبڑایا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سڑک پر آیا جہاں
دوا فروشوں کی دوکانیں تھیں۔

ایک دوکان میں داخل ہو کر کاؤنٹر کلرک سے فون استعمال کرنے کی اجازت مانگی

شام بڑی سستی خیر ثابت ہوئی تھی۔ لیکن گھر سے باہر نکلتے ہی پہلا ذہنی جھٹکا اب بھی
اس کے اعصاب پر اپنی پر چھائیں ڈال رہا تھا..... اور وہ جھٹکا نتیجہ تھا کیپٹن حمید سے غیر متوقع
طور پر ملے بھڑ ہو جانے کا۔

اور اتنے بھر سوچتی رہی تھی کیا اس نے اُسے نہ پہچانا ہو گا..... کیا وہاں اُس کی موجودگی

”لو اور لچر.....!“ حمید نے کہا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوا بولا۔ ”ڈھنگ کے
بھی نہیں دکھائی دیتے..... ہم یہاں کیا کریں گے..... اور تم یہاں قیام کرنے کو بھی
ہرے ہو۔“

”حضور والا..... اس سے بہتر جگہ یہاں نہ مل سکے گی۔“
”نہر ہم یہاں آئے ہی کیوں تھے؟“ حمید نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔
”سرکار..... میری حماقت کی وجہ سے..... معافی چاہتا ہوں۔“

”خیر..... اب یہاں ایسی خاتون کو بھی تلاش کرو جن کی رنگوں میں شاہی خون دوڑ
ہو۔“

”مل جائیں گی حضور.....!“ بوڑھا آدمی ہاتھ باندھ کر بولا۔
”کہاں سے مل جائیں گی۔“

”وہ جو یہاں ٹیلی فون آپریٹر ہیں نا..... کہہ رہی تھیں کہ میں نواب دلدار جنگ بہادر
کی بیٹی ہوں..... وقت کی بات ہے کہ یہاں نظر آرہی ہوں..... ورنہ میری مگنی تو
نواب عبدالقدوس والی ریاست چمن جمند اسے ہوئی تھی۔“

”اگرے..... وہ بھی کوئی ریاست ہے..... وہ بھی کوئی شہزادہ ہے..... صورت ہی
کے کیڈ کا ٹشیل کی اولاد معلوم ہوتا ہے..... خیر اب یہاں کوئی خالی میز تلاش کرو۔“

”حضور والا..... ہم دیر سے پہنچے..... کوئی میز خالی نہیں ہے۔“
”ہائیں تو کیا کوئی میز مخصوص نہیں کرائی تھی۔“

”حضور ہم تو ابھی تاجکستان کے دورے سے واپس آئے ہیں..... کچھ ہی دیر پہلے کی
تہ ہے..... ایسی صورت میں حضور..... بھلا..... غور فرمائیے۔“

”غور بھی تم ہی فرماؤ ہماری طرف سے..... ہمارے پاس ان فضولیات کے لئے وقت
نہیں۔“

”حضور غور کر لیا.....!“

”یکو.....!“

”حضور بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اس وقت صرف آرام فرمائیں گے۔“

محض اتفاق پر مبنی تھی؟ کیا وہ سب کچھ جانتا ہے؟ اور جانتا ہو گا؟ خفیہ پولیس والوں نے
تو شیطان پھونک جاتا ہے..... انہیں ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ اگر نہ ہو جائے
سو سائنٹی مجرموں کا اکھاڑہ بن کر رہ جائے؟ لیکن آخر اُسے کس بات کا خوف ہے.....
کسی نیک مقصد ہی کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ قانون کو دھوکا دینا
نہیں ہے..... اونہہ ہو گا..... وہ اتنی اچھی تفریح برباد کیوں کرے..... زندگی میں
اس کے خواب پورے ہو رہے تھے۔

ہو ٹیل مونا کو جیسی شاندار جگہ تھی..... ریکریشن ہال میں ہلکی اور خواب انگیز
لہریں لے رہی تھی۔

یہاں رقص گاہ کی چاروں اطراف میں گیلریاں تھیں..... ایک گیلری میں آ
بیٹھتا تھا اور بار تھی..... تین گیلریوں میں رقصوں کے لئے میزیں تھیں۔

وہ اپنی میز پر تنہا تھی اور پیچھے مسلح باڈی گارڈ کھڑا تھا..... یہ آدمی بیک وقت دو
انجام دیتا تھا۔ ڈرائیور بھی تھا اور باڈی گارڈ بھی۔ کچھ دیر بعد رقص شروع ہو گیا۔
غالباً اس سے بھی رقص کرنے کی درخواست لے کر آگے بڑھے تھے لیکن باڈی گارڈ
ہولسر اور کارتوسوں کی پٹی پر نظر پڑتے ہی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی۔
اُسے ناچنا نہیں آتا تھا۔

پھر وہ رقص دیکھنے میں محو ہو گئی..... اسکے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس قسم کے
کے اس نے خواب دیکھے۔ کتابوں میں اُن سے متعلق پڑھا تھا۔ لیکن جیتا جاگتا تجربہ اس
پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

پہلا راؤنڈ ختم ہونے کے بعد اُس نے کافی طلب کی اور باڈی گارڈ آگے بڑھ کر اس
لئے کافی بنانے لگا۔ ٹھیک اسی وقت بائیں جانب سے ایک جانی پیمانی سی آواز
”سیکریٹری..... تم بالکل گدھے ہو..... کیا یہ ہو ٹیل ہمارے معیار سے مطابقت رکھتا ہے
وہ چونک کر مڑی۔ قریب ہی کیپٹن حمید کھڑا ایک معمر اور باریش آدمی پر بگڑ رہا تھا۔
”حضور عالی.....!“ بوڑھا نہایت ادب سے بولا۔ ”یہ یہاں کا سب سے“

ہو ٹیل ہے۔“

”ٹھیک ہے..... استراحت گاہ میں چن چن کی مگتیر.....!“

”حضور حضور..... مطمئن رہیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اتنے میں دوسرے راؤنڈ کے لئے موسیقی شروع ہو گئی اور ایک جیت امر صحت مند لڑکی اُن کے قریب سے گزری۔

سارہ نے دیکھا۔ حمید نے جھک کر آہستہ سے کچھ کہا..... وہ چلتے چلتے رک پڑ گھور کر دیکھا پھر مسکرائی اور حمید کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے..... حمید نے اس پکڑے اور رقصوں کی بھڑ میں شامل ہو گیا۔

سارہ کو ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ تیرتا ہوا رقص کے فرش پر چلا گیا ہو..... ہر آنکھیں انہی دونوں کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

حمید کے ہونٹ مل رہے تھے اور لڑکی متواتر ہنسنے جاری تھی۔ کبھی کبھی وہ منہ اٹھا کر انکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی۔ پتہ نہیں کیوں سارہ کو اس لڑکی پر بے حد تھکا۔ چڑھی بیٹھی ہے خرازاوی..... کوئی کمانے کھانے والی حرافہ ہوگی اور حضرت سو جھی تھی۔ قلندر نے شاید ان کے متعلق ٹھیک ہی کہا تھا..... قلندر کا بھی کچھ نہیں..... اگر کوئی الٹی سیدھی بات ہوئی تو کون سنبھالے گا۔ سارہ کی پیشانی پر بوندیں پھوٹتی رہیں۔

وہ مسلسل سوچے جاری تھی..... یہ کیسا بہروپ ہے کیا اس نے اُسے چلا کوشش کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں کے نواب زادے ہی تو ہوں۔ اونہہ اُسے تو قلندر کی ہدایت کے مطابق یہ تو ظاہر ہی نہ ہونے دے گی کہ اُسے پہلے بھی کچھ ہے..... اگر گفتگو کی نوبت آئی تو صاف کہہ دے گی کہ وہ اُسے پہچانتی تک نہیں۔ آخر یہ خود کس چکر میں ہے..... ایک بار حمید نے ناچتے ناچتے اپنی ہم رقص کو اس بازوؤں میں اٹھالیا کہ اس کے پیر فرش سے تقریباً ایک فٹ اونچے اٹھ گئے۔ لیکن یہی رہی۔

کمال ہے۔ سارہ نے سوچا۔ کیا بے حیائی ہے؟ سینکڑوں کے مجمع میں ایسی حرکتیں سب اندھے ہوں۔ یا ان پر نیند طاری ہو۔ یہاں کسی کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا۔

سازوں کی لے پر ادھر ادھر ٹھسکتے پھر رہے ہیں۔ کیا مشکل ہے۔ وہ اس طرح ناچ سکتی ہے..... ناچ سکتی ہے..... خود وہ چونک پڑی۔ بھلا خود کیونکر ناچے قدم کیسے اٹھیں گے۔

کبھی نہیں..... کبھی نہیں۔ اس سے ایسی بے حیائی ہرگز نہ سرزد ہو سکے گی۔ اُس کے ہاتھ بڑے عالم دین تھے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ مولوی محمد دین مرحوم کی پوتی ہے۔ ننگ خدا محفوظ رکھے۔

موسیقی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ رقصوں پر دیوانگی سی طاری تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گوشت کے بے شمار قد آدم لو تھڑے چاروں طرف تھرکتے پھر رہے ہوں۔ کچھ بچے سمجھے بغیر۔ بالکل بے روح..... اور مشینی طور پر حرکت کرتے ہوئے لو تھڑے ذرا ہی کی دیر میں اُسے اُن سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ لیکن وہ یہاں سے جا نہیں سکتی تھی۔ قلندر کا حکم تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے نہ اٹھے۔ رات کا کھانا بھی یہیں کھایا تھا۔ ابھی تو نوی بجے تھے۔ رقص نقطہ عروج پر پہنچ کر ختم کیا..... بوڑھے آدمی کو حمید نے جہاں چھوڑا تھا وہاں بھی نظر آ رہا تھا۔

رقص جوڑے گیلریوں کی طرف واپس آ رہے تھے..... حمید اور اس کی ہم رقص اس طرف آتے دکھائی دیئے جہاں بوڑھا سیکریٹری ان کا منتظر تھا۔

حمید نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”اے سیکریٹری تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

بوڑھا آدمی کسی قدر خم ہو کر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

”یہ کون ہے؟“ ہم رقص لڑکی نے پوچھا۔

”ہمارا سیکریٹری۔“

لڑکی ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ”کیا کوئی لڑکی نہیں ملی تھی۔“

”ہمارے والد حضور پسند نہیں فرماتے۔“

”تم بھی ڈانڈی رکھ لو..... ڈیڑ نواب زادہ۔“

”مگر کو پہنچ کر ہم بھی رکھ لیں گے..... ابھی تو امید ہے کہ ہزاروں لڑکیاں ہماری طرف آئیں گی..... ہاں تو تم کہاں بیٹھی ہو۔“

”ہونہہ..... ہم سیانی آدمی ہیں..... آج یہاں کل وہاں۔“
 ”کلی کسی اور سے باتیں بنا رہے ہو گے۔“
 ”ضروری نہیں..... ابھی ہم یہاں کئی دن ٹھہریں گے۔“
 ”یہیں ٹھہرے ہو.....!“
 ”ہاں..... ہاں..... بالکل۔“
 ”کس نمبر میں!“

”ہمارا سیکریٹری جانتا ہوگا..... سب کچھ وہی جانتا ہے..... حتیٰ کہ یہ بھی جانتا ہے ہم
 بربط فرمائیں گے..... تم کیا پیو گی۔“
 ”بوربن.....!“

”خدا کی پناہ..... ہم سمجھتے تھے کہ لڑکیاں صرف شیریں اور پورٹ پیتی ہیں۔“
 ”اب سے بیس سال پہلے کی لڑکیاں پیتی رہی ہوں گی..... ہمیں تو تیز سے تیز شراب
 پانی.....“
 ”کیوں؟“

”تاکہ ہمیں اپنا ماضی یاد نہ آ سکے..... اور ہم آنکھیں بند کر کے ترقی کی شاہراہ پر چلتے
 رہیں۔“
 ”جھومتے ہوئے.....!“ حمید نے نکلڑا لگایا۔

”جو کچھ بھی ہو..... ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتیں۔“
 ”ورنہ بھڑکی ہو جاؤ گی۔“

”وہ ہنسے گی۔“ حمید نے کہا۔ ”چلو ڈانگ ہال میں تمہیں بوربن پلاؤں گا..... یہاں کی
 نظامیں دم گھٹ رہا ہے..... یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم شرافت کے پردے میں شکار نہیں
 مینٹیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کچھ نہیں آؤ اٹھو.....“ حمید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

پھر سارہ نے نکمھیوں سے دیکھا کہ وہ صدر دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔

”اُدھر.....!“ لڑکی نے سارہ کی پشت والی میز کی طرف اشارہ کیا اور حمید سارہ
 دیکھتا ہوا اسی کی میز کی جانب بڑھ گیا۔

سارہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی..... اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خود اس
 جسم کا کوئی حصہ کھل گیا ہو جسے ڈھانپنے کے لئے اُسے کوئی چیز نہ مل رہی ہو۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ ان کی آوازیں ملانے
 رہی تھی کیونکہ دونوں میزوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

”تم مجھے یو قوف نہیں بنا رہے۔“ اُس نے لڑکی کو کہتے سنا۔

”کس سلسلے میں.....!“ حمید کی آواز آئی۔

”اسی نواب زادگی کے سلسلے میں۔“

”ہم بُرا نہیں جانتے..... پیٹ پالنے کے لئے آدمی کو ہزاروں بہروپ بھرنے پڑے
 ہیں اور کبھی کبھی جب یہ بہروپ قانون سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر وہ
 بہروپ نہیں رہ جاتے۔ انہیں مختلف قسم کے جرائم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے.....
 سمجھیں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”نہ سمجھو..... یہی بہتر ہے..... سمجھنے والے فاتے کرتے ہیں اور ایڑیاں رگڑا
 دیتے۔“

مر جاتے ہیں۔“

سارہ کا کلیجہ خون ہو گیا۔ کیپٹن حمید ابھی تک اُسے ایک شریف لڑکی سمجھتا رہا تھا۔
 اس روپ میں دیکھ کر طنز کے تیر چلا رہا تھا..... اونچی آواز میں گفتگو کر کے یہ سب کچھ
 ہی سنا رہا ہے..... وہ کیا کرے..... کیا کرے۔

ایک بار پھر پسینے کی بوندیں اُس کی پیشانی پر جھلملانے لگیں..... دل کی دھڑکن کچھ
 بڑھ گئی..... وہ کیا کرے..... کیا کرے؟

لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔“

”مجھ سے مل کر خوشی ہوئی یا نہیں۔“

”دو چار دن روزانہ ملو..... پھر بتاؤں گی؟“

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ دل بھرا آ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو..... جرم میں ملوث ہو رہی ہے۔ آخر قلندر نے کیسا پتھر چلایا ہے..... اُس کا کیا انجام ہو گا۔

کلب قائم کئے جاتے..... اچھے اچھے ہوٹل ہوتے اور آس پاس کے علاقے دیران نہ بن جاتے۔ لیکن پچھلے سال سے یہاں کی اکثر راتیں اپنا سناٹا کھو بیٹھیں۔ فضا میں فائروں کی آوازیں نہیں جن میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی شامل ہوتیں۔ کبھی کبھی ایسی چیخیں سنی جاتی تھیں جو کوئی گولی کھا کر گرا ہو اور دم توڑ رہا ہو۔

جھیل پر ہنگامہ

بڑی گہری تاریکی تھی۔ قمری مینے کی آخری راتیں تھیں اور مطلع بھی صاف نہیں تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ بھائی دیتا۔

شیطانی جھیل پر تو گویا خبیث روحیں منڈلا رہی تھیں..... یہ جھیل جزیرے کے وسط میں واقع تھی..... اس کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں..... اور پانی میں بھی جگہ جگہ چٹانیں ابھری نظر آتیں.....

یہ جھیل بھی عجیب تھی اور پہاڑیاں بھی حیرت انگیز تھیں..... خود بخود ان میں دریا پڑتیں۔ پتھروں کے بڑے بڑے ٹوٹے اور ٹڑھکتے ہوئے جھیل میں آ پڑتے۔ شائد مناسبت سے شیطانی جھیل کہلانے لگی تھی۔ ورنہ اس سے کسی قسم کی آسپسی کہانی منسوب نہیں تھی..... بعض جگہوں پر تو اس کی گہرائی کا اندازہ بھی تک نہیں کیا جاسکا تھا۔

اس میں پانی گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے ایک مصنوعی نہر کے ذریعے مل سے ملادیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بحری فوج کی بعض ضروریات کی بناء پر کیا گیا تھا ورنہ عام حالات میں تو اس کا وجود ہی فضول تھا۔ کشتی رانی تک نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ پہاڑیوں سے ٹوٹ کر گرنے والے پتھروں کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔

اسے تفریح گاہ بنانے کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا..... اگر پہاڑیوں میں چٹنے رہنے کی عیب نہ ہوتا تو شاید یہ جگہ بہترین تفریح گاہوں میں شمار ہوتی۔

اس کے کنارے پر خوشنماہالی ڈے کیپس کا قیام عمل میں آتا..... تیراکی اور سٹی

پر جب سکون ہو جاتا تو پولیس کی گاڑیاں اور بحری فوج کی لائیں دوڑنے لگتیں۔ بے رحمی کا رتوس ادھر ادھر پڑے ملتے لیکن ایک شخص بھی ایسا نہ ملتا جس پر اُن ہنگاموں کا ام ٹانگہ کیا جاسکتا۔ البتہ لاشیں کئی بار مل چکی تھیں۔ لیکن مرنے والے کم از کم نومی چار کے نہ ہوتے آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ اندھیرے میں فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی پتھر پہاڑیوں سے لڑھکتا ہوا پانی میں جا پڑتا اور اُس کی گرجدار آواز فائروں کا آواز پر حاوی ہو جاتی۔

اندھیرے میں گولی کون کھاتا۔ حالانکہ نومی چار پولیس اسٹیشن پر اس کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ فریدی اس وقت وہیں موجود تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کی فرمائش پر کچھ پرانے فائل ڈھونڈے تھے..... اور مردہ خانے میں ایک لاش بھی پڑی ہوئی تھی۔ لاش تھی فومان کے اُس گر کے کی جس نے کیشین حمید اور آنا گریس کو ہوٹل مونا کو اپنے ساتھ زبردستی لے جانا چاہا تھا۔

لاش فومان کے کاسینو کے ایک ایسے گودام سے برآمد ہوئی تھی جو عموماً بندی رہتا تھا۔ اسے کولنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ اُس کے اندر سے سڑے ہوئے گوشت کی بو کے پھلکے نکل رہے تھے۔ لاش پوری طرح خراب ہو چکی تھی کئی دن کی معلوم ہوتی تھی۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا.....!“ سپرنٹنڈنٹ بڑبڑایا۔ ”بھلا آپ کے کیس سے اس کا کیا نکلے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قاسم کے اغواء میں فومان کا ہاتھ ہو گا۔“

”تاہم کن تو نہیں ہے؟“

”میں فومان کو اچھی طرح جانتا ہوں..... وہ ایسی حرکتیں نہیں کرتا۔“

”میں کچھ دیر بعد آپ کو یقین دلانے میں کامیاب ہو سکوں گا۔“ فریدی گھڑی پر نظر

ڈالتا ہوا بولا۔ ”جسے میں نے بلوایا ہے..... وہ شاید تھوڑی دیر بعد یہاں پہنچ جائے۔“

میری وجہ سے اپنا وقت ضائع نہ کریں..... اگر جھیل کی طرف جانا چاہتے ہوں.....

”جہنم میں جائے۔“ پرنسٹنٹ نے برا سامنے بنا کر فریدی کی بات کاٹ دی۔

تو سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے پچھلے سال سے ہو رہا ہے..... اندھیرے میں گولیاں پلے

مجرموں میں تمیز نہیں کر سکتیں۔“

”پچھلے ایک سال سے۔“

”جی ہاں.....!“

”واقعی میں بہت بد قسمت ہوں کہ اب تک اس حیرت انگیز جزیرے کی سرے

رہا تھا۔“ فریدی سگار کا گوشہ توڑتا ہوا مسکرایا۔

”کبھی کبھی لاشیں بھی ملتی ہیں۔“

”اس کے باوجود مجرم ابھی تک پردے میں ہیں۔“

”جناب..... پورا جزیرہ چھان مارا جاتا ہے جب بھی کوئی لاش ملتی ہے۔ لیکن اس

شناخت نہیں ہو پاتی..... وہ مقامی لوگ نہیں ہوتے۔“

”خیر.....!“ فریدی سگار سلگا کر بولا۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کے

معاملات ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا.....!“

فریدی نے کچھ کہتے کہتے رک کر پھر گھڑی دیکھی اور بڑبڑایا۔ ”اب تک پہنچ جاتا

تھا۔“

”کس کو آتا ہے..... کہاں سے آتا ہے۔“

”ففتھ آئی لینڈ سے۔“

”ایور یڈی سروس کا اسٹیئر تو آگیا ہو گا.....“ ایس پی نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے

دفعہً اُردلی نے کمرے میں داخل ہو کر فریدی کو کسی کا کارڈ دیا۔

”اندھ لے آؤ۔“ فریدی نے اس سے کہا۔

کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

”آئیے.....“ ڈاکٹر صاحب۔ ”فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”یہ یہاں کے ایس۔ پی منتر

ڈاکٹر شاپور..... ماہر نفسیات..... تشریف رکھے۔ مجھے بے حد افسوس

ڈاکٹر صاحب کہ آپ کو تکلیف دینی پڑی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر شاپور ایس۔ پی سے مصافحہ کر کے بیٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے دو چار

بندوں بھی یہاں آنا تھا۔“

”دراصل ایک لاش کی شناخت کے لئے آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”لاش کی شناخت میں کروں گا.....؟“ ڈاکٹر شاپور نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔ ”بھلا مجھے

لاش سے کیا سروکار.....!“

”آپ کے بتائے ہوئے کچھ حلقے میرے ذہن میں محفوظ تھے..... ایک لاش سامنے

آئی۔ خیال آیا کہ شاید یہ بھی ان میں سے ایک ہو۔“

”اوہ..... تو سر جاوید والا معاملہ ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”بھئی کیا مصیبت ہے..... پتہ نہیں کیا چکر تھا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔

پرنسٹنٹ بھی اُن کے ساتھ مردہ خانے تک آیا..... سڑی ہوئی لاش پر سے چادر

ہٹائی گئی..... ہر چند کہ چہرہ متورم ہو گیا تھا لیکن نظر پڑتے ہی ڈاکٹر شاپور کی زبان سے بے

ممانعت نکلا ”ڈرائیور..... ڈرائیور۔“

”غور سے دیکھ کر بتائیے جناب۔“ ایس۔ پی بولا۔

”جی ہاں..... دیکھ لیا۔“ ڈاکٹر شاپور کا لہجہ ناخوشگوار تھا..... ”آپ کسی دہقان کو

ڈاکٹر کی شناخت میں نہیں لائے ہیں۔ میں اس بد بو میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”آئیے۔“

”وہ ایسی کے لئے مڑ گئے۔“

انس۔ پی کے آفس میں پہنچ کر فریدی نے ڈاکٹر شاپور سے پوچھا۔

”تو یہی آدمی آپ کو ہوٹل سے سر جاوید کے مکان تک لے جاتا تھا۔“

”جی ہاں..... بالکل یہی اس میں شے کی گنجائش نہیں۔“

”اب..... بلوایے..... فومان کو۔“ فریدی نے ایس پی سے کہا۔

ایس پی نے اردلی کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ ویسے اس کے انداز سے ملازم ہو رہا تھا جیسے یہ ساری کاروائی طبیعت پر گراں گذر رہی ہو۔

تھوڑی دیر بعد فومان دفتر میں داخل ہوا۔ غالباً اسے پہلے ہی سے کسی دوسرے کمر بٹھایا گیا تھا۔ وہ آتے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”شناخت ہو گئی.....!“ فریدی پر سکون لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب.....!“ فومان کی بھنویں چڑھ گئیں۔

”یہ آدمی جس کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوئی ہے سر جاوید کے ڈرائیور کی بیڑے سے ڈاکٹر شاپور کو اس کے گھر لے جاتا رہا تھا۔“

فومان نے ڈاکٹر شاپور کی طرف دیکھا جو اثبات میں سر ہل رہا تھا۔

”یہ کب کی بات ہے۔“ فومان نے اُس سے پوچھا۔

”پندرہ بیس دن قبل کی۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو.....!“ فومان نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی ”لیکن

پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ بیس دن پہلے وہ چھٹی پر گیا تھا۔ چار دن ہوئے دایرہ تھا۔“

”کیا اس نے چھٹی کا زمانہ یہیں گزارا تھا.....؟“

”میں نے کہہ دیا تاکہ اگر گزارا بھی ہو تو مجھ پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔“

”پر تھا..... کاسینو کے باہر کوئی کیا کرتا ہے اس سے مجھے نہ تو دلچسپی ہے اور نہ اُس کا نام ہو۔“

”لیکن لاش تو کاسینو ہی سے برآمد ہوئی ہے۔“

”یہ میرے کسی دشمن کی حرکت ہے..... ایس۔ پی صاحب مجھے اچھی طرح

ہیں۔ اگر اُس کے قتل میں میرا ہاتھ ہو تا تو اس کی لاش کو چھاتی پر نہ باندھے پھر تال

ہڈیوں کا سراغ ملنا بھی محال ہوتا۔ سمجھے جناب۔“ وہ فخریہ انداز میں ایس۔ پی کی طرف

ہوا پھر فریدی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو اپنے کسی دشمن کی نشاندہی کرو۔“

”ہو سکتا ہے میرے آدمیوں ہی میں سے کوئی میرا دشمن ہو گیا ہو.....!“

”کسی پر شبہ ظاہر کرو۔“

”میں شبہ ظاہر نہ کر سکوں گا..... بظاہر تو کبھی میرے وفادار ہیں..... لیکن یہ بھی

مکن نہیں کہ کوئی میرے خلاف کوئی خلش دل میں نہ رکھتا ہو۔“

”مجھے یقین ہے کہ تمہارے سب آدمی وفادار ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی تمہارے

لاف کسی قسم کی خلش نہیں رکھتا۔“

”تو پھر میں کس کا نام لوں.....!“

فریدی اس کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔ ”پیڈرو کا نام نہیں لو گے۔“

یہ الفاظ تھے یا راقص کی گولی۔ دوسرے ہی لمحے میں ایسا معلوم ہوا جیسے فومان کا جسم

دراے خالی ہو۔ اتنی تیزی سے چہرے پر مردنی چھائی تھی کہ خود فریدی متحیر ہوئے بغیر نہ

رہا۔ ویسے یہ الفاظ اتنی آہستگی سے کہے گئے تھے کہ فومان کے علاوہ اور کوئی نہیں سن سکا تھا۔

البتہ کمرے کے دوسرے لوگ بھی فومان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کی

حالت ہی اتنی تیزی سے بدلی تھی۔ پلکیں جھپکائے بغیر خلاء میں گھورے جا رہا تھا۔

”دو منٹ تک یہی کیفیت رہی۔ کمرے کی فضا پر سکوت طاری تھا۔ دفعتاً کسی کو کھانسی

آئی..... اور فومان بھی چونک پڑا۔“

پھر اس نے سہمی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور کرسی کی پشت سے ٹک کر

ٹنگ ہو نٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

فریدی اٹھتا ہوا ایس۔ پی سے بولا۔ ”بہت بہت شکریہ چوہان صاحب! اب اجازت

لیجئے۔“ چوہان ہکا بکا کبھی فریدی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی فومان کی طرف..... اس نے کچھ

کچھ فریدی سے مصافحہ بھی کیا۔ فریدی ڈاکٹر شاپور سمیت رخصت بھی ہو گیا لیکن وہ

تعمیر انداز میں فومان ہی کو گھورے جا رہا تھا۔

بلآخر کھار کر فومان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”بولا۔ ”دو..... کتنے غوطے لگائے ہیں آج۔“
”مجھے کیا..... لگائے ہوں گے۔“

”ارے واہ..... کوئی میں کسی کے باپ کا نوکر ہوں..... تمہارے ہی کہنے سے تو لگا رہا
ہوں۔ اور اب تو یہ بھی پوچھوں گا کہ مجھ سے غوطے کیوں لگوائے جاتے ہیں؟“
”ہم کہ تمہاری یادداشت واپس آ سکے..... تم بہت اچھے غوطہ خور تھے۔“

”تو یہ سب کچھ سالی یادداشت کے لئے ہو رہا ہے..... یہ بھی جو سالی کئی لوٹیاں
رہنے چھڑتی ہیں..... اور یہ کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہو۔“
”ارے خاموش! آہستہ بولو۔“ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”کہیں تمہارے پیپا
نہ لیا تو۔“

”تم بھی کھاموش رہو۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔ ”پیپا ٹپا کی بات نہ کیا کرو میرے
بائے۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں..... اگر ان کے سامنے تم نے کوئی ایسی ویسی بات کر دی تو تمہیں
ٹی لگی مالدیں گے اور مجھے بھی۔“

”ارے جاؤ..... ماردی گولی..... چٹنی بنا کر رکھ دوں گا..... میں تو قہتا ہوں سالے کو
برے دو اور نقل چلو میرے ساتھ..... میں بھی گریب آدمی نہیں ہوں۔“

”منور..... منور..... تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”میرا نام قاسم ہے..... ہاں..... اب اس سالے منور کا پیچھا چھوڑ دو..... اکیلے میں
قاسم کہا کرو۔“

”اچھا اب کہا کروں گی..... لیکن تم میرا کہنا بالکل نہیں مانتے۔“
”کیا نہیں مانتا۔“

”میں کہتی ہوں اپنے پیپا سے بحث نہ کیا کرو..... لیکن تم نہیں جانتے۔“
”اور کچھ کہہ کر دیکھو..... مانتا ہوں یا نہیں۔“

”آخر کیوں بحث کرتے ہو۔“
”جملن گتی ہے اس کی باتوں سے..... بالکل چلک ہے سا.....!“

”نک..... کچھ نہیں..... پانی..... ذرا پانی منگوا دیجئے۔“
”کیا اس نے تمہیں کسی قسم کی دھمکی دی تھی۔“

”فوان زبردستی ہنس کر بولا۔ ”دھمکی مجھے..... بھلا مجھے کوئی کیا دھمکی دے گا.....
تو سمجھتا ہوں کہ نوی چار کے حاکم صرف آپ ہیں۔“
”نہیں اگر کوئی بات ہو تو بتاؤ۔“

”ارے نہیں..... بالکل نہیں..... اپنے اس آدمی کی موت پر مجھے گہرا صدمہ ہوا ہے۔“



قاسم بُری طرح ہانپ رہا تھا اور لیڈی جاوید تو لے سے اُس کا جسم خشک کر رہی تھی۔
ڈیرینک گاؤن اٹھاتی ہوئی بولی۔ ”پہن لو جلدی سے ورنہ ہوا لگ جائے گی۔“

”کہاں ہے..... وہ سالامیر والد صاحب..... بلاؤ اُسے..... قہتا تھا کہ میں غوطہ لگا
ہی نہیں سکتا.....!“ قاسم ہانپتا ہوا بولا۔

”ارے..... ارے..... خاموش رہو..... کیسی بے ٹکی باتیں کر رہے.....!“

”آئے ہائے۔“ قاسم جل کر ہاتھ نچاتا ہوا بولا۔ ”تو کیا بچ مچ والد صاحب ہی سمجھ لوں۔“

”تم نے پھر فضول باتیں شروع کر دیں..... جاؤ نہیں بولتی۔“

”ارے نہیں..... تم جردور بولو..... الا قسم ساری زندگی اسی طرح غائب رہوں گا

تمہارے لئے۔ ٹھیکے پر گئے میرے اصلی والد صاحب بھی..... ہاں۔“

”نہیں تمہیں میرا ذرہ برابر بھی خیال نہیں۔“ لیڈی جاوید تک کر بولی۔

”لو جرادیکھو..... پھر یہ کس کا خیال ہے کہ بالکل گائب ہو گیا ہوں۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ منہ پھلائے کھڑی رہی۔

قاسم نے ڈیرینک گاؤن پہن لیا تھا اور پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر

”ارے..... ارے..... منور.....!“

”منور سالے کی ایسی کی تھی..... اس نام سے بھی جلن لگتی ہے..... یہ نام باگ.....“

لگتا ہے جیسے کسی مولوی صاحب کو مر غایا دیا گیا ہو۔“

لیڈی جاوید ہنس پڑی اور قاسم نے بھی دانت نکال کر اسے آنکھ ماری۔ دیر تک

رہا..... حالانکہ لیڈی جاوید خاموش ہو چکی تھی۔

”توہ یقین نہیں کرے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ پولیس ہی اس معاملے کے متعلق چھان

ن کرے اور حقیقت سب کے سامنے آجائے۔“

”آپ براہ راست بھی پولیس کو اس سے مطلع کر سکتے ہیں۔“

”بھلا یہاں کی پولیس کو گزران اسٹیٹ کے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب پولیس کو دلچسپی ہی نہیں ہو سکتی تو پھر

نذرانے کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے۔“

”یہ نہ بھولو کہ کیپٹن حمید تمہیں سائرہ عبدالغفور کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب اچانک تم

بڑی دردانہ کے روپ میں اس کے سامنے آؤ گی تو کیا ہو گا۔ کیا یہ ذہنی جھٹکا اسے تم میں

پہچان لینے پر مجبور نہیں کر دے گا۔ اگر تم سے واقف نہ ہو تا اور تم ہزار بار بھی شہزادی دردانہ

نہ اس کے سامنے آتیں تو وہ متوجہ تک نہ ہوتا..... کیا سمجھیں۔“

سائرہ اپنے پاس قلندر بیابانی سے کہہ رہی تھی۔ ”اب مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ میں

نیک کام سے باز آئی۔“

”کیوں کیا ہوا.....؟“

”پچھلی رات سچ کیپٹن حمید سے ملے بھیڑ ہو گئی تھی۔“

”تم نے پہچان لیا تھا اُسے۔“

”کیوں نہ پہچانتی..... وہ میک اپ میں تو نہیں تھا۔“

”کیا تم سے مخاطب ہوا تھا۔“

”نہیں.....!“

”پھر کس بات کی پریشانی ہے۔“

”اس لئے کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے؟ پتہ نہیں کیا سوچتا ہو۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”سوچنے دو.....!“

”یعنی وہ مجھے کسی جرم میں ملوث سمجھتا رہے اور میں فکر نہ کروں۔“

”ہاں..... میں بھی سمجھتا ہوں۔ چو کو نہیں..... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

میں گزران اسٹیٹ کے والی کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں گا کہ شہزادی دردانہ زندہ

قلندر نے قہقہہ لگایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ دوسروں

خیر کر دینے کا خطا میری گھٹی میں پڑا ہے..... اسی لئے تو جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔ ورنہ

وہ کا بالائی تو بن ہی گیا ہوتا۔“

”پتہ نہیں کیوں مجھے وحشت ہوتی ہے۔“

”میرے خدا میں کیا کروں۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگی۔

”میں تمہیں بہت اسامٹ سمجھتا تھا.....“ قلندر نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”نہیں میں اتنی اسامٹ نہیں ہوں جتنی آپ سمجھتے ہیں..... وہ مجھ پر طنز کر رہا تھا۔“

”کیپٹن حمید..... وہ قریب ہی کی میز پر تھا اور اتنی اونچی آواز میں گفتگو کر رہا تھا جیسے

میں ہی شہزادہ ہو۔ سچ کہتی ہوں ایسی باتیں کر رہا تھا کہ میں رات گئے تک روتی رہی ہوں۔“

”اوہ..... کیا کہا تھا۔“

سائرہ یادداشت پر زور دے دے کر حمید کی گفتگو دہراتی رہی جو اُس نے اپنے ساتھی اور

ہر قص سے کی تھی۔

”وہ دوسرا آدمی کون تھا.....؟“

”پتہ نہیں..... گفتگو ایسے ہی انداز میں کر رہا تھا جیسے اس کا ملازم ہو۔“

”قد آور آدمی تھا۔“

”نہیں دبلا پتلا اور متوسط قد والا تھا۔“

”پتہ نہیں..... ہو گا کوئی۔“ قلندر نے شانوں کو جھکاتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال یہ

کہوں گا کہ بد دل ہونے کی ضرورت نہیں..... ہم اپنے نیک مقاصد میں ضرور کامیاب گے۔“

”اچھا..... ایک بات اور.....!“ سارہ نے اس طرح کہا جیسے کوئی اہم بات یاد آگئی

چند لمحے قلندر کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”آج کے اخبار

”جھیل پر پھر وہی پراسرار ہنگامہ“ کی سرخی تھی..... آپ نے یہی تو مجھ سے لکھوایا

آپ کسی سے جھیل اور اس آدمی..... کیا نام تھا..... خیر ہاں تو..... کیا اس ہنگامہ

تعلق.....!“

”ٹھہرو.....!“ قلندر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اگر رہا بھی ہو تو اس کا میری ذات سے

تعلق نہیں ہو سکتا ہے کہ اس پراسرار آدمی پیڈرو سے ان لوگوں کی جھڑپ ہو گئی ہو۔“

”لیکن اخبار میں تو بعض پچھلے ہنگاموں کا بھی تذکرہ تھا جن کی نوعیت کا علم پولیس

تک نہ ہو سکا۔“

”ہو گا.....!“ قلندر جھلا کر بولا۔ ”غیر متعلق باتوں کے لئے میرے پاس وقت

ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ہنگامے کیسے تھے یا حالیہ ہنگامے کی وجہ کیا تھی۔ میں نے تو ان

کو ہر اسماں کرنے کے لئے پیڈرو کا نام بھی لکھوایا تھا۔“

”پیڈرو کون ہے!“

”کوئی خبیث روح جس کے نام سے ان جزائر کے بد معاشوں کا دم نکل جاتا ہے۔“

اب ختم کرو..... ان واقعات کی بناء پر ایک ناول کا پلاٹ بھی مہیا ہو رہا ہے.....

جاؤ..... ہو ٹل مونا کو کے لئے تمہیں تیاری بھی تو کرنی ہوگی۔“

اس کی تصویر

وزیٹنگ کارڈ پر نظر پڑتے ہی فومان نے برا سامنہ بنالیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ملنے سے

بڑ کر دیتا..... ویسے آج اس نے اٹھ کر استقبال کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی تھی.....

پانی کو اشارہ کیا تھا کہ ملاقات کے خواہشمند کو اندر لے آئے۔

کچھ دیر بعد کرل فریدی دفتر میں داخل ہوا۔ فومان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ

بازار کا کسی سے اٹھا ہے۔ ڈھیلے ہاتھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

”تشریف رکھئے۔“

فریدی بیٹھ گیا۔ لیکن کچھ بولا نہیں..... دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے

ہوئے تھے..... آخر کار فومان ہی کو پسپا ہونا پڑا..... اب اس کی نظر فریدی کے داہنے شانے

پر جمی۔

”میں پیڈرو کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کچھ دیر بعد کہا۔

”صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔“ فومان نے

ناگوار جھجھکاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”سنو..... تمہارے آدمی کی لاش کا مسئلہ مقامی پولیس کا معاملہ ہے..... لیکن پیڈرو تم

نشانے کے میرے جھکے کے لئے یہ نام کتنی دلکشی رکھتا ہے۔“

”میں کسی پیڈرو کو نہیں جانتا۔“

”ہم بھی نہیں سنا۔“

”شاید میرے سارے ملازمین اس نام سے ناواقف ہوں۔“

”تو پھر.....!“

”کسی کا نام جاننے سے یہ تو نہیں ثابت ہو سکتا کہ اس کی شکل بھی دیکھی جا چکی ہے۔“
 ”نہیں جانتا کہ پیڑوں کی نقاب کے پیچھے کس کا چہرہ ہے۔“
 ”کاروبار کے متعلق تو جانتے ہی ہو گے۔“

”کون نہیں جانتا کہ اس نام کے تحت اعلیٰ پیمانے پر اسمگلنگ ہوتی ہے۔“
 ”کبھی تم نے اس کے ساتھ شرکت کا بزنس بھی کیا ہے۔“
 ”مجھے کیا ضرورت ہے۔“
 ”اسمگلنگ تو بنائے خاصیت نہیں۔“

”خیر.....!“ فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ ”تم اس کے کارپرداز کا نام بٹے
 نہیں بتانا چاہتے۔“
 ”صاحب خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے..... جو باتیں جانتا ہی نہیں آپ کو کہ
 ”یہ غلط ہے..... ارے صاحب مجھے ضرورت کیا ہے کسی کی شرکت کی..... کرنا
 ”تم پیڑوں کے کارپرداز سے اچھی طرح واقف ہو۔“ فریدی ایک ایک لفظ بڑا
 ”اچھا صاحب..... واقف ہوں..... نہیں بتاتا..... پھانسی پر چڑھا دیجئے۔“
 ”نومان.....!“

”اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ نومان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
 ”اچھی بات ہے.....!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”ایک دن تم بھی غائب ہو جاؤ گے۔“
 ”کئی دن بعد جب تمہارا کوئی ملازم کسی گوشے میں بدبو محسوس کرے گا..... تب تو میرا
 ”کو اطلاع ملے گی کہ مل فاسٹر بھی چل بسا۔“
 ”وہ تیزی سے دروازے کی طرف مڑ گیا تھا۔“

”ٹھہریئے.....!“ نومان مضطربانہ انداز میں بولا۔ فریدی رک کر مڑا اور نومان
 چہرے پر پھر وہی عین مژدنی دیکھی جیسی ایس۔ پی کے دفتر میں نظر آئی تھی۔
 ہاتھ کے اشارے سے اس نے بیٹھنے کی استدعا کی..... فریدی اُس کے چہرے
 جمائے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ میری لاعلمی میں پیڑوں کے لئے بھی کام کرنے لگا تھا..... بھلا
 ”آپ کے اس بیان کو کیسے غلط سمجھ سکتا ہوں کہ اس نے کسی آدمی کے اغواء میں کسی کی مدد
 ”اور اس کے ڈرائیور کا رول ادا کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کام نکل جانے کے بعد افشائے
 ”خبر کے خدشے کے تحت پیڑوں نے اُسے قتل کر دیا ہو۔“
 ”نومان خاموش ہو گیا اور فریدی کچھ سوچتا ہوا اس طرح سر ہلانے لگا جیسے نومان نے اُسے
 ”ختم کر دیا ہو۔“

”ہی دیر تک نومان کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا..... ویسے فریدی اُسے
 ”نہیں انداز میں دیکھے جا رہا تھا۔“

”آپ آپ..... یقین کیجئے کہ میں اُس کے کسی کارپرداز کو بھی نہیں جانتا۔“
 ”پھر وہ خواہ مخواہ تمہارا دشمن کیوں بن بیٹھا ہے؟“
 ”وہی چار کے قمار خانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے..... اور میری زندگی میں یہ کسی
 ”رج بھی ممکن نہیں ہے۔“

”اسمگلنگ تو بنائے خاصیت نہیں۔“
 ”مجھے اسمگلنگ سے کوئی سروکار نہیں۔“
 ”لیکن میرے جھگے کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق تم دونوں شرکت کا بزنس کرتے تھے
 ”بات پر کھل گئی..... اب تم لوگ پارٹنر کی بجائے ایک دوسرے کے حریف بن بیٹھے ہو۔“

”یہ غلط ہے..... ارے صاحب مجھے ضرورت کیا ہے کسی کی شرکت کی..... کرنا
 ”ہاں تو تمہاری سب کچھ کر سکتا ہوں..... ویسے اس میں شبہ نہیں کہ اس جریرے میں
 ”ملک کے لئے آسانیاں ہی آسانیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ضرورت کیا ہے..... میں اپنے
 ”نومان بزنس سے مطمئن ہوں۔“

”تو پھر اپنے اس آدمی کو کس خانے میں فٹ کرو گے جس کی لاش یہیں کے کسی گودام
 ”سے اُرد ہوئی تھی۔“
 ”میرا خیال ہے کہ وہ میری لاعلمی میں پیڑوں کے لئے بھی کام کرنے لگا تھا..... بھلا
 ”آپ کے اس بیان کو کیسے غلط سمجھ سکتا ہوں کہ اس نے کسی آدمی کے اغواء میں کسی کی مدد
 ”اور اس کے ڈرائیور کا رول ادا کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کام نکل جانے کے بعد افشائے
 ”خبر کے خدشے کے تحت پیڑوں نے اُسے قتل کر دیا ہو۔“

”نومان خاموش ہو گیا اور فریدی کچھ سوچتا ہوا اس طرح سر ہلانے لگا جیسے نومان نے اُسے
 ”ختم کر دیا ہو۔“



”اچھا..... اچھا..... لیکن تم انہیں غلط سمجھی ہو..... میں انہیں کے بلوانے پر یہاں نہیں ہوں۔“

”سراغ رساں.....!“ وہ اچھیل پڑی اور پھر حمید کو اس طرح گھورنے لگی جیسے اچانک اس کے دم نکل آئی ہو۔

کچھ دیر بعد چونکی اور ڈاکٹر شاپور سے پوچھا۔ ”پھر یہ لوگ آپ سے کیا پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔“

”کوئی خاص بات نہیں..... اسی مریض کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سیونٹھ آئی لینڈ میں دیکھا تھا۔“

حمید کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ آخر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سراغ رساں ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں شاعری نہیں کر سکتا۔“

دیرانے سنا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن کچھ بولی نہیں۔

لاٹج حرکت میں آگئی تھی..... شاپور اٹھ کر فریدی کے پاس جا بیٹھا اور یہ دونوں پچھلی نشست پر تہارہ گئے۔

”میرے پیلا اور تمہارے پیلا ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں۔“ حمید نے اس کی طرف ہلک کر آہستہ سے کہا۔

”تمہارے پیلا۔“ ویرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”یہ تمہارے پیلا ہیں۔“

”ہاں.....!“ حمید نے احمقانہ انداز میں سر کو جنبش دی۔

”مت کہو اس کرو.....“ وہ ہنسنے لگی۔ ”زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہو سکتے ہیں۔!“

”یقین کرو..... پیلا ہی ہیں۔ جوان معلوم ہوتے ہیں تو کیا ہوا..... کاٹھی ہی ایسی ہے۔“

جب ٹکڑی ہوئی تھی تو بچے لگتے تھے..... پیدا ہوئے تھے تو گھنٹوں نظر ہی نہیں آئے تھے..... وغیرہ وغیرہ۔“

”شاعری نہیں مسخرے بھی ہو۔“

”شکریہ.....!“

”کب ہم کہاں جا رہے ہیں..... پیلا تو مجھے کچھ بتاتے ہی نہیں..... اب بھی دیکھ لو اس

حمید شدت سے بور ہو رہا تھا..... فریدی نے آنا گریس اور موبلی کو نہ جانے کہاں دیا تھا اور حمید کو مشورہ دیا تھا کہ ہوٹل موناکو میں دوبارہ کمرے حاصل کرے وہیں ہو جائے تاکہ ساڑھ پر نظر رکھے میں آسانی ہو۔ پھر دو دن بعد وہاں سے بھی واپس بلوا لیا اور اب دونوں ساحل کے ایک چھوٹے سے ہٹ میں مقیم تھے..... فریدی زیادہ تر رہتا..... اور چلتے چلتے اس سے کہہ جاتا کہ وہ ہٹ ہی تک محدود رہے..... کہیں جانا ضرورت نہیں۔

آج وہ ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا اور آتے ہی فون پر کسی کے نمبر ڈائل کئے۔

”ہیلو..... بلیک کیٹ تھری تھری فور..... لیس..... اٹ از سپریم.....!“ اُس ماؤتھ پیس میں کہا اور دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر بولا۔ ”موبائل آئیڈیٹی ہا ایکوپنٹ سمیت آج رات کو آٹھ بجے..... عاقل روڈ پر ملو..... اور اینڈ آل..... سلسلہ منقطع کر کے وہ حمید کی طرف مڑا۔

”ہم آج شام کو تھرڈ آئی لینڈ چل رہے ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ اس قسم کی اطلاعات اُسے زہر ہی لگتی تھیں۔

سورج غروب ہوتے ہی وہ گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں فریدی کی لاٹج تھی اور لاٹج پر قدم رکھتے ہی حمید کی باجھیں کھل گئیں..... ڈاکٹر شاپور اور اس کی لڑکی ہی سے لاٹج میں بیٹھے شائد ان کا انتظار کر رہے تھے۔

حمید پر نظر پڑتے ہی دیرا چکی۔ ”اوہ تو یہ بات ہے..... یہ لوگ وہی ہیں..... مجھے پہلے ہی جانی پہچانی سی معلوم ہوئی تھی..... پیلا..... یہ صاحب بڑے اچھے شاعر ہیں۔“

”کیا تم انہیں جانتی ہو.....!“ شاپور نے پوچھا۔

”اوہ..... میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا اُس شریف آدمی کے متعلق جس نے ہمیں

لاٹج پر جڑے تک پہنچایا تھا۔“

وقت معلوم ہوا کہ تم لوگ کون ہو۔“

”میرے پاپا بھی کچھ اسی قسم کے واقع ہوئے ہیں..... بہت دیر بعد اصل مقصد نہ آتے ہیں..... پہلے غلاف سلوائیں گے..... پھر سارنگی خریدیں گے..... پھر کہیں جائیں گے کہ سارنگی پاس رکھنے سے بھوت بھاگتے ہیں۔“

”سارنگی پاس رکھنے سے بھوت بھاگتے ہیں۔“ ویرانے حیرت سے دہرایا۔ ”تم کیسی بچی بہکی باتیں کر رہے ہو۔“

”سنا یہی ہے.....!“

”فضول بکواس کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔“

لاٹچ تیزی سے راستہ طے کر رہی تھی۔ دفعتاً فریدی نے بلند آواز میں کہا۔ ”سیفٹی ماسک نکال لو۔“

حمید نے اپنی پشت کی بغلی الماری کھول کر دو سیفٹی ماسک نکالے اور انہیں جلدی چلائی اس طرح ایڈجسٹ کر لیا کہ ایک دوسرے کی گفتگو انہی تک محدود رہ سکے فریدی یا شاہپور اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکیں۔

کچھ دیر بعد اُس نے پلاسٹک کور کے سرکنے کی آواز سنی اور ویرا کی طرف سیفٹی ماسک بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اے پہن لو..... ورنہ دم گھٹ جائے گا۔“

ویرا اگلی سیٹ والوں کو سیفٹی ماسک پہنے دیکھ رہی تھی۔ اس لئے حیل و حجت کے بغیر انہی نے حمید کی ہدایت پر عمل کیا۔ حمید بھی پہن چکا تھا..... ویرانے حمید کی آواز سنی جو کہ با تھا۔ ”یہ نہ سمجھنا کہ اسے پہن کر گوشتی ہو جاؤ گی..... اور اسے بھی ذہن نشین کر لو کہ ہمارے گفتگو کوئی تیسرا نہ سن سکے گا۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے..... ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ اب منہ بند کر کے بیٹھنا پڑے گا۔ مجھ میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب تک جاگتی رہتی ہوں زبان چلتی رہتی ہے۔“

”تم اسے عیب سمجھتی ہو..... ارے یہ تو شخصیت کی ایک خوبی ہے۔“

”مگر پاپا زیادہ بولنے والوں کو احمق سمجھتے ہیں۔“

”میرے پاپا بھی۔“

”ہیں ختم کرو..... پتہ نہیں کس شریف آدمی کو خواہ مخواہ اپنا پاپا بنا ڈالا ہے۔“

”تم بھی ختم کرو..... کوئی ایجنسی گیت سناؤ مجھے۔“

”حافظ کی غزل کیوں نہ سناؤں..... فارسی اور انگریزی بہت اچھی ہے میری! ایجنسی طرح نہیں بول سکتی۔“

ذرا سی دیر میں وہ پر شور موجوں کے درمیان پہنچ گئے اور حمید مضطربانہ انداز میں

”اوہ..... تم نے سیفٹی بلٹ بھی کس لی ہے یا نہیں۔“

”اتنی احمق نہیں ہوں..... میں جانتی ہوں کہ سیفٹی ماسک کب استعمال کئے جاتے

حمید اپنی سیٹ کی پٹیاں اپنے سینے پر کسے لگا۔

کچھ دیر بعد اُسے دوبارہ ساتویں جزیرے والا سفر یاد آگیا..... لاٹچ پر شور لہروں میں اس کو ہر وہی تھی..... اس نے ویرا کی طرف دیکھا..... لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ بھی

نہ تھی۔ پھر وہ اُن لوگوں کے متعلق سوچنے لگا جن کے خلاف تفتیش جاری تھی..... کیا

اب بھی ان کی نگرانی نہ کر رہے ہوں گے۔ جو سکتا ہے اس وقت بھی تعاقب جاری ہو.....

بالے میں یہیں کچھ شروع ہو جائے تو وہ کسی پوزیشن میں ہوں گے دوسرے ہی لمحے میں وہ

بائے رابطہ قائم کر کے بولا۔ ”کیا ہمارا تعاقب نہ ہو رہا ہو گا؟“

”بہت دیر میں چونکے.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”اور ایسی خطرناک مہم پر یہ لڑکی.....!“

”مجھے علم نہیں تھا کہ یہ بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہو گی..... لہذا عین وقت پر کچھ نہ

..... لیکن تم فکر نہ کرو..... دیکھا جائے گا۔“

پھر حمید نے ویرا سے گفتگو شروع کی۔

”تمہارا یہ سفر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں.....!“ جواب ملا۔

”حافظ تو نہیں ہو۔“

ہر شائد فریدی کے علاوہ سبھی ہنسنے لگے تھے۔ ویسے حمید ڈاکٹر اور ویرا کی آوازوں میں
کی لرزشیں بھی محسوس کر رہا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ بخیر و خوبی تھرڈ آئی لینڈ کے ساحل تک پہنچ گئے۔۔۔۔۔ یہاں سے ایک دین
ایک عمارت میں لے گئی جہاں فریدی کا استقبال ایسے ہی انداز میں ہوا جیسے اس کے علاوہ
کئی کئی لوگ ہوں۔

فریدی نے ڈاکٹر شاپور سے کہا۔ ”میری دانست میں صاحبزادی کو یہیں چھوڑ دیا
..... میں ابھی کہیں اور بھی جانا ہو گا۔“

”لاٹھی کے ذریعے.....!“ ڈاکٹر شاپور نے بوکھلا کر پوچھا۔
”نہیں..... کار ہوگی..... مطمئن رہئے..... اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے
پہلو ہیں سے بذریعہ اسٹیئر ففٹھ آئی لینڈ بھجوا دیا جائے گا۔“

ویرا اسی سفر سے کافی سہمی ہوئی تھی لہذا جب ڈاکٹر نے فریدی کی تجویز پیش کی تو اس
کی اعتراض نہ کیا۔

”آپ کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے تہا رہنا پڑے گا۔“ فریدی نے اُس سے کہا۔ ”اس
سفر میں واپس آجائیں گے۔“

پھر تقریباً پندرہ یا بیس منٹ بعد اس سفر کی دوسری ”قط“ شروع ہو گئی۔ اس بار وہ ایک
نیشنل میں سفر کر رہے تھے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ وہ عاقل روڈ اسی جزیرے میں ہوگی
ایک نئی کاسٹ ایکوپمنٹ سمیت ملنے کے لئے کسی سے فون پر کہا گیا تھا..... آخر
ڈاکٹر شاپور سے کسی کی شناخت کرنا چاہتا ہے۔

نیشنل آبادی سے نکل کر ویرا نے کی طرف جاری تھی۔ روانگی سے قبل فریدی نے
بار کو کچھ ہدایات دی تھیں اور اب یہ سفر خاموشی سے جاری تھا۔

شائد آدھے گھنٹے بعد حمید نے محسوس کیا کہ گاڑی کچے راستے پر مڑ رہی ہے۔
”میں سمجھا تھا شائد یہی عاقل روڈ ہے۔“ حمید نے فریدی سے کہا۔

”یہاں کوئی عاقل روڈ نہیں ہے.....!“ فریدی نے جواب دیا۔
”کیوں.....؟ لیکن آپ نے تو فون پر کسی عاقل روڈ کی کانام لیا تھا۔“

”اگر اکیلے مرنا پڑتا تو ضرور خوف معلوم ہوتا.....“ ویرا بولی۔ ”لیکن یہاں
دوسری ہے۔ تنہا نہیں مرنا پڑے گا۔“

”تو گویا..... تم موت سے نہیں ڈرتی!“ حمید نے پوچھا۔
”اف..... فوہ..... کیا ہو گیا ہے تمہیں..... یہ آخر اچانک موت کیوں ہوا
ہے تمہارے سر پر۔“

”کچھ نہیں..... یونہی.....!“
وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”میں اپنے ڈیڈی سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔“ ویرا نے تھوڑی دیر بعد کہا۔
”ٹھہرو..... میں دیکھتا ہوں.....“ حمید نے کہا اور اس کے سیفٹی ماسک سے
ٹرانسمیشن آپریشن کو اس طرح کر دیا کہ وہ ڈاکٹر سے گفتگو کر سکے..... کچھ دیر بعد وہ
دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

”میں تمہارے لئے پریشان ہوں بے بی۔ تم ڈر تو نہیں رہیں۔“ ڈاکٹر کی آواز۔
”ڈر تو نہیں رہی لیکن تشویش ضرور ہے.....!“ ویرا کی آواز۔

”میں نے شروع ہی سے تمہیں اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اگر یہ
ہوتا کہ یہاں سے تھرڈ آئی لینڈ کے لئے لاٹھی کا سفر ایسا ہو گا تو میں تمہیں نوبی چارٹی میں
دیتا..... یہ کرل فریدی بڑا اندر آدمی ہے..... ادھر کے پانیوں میں لاٹھی لانے کا تصور
کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔“

یہ دوسرا سراغ رساں کہہ رہا ہے کہ سفر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے؟
”اب میں کیا بتاؤں..... تمہاری ضدی طبیعت کے لئے یہ بہترین سبق ثابت ہوگا
ڈاکٹر شاپور کی آواز غصیلی تھی۔

”بھئی آپ لوگ فکر نہ کریں۔“ حمید نے فریدی کو کہتے سنا۔ ”غرق ہو جانے
امکانات تو نہیں ہیں..... ڈاکٹر میرا ساتھی مسخرہ بھی ہے صاحبزادی سے کہہ دیجئے کہ
باتوں پر دھیان نہ دیں۔“

”میں سن رہا ہوں.....“ حمید بول پڑا اور اس نے ویرا کے قبضے کی آواز سنی۔

”سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ عاقل روڈ سے مراد کس جگہ سے ہے۔“
 ”بلیک کیٹ.....!“
 ”ہوں..... خاموش رہو۔“

شیور لٹ ایک تیرہ و تار میدان میں رکی..... قریب ہی ایک دوسری بہت بڑی دکھائی دی..... گاڑی کیا ایسا لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑے ٹرالر کے آگے انجن فٹ کر دیا گیا ہو۔ وہ شیورٹ سے اتر آئے۔

بڑی گاڑی کے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر گاڑی کا پچھلا کھول دیا اور وہ تینوں اندر آئے..... گاڑی ایئر کنڈیشنڈ معلوم ہوتی تھی۔
 ”سب کچھ تیار ہے۔“ فریدی نے اس آدمی سے انگریزی میں پوچھا۔
 ”لیس سر.....!“ جواب ملا۔

”ٹھیک ہے۔“ فریدی رسٹ وایچ پر نظر ڈالتا ہوا حمید اور ڈاکٹر شاہ پور سے بولا۔
 لوگ بیٹھ جائیے۔“

وہ دونوں بیٹھ گئے..... ان کا رخ سامنے لگے ہوئے اسکرین کی طرف تھا۔
 گاڑی میں تو اندھیرا ہو گیا اور اسکرین روشن نظر آنے لگا۔

فریدی کی آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر شاہ پور..... پلیز بی ریڈی۔“
 ”ہاں میں تیار ہوں۔“ ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

حمید کی نظر اسکرین پر تھی۔ دفعتاً ایک چہرے کی آؤٹ لائن نظر آئی جس کے اندر ناک یاد ہانہ نہیں تھے..... ڈاکٹر بولا۔ ”نہیں یہ شیب نہیں تھا۔“

یکے بعد دیگرے کئی چہروں کی آؤٹ لائنیں اسکرین پر نظر آئیں..... آخر کار ایک ڈاکٹر بول اٹھا۔ ”ہاں یہی شیب تھا.....“ اب یہ آؤٹ لائن اسکرین کے ایک گوشے میں ہو گئی۔ پھر اس کے بعد مختلف قسم کی آنکھوں، ناکوں اور دہانوں..... ہیرا اشکال کے جاری رہے..... ڈاکٹر جس نمونے پر صاد کرتا..... اسکرین پر باقی رہ جاتا..... اور سب اس چہرے کی آؤٹ لائن میں فٹ ہوتے نظر آئے جو اسکرین کے ایک گوشے میں ہی سے قائم تھا۔ اب ایک مکمل چہرہ اسکرین پر موجود تھا۔

”اوہ..... اوہ..... کمال ہے۔“ ڈاکٹر مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”بالکل یہی تھا.....“
 رن بائیں جڑے پر زخم کا گہرا داغ نہیں ہے اور سب کچھ وہی ہے۔“
 ”شکریہ ڈاکٹر.....!“ فریدی بولا..... اور پھر آپریٹر سے کہا۔ ”اس چہرے کا فوٹو

راف ایک گھنٹہ کے اندر اندر سیکشن سی میں پہنچا دو۔“
 ”اوکے سر.....!“ آپریٹر نے کہا۔

واپسی اسی گاڑی میں ہوئی تھی جس کے ذریعے یہاں تک آئے تھے۔
 ”بھئی یہ بڑا عجیب و غریب طریقہ ہے۔“ ڈاکٹر شاہ پور نے کہا۔
 ”اس مشین کو آئیڈنٹی کاسٹ کہتے ہیں۔ یہ بجک لائٹس کے اصول کے طرز پر کام میں لائی جاتی ہے۔“

”بڑی کار آمد ایجاد ہے۔“
 ”جی ہاں! اس سے یادداشت کے ذریعے مشتبہ آدمیوں کی تصویر بنانے میں مدد ملتی ہے۔“
 ”اتنی صحیح تصویر.....!“

”یہ بھی محض اتفاق تھا کہ آپ کے فرمانے کے مطابق مکمل چہرہ تیار ہو گیا..... ورنہ ہوائیے ہی چہرے تیار ہوتے ہیں جو اصل آدمی سے کسی قدر مشابہت رکھتے ہوں.....“
 ”حال ہمارے لئے یہ مشابہت ہی کافی ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب آپ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“
 ”اگر وہ یہاں موجود ہو تو۔“
 ”مگر وہ خاموش ہو گئے۔“

اس عمارت میں واپس پہنچ کر انہیں چہرے کے فوٹو گراف کے لئے مختصر رہنا پڑا تھا۔ اس زمانے میں فریدی نے دیر اور ڈاکٹر شاہ پور کے لئے صبح کے اسٹینر پر سیٹیں بک کرادی تھیں اور انہیں ایک ہوٹل میں بھیجوا دیا تھا۔

فوٹو گراف بھی آگیا..... اور حمید نے فریدی سے کہا۔ ”مگر آپ اسے کہاں تلاش کریں گے۔“

”نہری جیب میں رکھا ہوا ہے..... جب چاہوں گا ہتھکڑیاں لگا دوں گا۔“

”تو ختم کیجئے جلدی سے اس قصے کو.....!“

”کہانی لمبی ہے..... آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ چپ چاپ دیکھتے رہو.....“ حیدر نے طویل سانس لی اور پھر کچھ نہیں بولا۔

ٹکراؤ

ہوٹل مونا کو کی تقریحات سائرہ کے لئے سوہان روح بن کر رہ گئی تھیں۔ کئی دنوں سے کیپٹن حمید بھی نہیں دکھائی دیا تھا۔

سائرہ کے لئے وہاں کی تفریح کے ہر شعبے میں میزیں مخصوص کرائی گئی تھیں جن پر تنہا نظر آتی..... پیچھے ایک مسلح باڈی گارڈ کھڑا رہتا۔ یہی باڈی گارڈ ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

تفریح گاہوں میں لوگ اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے لیکن مسلح باڈی گارڈ پر نظر پڑتے ہی ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف آنے کی ہمت نہ کر سکتا۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے وہ سوچ رہی تھی۔ اگر سچ شہزادی ہی ہوتی تو اس کا کیا شہر ہوتا۔ آخر اس قسم کے لوگ زندہ کس طرح رہتے ہیں..... یہ تو قید تہائی ہوئی۔ سزا سزا اچھی خاصی۔ اب کوئی اپنا ہی ہم رتبہ کہاں تلاش کرتا پھرے۔ کسی عورت نے بھی تو اس کی طرف رخ نہیں کیا تھا البتہ وہ اُسے رشک و حسد سے ضرور دیکھتی تھیں۔

آج وہ رات کے کھانے کے بعد سے اب تک ڈائننگ ہال میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ دل ہی نہ چاہا کہ یہاں سے اٹھ کر ریکریشن ہال تک جاتی۔ وہاں تو اور زیادہ وحشت ہوتی تھی۔ یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں کوئی آکر رقص کے لئے درخواست نہ کر بیٹھے۔ اول تو اُسے ناچنا آتا ہی نہ تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی اجنبی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اتنے مجمع میں ناچنا شروع کر دے۔

نیکہ حالانکہ آج ریکریشن ہال میں جرمن ایکروٹیکس اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ ہر بھی اس کا جی نہ چاہا۔ وہیں بیٹھی تھوڑی تھوڑی کافی طلب کرتی رہی۔ دفعتاً ایک قد اتنی چلتے چلتے اس کی میز کی قریب رکاوٹ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سائرہ نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ نظر ملی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ سارا بدن ہلکا ہوا۔ پھر دوبارہ نظر ملانے کی سکت ہی نہ رہ گئی۔ وہ اب بھی وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہے.....؟“ اُس نے اپنے باڈی گارڈ کی غراہٹ سنی۔

”ٹپ اپ.....!“ اُسے جواب ملا۔ لیکن آواز میں جارحانہ انداز تحکم موجود تھا۔

باڈی گارڈ سائرہ کے پیچھے سے ہٹ کر سامنے آگیا۔

”ہولٹر پر سے ہاتھ ہٹاؤ۔“ قد آور آدمی نے کہا..... اس بار بھی لہجے میں تحکم تھا۔

سائرہ نے دیکھا کہ باڈی گارڈ نے بیساختہ اپنا ہاتھ ہولٹر سے ہٹایا ہے۔

”لائسنس دکھاؤ.....!“ اس نے باڈی گارڈ سے کہا۔

”آپ کون ہیں۔“ باڈی گارڈ نے پوچھا۔ اس بار سائرہ نے اس کے لہجے میں ڈھیلا پن محسوس کیا تھا۔

”کیا کوئی عام شہری تم سے لائسنس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔“

باڈی گارڈ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے لائسنس نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔

”ہوں.....!“ وہ لائسنس پر اچھٹی سی نظر ڈالتا ہوا بولا۔ ”ڈرائیو ایک کار تو سبھی دکھانا۔“

”جی..... کیا مطلب.....!“

”کار تو سب.....!“ اس نے کار تو س کی پٹی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“

”ایک کار تو س نکالو.....!“ اس بار سخت لہجے میں کہا گیا۔

باڈی گارڈ نے نمرا سامنے بنا کر ایک کار تو س پٹی سے نکالا اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“

اب وہ اجنبی کار تو س کو الٹ پلٹ کر بغور دیکھ رہا تھا..... اس دوران میں سائرہ کا بلاؤز

پسینے سے بھیگ چکا تھا..... سانسیں گھٹی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ کار تو س غیر قانونی طور پر درآمد کئے گئے ہیں۔“ اس نے کچھ دیر بعد باڈی گارڈز میں نہیں سمجھ سکتا۔

”کیا نہیں سمجھ سکتے۔“

”صاحب..... آپ خواہ مخواہ وقت برباد کر رہے ہیں..... ہم لوگ یہاں کے نہیں ہیں۔“

”خوب..... کس ملک سے تعلق ہے۔“

”گرزان اسٹیٹ۔“

”یہ کہاں.....؟“

سارہ نے محسوس کیا جیسے باڈی گارڈ اس سوال کے جواب کی توقع خود اس سے رکھ رہا ہو۔ لیکن وہ کیا کہتی..... اس کا حلق تو اس طرح خشک ہو رہا تھا جیسے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند کو ترستی آئی ہو..... سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی جیسے زنگ آلود ہو کر رہ گئی تھی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ اجنبی نے باڈی گارڈ کو پھر مخاطب کیا۔

”مجھے اسٹیٹ کے صحیح جغرافیہ کا علم نہیں ہے..... کیونکہ میں ہزہائی نس کے نام سے عموماً باہر ہی باہر رہا ہوں۔“

”کس ہزہائی نس کی بات کر رہے ہو۔“

باڈی گارڈ نے سارہ کی طرف دیکھا۔

”اوہ.....!“ اب اجنبی دوبارہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوا تھا جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔

ٹھیک اسی وقت نہ جانے کدھر سے کیپٹن حمید بھی آچکا اور دونوں کے درمیان ہاتھ ہوتا ہوا اجنبی سے بولا۔ ”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ چلے یہاں سے..... میں نے آپ پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اجنبی کیپٹن حمید کو گھورتا ہوا بولا۔ ”گرزان اسٹیٹ کا وجود

ہے۔“

”میں کہتا ہوں چھوڑیے..... یہی تو کھانے کھینے کے دن ہیں۔“

”ہاموش رہو۔“

”من..... نہیں..... مم..... میری..... بھی سنئے۔“ دفعتاً سارہ ہکلائی..... اُسے دہائی پڑا تھا۔ کیونکہ اس دوران میں اس کی کنپٹیاں چٹختی رہی تھی..... دل بیٹھتا رہا تھا اور وہ لکڑی کرتی رہی تھی جیسے اب دم نکل جائے گا۔

اجنبی اور کیپٹن حمید دونوں ہی سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ پھر ہکلائے۔

”گرزان اسٹیٹ..... کمک..... کہاں ہے..... میں بھی نہیں..... بچ..... جانتی۔“

”ہزہائی نس.....!“ دفعتاً باڈی گارڈ نے خونخوار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ لیکن وہ اس

باب متوجہ ہوئے بغیر کہتی رہی۔ ”مم..... میں تنگ آگئی ہوں..... کمک..... کپتان

ب..... مجھے اس الجھن..... سے نجات دلائیے..... مم..... میں سارہ.....

رہا ہوں۔“

”ہزہائی نس..... آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ یہاں سے چلئے.....“ باڈی

”بچے ہٹ.....!“ فریدی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا۔

پھر اس کا ہاتھ ہولشپر پر آیا ہی تھا کہ فریدی کا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا..... اور وہ

بے حال میز پر الٹ گیا۔

ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے اور بیروں کی فوج ان کی طرف

بڑھ

”جھکریاں لگادو۔“ اجنبی نے کیپٹن حمید سے کہا اور حمید نے بیروں کے قریب پہنچنے

سے قبل اس کے ہاتھوں میں جھکڑیوں کا جوڑا ڈال دیا..... شاید اسی چیز نے بیروں کے قدم

رک دئے اور دوسرے لوگ بھی ان کی طرف بڑھنے سے باز رہے۔ پورے ہال پر سناٹا طاری

فر

دفعتاً ایک بھاری بھر کم قہقہے نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا..... سارہ بوکھلا کر مڑی

مذہب آواز کچھ جانی بیچانی سی معلوم ہوئی تھی۔ قلندر تھوڑے فاصلے پر کھڑا بے تحاشہ ہنس رہا

نہ ہر آگے بڑھ کر اجنبی کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔ ”ہلو کر تل فریدی..... ہاڈی یو

”ہلو.....!“ فریدی کا لہجہ بے حد خشک تھا..... اور سارہ کے اندازہ کے مطابق اس نے ڈھیلے ہاتھ سے مصافحہ کیا تھا۔

”میرا تجربہ بہر حال کامیاب رہا.....“ قلندر نے ہنس کر کہا۔ ”بڑا شاندار ناول کم گا۔“

”خوب.....!“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”لیکن..... آخر اس بیچارے کے ہاتھوں میں جھکڑیاں کیوں ڈال دی ہیں۔“ قلندر باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کے پاس سے اسمگل کئے ہوئے کارٹوس برآمد ہوئے ہیں۔“

”ارے وہ..... وہ اسمگل کئے ہوئے نہیں ہیں۔ پچھلے سال بلجیم سے لایا تھا۔ میرا پاس کسٹم کی رسید موجود ہے..... یہ دیکھئے۔“

اس نے جیب سے پرس نکال کر ایک رسید نکالی اور کرٹل فریدی کی طرف بڑھا: ”اس دشواری کی بناء پر رسید لئے پھر تارہا ہوں جب کرٹل فریدی جیسے آدمی سے ملا ہو تو ہر طرح تیار رہنا پڑتا ہے۔“ فریدی نے حمید کی طرف مڑ کر کہا۔ ”جھکڑیاں نکال دو۔“

باڈی گارڈ کے ہاتھوں سے جھکڑیاں نکال دی گئیں۔

پھر قلندر نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولا۔ ”ہم تماشا بن کر رہ گئے ہیں کیوں کسی جگہ بیٹھ کر ایک دوسرے کی غلط فہمیاں رفع کر لیں۔“

فریدی نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی..... اور حمید نے اوپری ہونٹ کھینچ کر کہا۔ ”نواب زادہ چمدالدولہ اپنے کمروں کی پیش کش کرتا ہے۔“ قلندر نے بڑا سادہ سادہ اس کی طرف دیکھا۔

”ہوں..... اوپر چلو.....!“ فریدی زینوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ پھر وہ سب جگہ کے کمرے میں آئے۔ البتہ باڈی گارڈ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ غالباً قلندر نے اس کے لئے اشارہ کیا تھا۔ فریدی نے بھی شاید اسے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ سارہ کو اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ پتہ نہیں کس دشواری سے زینے

خبر دے کرے تک پہنچی تھی۔

نہوڑی دیر تک وہ سب خاموش بیٹھے کسی ایک کے بولنے کے منتظر رہے۔ پھر قلندر ہی بڑکی۔ وہ یہاں آنے کے بعد سے اب تک کیپٹن حمید ہی کو گھورتا رہا تھا۔

”کیپٹن حمید.....!“ اس نے فریدی کی طرف مڑ کر کہا۔ ”غالباً میری سیکریٹری کو بہت پسند فرمانے لگے ہیں؟“

”جھا تو پھر.....!“ حمید نے نتھنے پھلائے۔

”میں اسے برداشت نہیں کر سکتا؟“ قلندر کرسی کے ہتھ پر گھونسنہ مار کر غرایا۔

”مرضی کے مالک ہو..... برداشت کرو یا نہ کرو۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”براہ کرم اصلی مسئلے کی طرف آئیے۔“ فریدی نے خشک لہجہ میں کہا۔

”میں ایک تجربہ کر رہا تھا۔“

”تجربے کی نوعیت میرے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔“

”ابھی نہیں بتا سکتا..... تجربے کے بہترے پہلو ابھی تشہ ہیں۔“

”قانون کو اس قسم کے ڈراموں سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“

”انجی بات ہے تو چارج فریم کیجئے میزے خلاف.....!“ قلندر نے لاپرواہی سے ان کو جنبش دی۔

”مگر زبان اسٹیٹ کہاں ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”میرے ناول کی ایک خیالی ریاست.....!“

”لیکن آپ مجھ سے کچھ اور کہتے رہے ہیں۔“ دفعۃً سارہ چیخ پڑی۔

”تجربہ ایسا ہی تھا کہ تمہیں بھی اندھیرے میں رکھنا پڑا۔“

”تو وہ ہنگامہ بھی تجربے ہی میں شامل تھا۔“ سارہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیا ہنگامہ.....!“ قلندر کے لہجے میں تحیر تھا..... ”اوہ تم بہت تھک گئی ہو.....“

”انٹال ہے کہ تمہاری موجودگی ضروری بھی نہیں ہے..... تم جا سکتی ہو۔“

سارہ کو اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا نظر آیا تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی

نکال کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکے گی۔

قلندر نے باڈی گاڑڈ کو آواز دی۔ وہ اندر آیا اور اُس نے اُس سے کہا کہ وہ سارے لے جائے۔ حمید نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن سارہ نے دیکھا کہ کرئل فریدی نے اُسے رہنے کا اشارہ کیا ہے۔ وہ اٹھی اور باڈی گاڑڈ کے ساتھ ہوئی۔ باہر گاڑی کھڑی تھی باڈی گاڑڈ نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ لیکن خلاف معمول یہ اگلی سیٹ کا دروازہ تھا سارہ خود ہی بچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔

”آگے بیٹھو۔۔۔۔۔!“ وہ غریبا پہلا موقع تھا کہ اس نے ایسے حکمانہ لہجے میں مخاطب کیا تھا۔ ورنہ اب تک تو یہی ہو رہا تھا کہ وہ بعض اوقات خود کو بچ بچ شہزادی کرنے لگتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کا ایک ادنیٰ غلام معلوم ہوتا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔!“ سارہ کو بھی غصہ آگیا۔

”چلو بیٹھو۔۔۔۔۔!“ باڈی گاڑڈ نے اس کا شانہ پکڑ کر اگلی سیٹ کی طرف دھکا دیا۔ پھر اُسے یاد نہیں کس طرح بیٹھی تھی اور کتنی دیر بعد گاڑی حرکت میں آئی تھی۔ سارا عصابی تشنج تھا جس میں بتلا ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد جب گاڑی بالکل کھلی فضا میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ باڈی گاڑڈ بازو اس کی گردن میں حائل ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ گاڑی کا اسٹیرنگ پکڑے ہوئے سارہ نے دوسری طرف ہٹنا چاہا لیکن گردن کے گرد ڈرائیور کی گرفت مضبوط ہو گئی اور ہی اس نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا۔ ”تمہاری حماقت کی بناء پر پہلی بار میرے ہاتھوں جھکڑیاں پڑ گئی تھیں۔۔۔۔۔ اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

”مجھے چھوڑو۔۔۔۔۔!“ وہ جھلی لیکن بے سود۔ البتہ گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے اشارہ چھوڑ کر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بچھلی سیٹ پر پھینک دیا اور پھر دوسرے نو میں وہ چپخنے لگی ”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔“ وہ حتی الامکان کوشش کر رہی تھی کہ ڈرائیور و حشانیہ پن سے خود کو بچائے رکھے۔۔۔۔۔ اور بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ کی صدائیں تو اس طرح بلند ہو رہی تھیں جیسے وہ کوئی چپخنے والی مشین ہو۔ اس میں اُس کے اردے کو دخل نہیں پھر دفعتاً اس نے کسی دوسری گاڑی کی آواز سنی جو ان کے قریب ہی آکر رکی تھی۔

گاڑی کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور خود بخود اڑھٹا چلا گیا۔

اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا گاڑی کے باہر ہو رہا تھا اور وہ بچھلی سیٹ پر پڑی رہا پ رہی تھی۔ بعد ہی اندازہ کر سکی تھی کہ باہر کچھ آدمی ہاتھ پائی کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی درد میں پئی غرائشیں بھی سنائی دیتیں۔ پھر ایک لمبی کراہ کے بعد ہی سناٹا چھا گیا۔۔۔۔۔ کئی منٹ۔۔۔۔۔ لیکن وہ سیٹ سے اٹھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

دفعتاً الیکٹرک لمپ کی روشنی چہرے پر پڑی اور اس کی آنکھیں چند ہیا گئیں۔ ساتھ ہی ہائی بچانی سی آواز کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ ”آپ محفوظ ہیں نا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔!“ وہ بوکھلا کر اٹھی۔ مخاطب کرنے والا کیپٹن حمید تھا۔ لیکن برے کی وجہ سے وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ”گاڑی سے اتر آئیے۔۔۔۔۔ وہ بیہوش باہر۔۔۔۔۔ میرے ساتھ چلیے۔“

سارہ ہانپتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی۔ اس کی گاڑی کے پیچھے دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ حمید نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اندر روشنی کر دی۔ بچھلی سیٹ پر باڈی گاڑڈ چٹ پڑا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دہانے کے بائیں گوشے سے خون کی لکیر پھوٹ کر کان کی گلی گئی تھی۔۔۔۔۔ دونوں ہاتھ سینے پر تھے اور ہاتھوں میں وہی ہلکی جھکڑیاں تھیں جو کچھ پہلے ہوٹل مونا کو میں استعمال کی گئی تھیں۔ کار چل پڑی۔۔۔۔۔ حمید کہہ رہا تھا۔ ”اب آپ گاڑی کے خلاف ایک رپورٹ درج کرائیں گی اور پھر میں آپ کو آپ کی قیام گاہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ اب میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔۔۔۔۔ خود کو ایک پولیس آفیسر کی حفاظت نہ دیتی ہوں۔“

”یہ اور اچھا ہے۔۔۔۔۔ اس طرح میں دوہری مشقت سے بچوں گا۔ اگر شروع ہی سے آپ پر نظر نہ رکھی ہوتی تو اس وقت۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔۔۔۔۔ قلندر پکا فراڈ ثابت ہوا ہے۔ میں آپ لوگوں کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ناول والی بکواس پر یقین نہ کیجئے۔ لمبی کہانی ہے۔۔۔۔۔ اس کے کچھ مخالفین بھی ہیں جنہوں نے مجھے قلندر کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور خود کو سیکرٹ سروس سے متعلق ظاہر کیا تھا۔۔۔۔۔ پہلے وہ مجھے زبردستی موٹی کارلو کے ریکریشن ہال سے اٹھا

”اُسی رات کی بات تو نہیں..... جب قلندر کا ایک فین آپ کے ساتھ تھا۔“
پوچھا۔

”اوہ..... آپ کیا جانیں.....!“ ساڑھ کے لمبے میں حیرت تھی۔

ہمیں ہر طرح باخبر رہنا پڑتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں تاکہ اُسی وقت سے ان کی کراہا تھا جب سے کسی تعاقب کرنے والے کی کہانی سنائی تھی اور مجھ پر خنجر پھینکا گیا تھا۔
”وہ بھی قلندر ہی تھا.....؟“ ساڑھ بے ساختہ بولی۔

”مجھے یقین تھا کہ وہی ہو گا۔ فی الحال خاموش رہئے۔ پوری کہانی اپنی رپورٹ میں کرائیے گا۔“

”لیکن میں اب قلندر کی ملازمت نہیں کرنا چاہتی۔“

”یہی مناسب بھی ہے آپ کے لئے..... اس وقت میں اُسے دھوکا دے کر کر۔“

نکلا تھا..... ورنہ وہ بھی میرے پیچھے دوڑ آتا..... میں نے باڑی گاڑ کے تیرے آ کر لیا کہ وہ کوئی بُرا ارادہ رکھتا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ.....!“

حمید نے آواز کے ساتھ جمائی لی اور وہ جملہ پورا نہ کر سکی۔



ساڑھ کی رپورٹ پر قلندر کے خلاف تفتیش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن خود وہ غائب پتہ نہیں فضا میں تحلیل ہو گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی اُسے۔

حمید محسوس کر رہا تھا کہ فریدی کے چہرے پر اس قسم کی فکر مندی کے آثار نہیں جیسے کسی ہاتھ آئے ہوئے شکار کے نکل جانے پر نظر آیا کرتے تھے۔ پوچھنے پر اُس نے

”فی الحال ہمیں قاسم کی بازیابی سے سروکار رکھنا چاہئے۔“

ساڑھ نے رپورٹ کے ساتھ ہی اپنا استعفا بھی اس لئے پولیس کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ بدبو پولیس ہی قلندر تک پہنچایا جائے اور اب وہ انہیں دونوں کے ساتھ مقیم تھی۔

اس وقت وہ تینوں نشست کے کمرے میں بیٹھے قلندر ہی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے

فریدی کی انداز سے ایسا ظاہر ہوا جیسے ایک بیک کوئی خاص بات یاد آگئی ہو۔ اس نے

اپنی اندونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور اُس میں سے ایک فوٹو گراف نکال کر میز پر

ڈال دیا..... یہ وہی فوٹو گراف تھا جو آئیڈنٹی کا سٹ کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔

”کبھی اس قسم کا بھی کوئی آدمی تمہاری نظر سے گزرا ہے۔“ اس نے فوٹو گراف کی

فمن اشارہ کر کے ساڑھ سے پوچھا۔

ساڑھ تصویر دیکھنے کے لئے جھکی ہی تھی کہ بیساختہ اچھل پڑی اور متحیرانہ انداز میں

فریدی کی طرف دیکھتی رہی۔

”کیوں..... کیا بات ہے؟“

”تو یہ کج کج..... سیکرٹ سروس کا سربراہ تھا.....؟“

”اوہ.....!“ فریدی کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آئے۔

”جی ہاں..... یہی تھا جس نے مجھے قلندر کی نگرانی کرنے پر اکسایا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا

اُس کا علم کمیشن حمید اور آپ کو نہ ہونے پائے۔ کیونکہ سیکرٹ سروس کے معاملات سب

سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں..... مگر یہ تو قلمی تصویر کا فوٹو گراف معلوم ہوتا ہے..... ہو بہو

”نہ ہے۔“

فریدی نے تصویر اٹھا کر پھر پرس میں رکھ لی..... اسے ڈاکٹر شاپور نے سر جاوید کی

ذہنیت سے شناخت کیا تھا۔

”صرف ایک کی ہے اس تصویر میں.....!“ ساڑھ بولی۔

”وہ کیا.....؟“

”جڑے پر زخم کا نشان نہیں ہے۔“

فریدی نے صرف سر ہلا کر رہ گیا..... اُس کی آنکھیں گہرے تفکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اے وہاں کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

آخر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اٹھو..... اور میرے ساتھ چلو۔“

سازہ نے بے بسی سے فریدی کی طرف دیکھا۔

”کیا تمہیں ان کا استغنیٰ بذریعہ پولیس نہیں ملا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ایک ماہ کے نوٹس کے بغیر استغنیٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔“

”کیا یہ ایسے کسی تحریری معاہدے پر دستخط کر چکی ہیں۔“

”ہاں.....!“

”نہیں.....!“ سازہ ہٹکائی۔

”تم خاموش رہو۔“ قلندر فریدی کو گھورتا ہوا خونخوار لہجے میں غرایا۔ ”تمہیں ابھی اور

وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔“

فریدی کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

پھر قلندر حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں نے ساڑھے تین سو بلوں کا خون کیا ہے محض

لے کے ایک بلے کی وجہ سے مجھے اپنی پالتویلی کا خون کرنا پڑا تھا۔“

”میں تمہارے لئے مزید ساڑھے تین سو بلے مہیا کر سکتا ہوں۔“

”یکٹین حمید یہ میرے ساتھ جائے گی۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔“ فریدی کا لہجہ اب بھی نرم ہی تھا۔

”زبردستی کھینچ کر لے جاؤں گا۔“

”ہوم سیکرٹری کے ہدایت نامے میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔“

”کرنل فریدی میں بہت بُرا آدمی ہوں۔“

”ابھی تک تو حالات نے بھی یہی بتایا ہے۔“

”تم جانتے ہو یا اٹھا کر باہر پھینک دوں۔“ ایک بیک حمید آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”ہاں.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا اور حمید جہاں تھا وہیں رک گیا۔

قلندر حمید کو اس طرح گھورتا رہا تھا جیسے کچا چبا جائے تھا۔ پھر دفعتاً وہ مسکرا پڑا۔

”یکٹین حمید اگر تم مجھے اٹھا کر باہر پھینک سکے تو دس ہزار روپے تمہارے ہیں..... آؤ۔“

ٹھیک اُسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔ فریدی نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہاں..... فریدی ہی بول رہا ہوں۔“ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار نظر

آ کر کار وہ ریسیور کرڈیل پر پینج کر حمید کی طرف مڑا۔ تیو رایے ہی تھے جیسے حمید سے کوئی غم

سرزد ہوئی ہو۔ حمید نے پلکیں جھپکائیں اور فریدی بولا۔ ”وہ بد معاش ہی نہیں ہے جس

پشت پناہی کے لئے کوئی شریف آدمی نہ کھڑا ہو جائے۔“

”کیوں..... کیا ہوا.....؟“

”ایس پی چوہان کا فون تھا۔ سیکرٹری برائے امور داخلہ سے حکم ملا ہے کہ قلندر

خلاف ساری رپورٹیں انہیں پیش کی جائیں اور ان کی اجازت کے بغیر اسے حراست میں نہ ل

جائے۔“

کچھ دیر کے لئے کمرے کی فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ پھر سازہ بولی۔ ”وہ ایسا

بارسوخ ہے۔“

”دیکھا جائے گا.....!“ حمید اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

فریدی نے سگار کا گوشہ توڑتا ہوا کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ

ساتھ بولا۔ ”اور بہت زیادہ باخبر بھی معلوم ہوتا ہے..... لو..... وہ آپہنچا..... حمید

جاؤ..... اس کا استقبال کرو..... اور یہاں لے آؤ۔“

”کون ہے.....؟“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”خود دیکھ لو.....؟“

حمید پردہ ہٹا کر برآمدے میں آیا..... قلندر پھانک سے گذر کر پائیں باغ کی آؤ

روش طے کر چکا تھا۔ حمید کا خون کھولنے لگا۔ لیکن وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ قلندر

برآمدے میں داخل ہو کر فریدی کے متعلق پوچھا۔ حمید نے ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف

اشارہ کیا۔

قلندر نے اجازت لئے بغیر پردہ ہٹایا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ حمید اس

پچھے تھا۔ سازہ کے چہرے پر مردنی چھا گئی..... فریدی اب بھی کھڑکی کے پاس ہی کھڑا

کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا..... قلندر کی نظریں صرف سازہ پر تھیں..... اور ایسا لگا

حمید کے سر پر تو وہی پرانی چھکی سوار ہو گئی تھی جو اکثر پہلے بھی اس سے اٹھانے کی حرکت سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

حمید نے جھپٹ کر قلندر کی کمر پکڑ لی اور زمین سے اکھاڑ دینے کے لئے زور لگا..... قلندر کی ہتھکڑیاں آہستہ آہستہ خوفناک قسم کی بجیدگی میں ہوتی گئی۔ ادھر حمید پر بھی جھلاہٹ طاری ہو رہی تھی کیونکہ وہ پورا زور صرف کر رہا تھا۔

دفعۃً قلندر نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اپنے پست پر دو ہتھوڑ مارنے ہی جا رہا تھا کہ فریدی نے ان کے درمیان اپنا بازو حائل کرتے ہوئے کہا۔ ”شرط میں یہ چیز شامل نہیں تھی۔“

”ہٹ جاؤ.....!“ قلندر نے غرا کر اپنی کمر جھکائی اور حمید صاحب بھٹکتے ہوئے بائیں جانب والی دیوار سے جا ٹکرائے۔

اب قلندر فریدی سے لپٹ پڑا تھا..... سارے ایک گوشے میں کھڑی تھر تھر کاہن تھی۔ فریدی قلندر سے کہہ رہا تھا۔ ”ہوش میں آؤ..... تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔ ٹھہرو۔ ورنہ مجھ پر الزام نہ رکھنا۔“ ساتھ ہی اس نے حمید سے بھی کہا۔ ”تم وہیں ٹھہرو..... اندازی کی ضرورت نہیں۔“

قلندر کی حالت سے سچ سچ یہی ظاہر ہو رہا تھا جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ ایسی ہی غرائیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی بھرا ہوا گوریل اپنے شکار پر پل پڑا ہو۔ حمید نے پھر آگے بڑھنا چاہا..... لیکن فریدی اسے روکتا ہوا بولا۔ ”بیکار ہے۔ انرجی مت برباد کرو..... ہوم سیکرٹری کی اجازت حاصل ہو جانے کے بعد ہی زور آزمائی کسی کام آسکے گی۔“

”تم خود کو رستم سمجھتے ہو۔“ قلندر غرایا۔ ”آج ہی اس کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔“

”میں صرف میں ہوں بہرہ روپے.....“ فریدی نے کہا..... اس بار وہ اسے دروازے تک دھکیل لے گیا تھا۔ پھر سارے نے دیکھا کہ قلندر دروازے کے پردے سمیت لوٹا۔

”فریدی نے دوسری تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔“

”یہ تو بیل فاکٹر فرمان ہے۔“ وہ تصویر پر نظر پڑتے ہی بولی۔ حمید بھی تیزی سے تصویر پر جھک پڑا۔ لیکن یہ تصویر سر جاوید والی تصویر سے اسی حد تک مختلف تھی

سارہ جھومتی ہوئی منہ کے بل زمین پر چلی آئی۔ اپنی بائیں جانب کرسی کے ہتھکڑی سے ڈھلک گئی۔

”کرئل صاحب..... کرئل صاحب۔“ حمید حلق پھاڑ کر چیخا۔ اور پھر اس کا بھی وہی جذبہ ہوا جو اس سے پہلے ان دونوں کا ہو چکا تھا..... سدھ ہی نہ رہی کہ کہاں اور کس حال میں ہے۔



بل فائٹر فومان نے کراہ کر روٹ بدلی اور پھر اچھل کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں مل مل کر چاروں طرف دیکھا کوئی نامانوس جگہ تھی اور وہ اپنی مسمری کی بجائے لکڑی کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی بوکھلاہٹ میں منہ پر ہاتھ پھیرا تو ڈاڑھی غائب پائی۔ انگلیاں پھسلتی ہوئی بائیں جڑے کے نشان کی گہرائی میں رکیں اور وہ اچھل کر تخت کے نیچے آیا..... پھر دروازے کی طرف چھپنا۔ اس پر ٹکریں ماریں۔ لیکن بے سود نہ تو دروازے نے جنبش ہی کی اور نہ دوسری طرف سے کسی قسم کی آواز آئی۔ وہ تھک ہار کر پھر تخت پر آ بیٹھا..... اس چھوٹے سے کمرے میں تخت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں سے ایسی وحشت ظاہر ہونے لگی جیسے وہ شکاریوں کے نرغے میں آیا ہو اور ندہ ہو۔

دفعۂ دروازہ کھلا اور ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

”تم.....!“ فومان اچھل پڑا۔ ”قلندر.....!“

”ہاں..... میں..... یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے..... پیڑرواب تمہیں مہلت نہیں دے سکتا؟“

”کک..... کیوں.....؟“ دفعۂ فومان کی حالت غیر نظر آنے لگی۔

”تم نے میرے متعلق کرئل فریدی کو سب کچھ بتا دیا ہے..... اب تک تم محض ان لئے زندہ تھے کہ تم نے پولیس کو میرے متعلق یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پیڑرو کے لئے کام کرتا

”م..... میں نے تو کبھی کسی کو نہیں بتایا..... یہ جھوٹ ہے۔“

”تم جھوٹے ہو۔ فریدی کو بتا چکے ہو..... تصدیق کرنا چاہتے ہو..... تو آؤ میرے.....“ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور مڑ کر غرایا۔

”اٹھو.....!“

فومان اضطراری طور پر اٹھتا چلا گیا اور پھر قلندر کے پیچھے پیچھے گویا گھستار ہا تھا۔ وہ ایک ٹاہل میں آئے۔

یہاں ایک آدمی کرسی پر رسیوں سے جکڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی قلندر کی بڑی سارہ کھڑی اس طرح کانپ رہی تھی جیسے اس کے چاروں طرف برف کی دیواریں لی ہوں۔

”کیپٹن حمید.....!“ قلندر نے اُسے مخاطب کیا۔ ”کیا فومان نے کرئل فریدی سے متعلق گفتگو نہیں کی تھی۔“

کرسی سے بندھے ہوئے آدمی نے سر اٹھا کر قلندر کو کینہ توڑ نظروں سے دیکھا اور پھر ٹانگی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا یہ بھی موجود تھی۔“ قلندر نے سارہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ آخر قلندر ہی غرایا۔ ”میں اچھی طرح سمجھتا ہوں تم لوگ زبان نہیں کھولے۔ تو پھر..... فریدی میرا کیا بگاڑ لے گا..... ہو سکتا ہے اس وقت تک میرے کسی ٹانگی رائل کا نشانہ بن چکا ہو..... اور تم کیپٹن حمید تم بھی مرنے کے لئے تیار نہیں..... تمہیں تو سارہ ہی خنجر مار کر ہلاک کرے گی۔“

”نہیں نہیں.....!“ سارہ ہاتھ اٹھا کر ہشترائی انداز میں چیخی۔

”تمی ہو گا.....!“ قلندر دانت پیس کر سانپ کی طرح پھکارا۔ ”تم مجھے اچھی طرح

سارہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب وہ سہارے کے بغیر کھڑی ہو سکتی..... قلندر تو اُس سے اتنا کہہ کر فومان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”ملا تو نہیں کہا تھا.....؟“ حمید نے چڑانے والے لہجے میں ہانک لگائی۔
”یہاں شامت آئی ہے۔“ قلندر غرا کر اس کی طرف مڑا۔

”وہ تو آئی چکی ہے..... یہ ری۔“ حمید نے ساڑھ کی طرف اشارہ کیا۔
”اس کی طرف مت دیکھو.....“ قلندر پیر شیخ کر دھاڑا۔ ”اے..... تم ادھر منہ کر کے
بوجاؤ۔“
ساڑھ بوکھلا کر دوسری سمت مڑ گئی۔

”ایک اسی وقت قلندر نے تالی بجائی اور تین آدمی ہال میں داخل ہوئے۔ قلندر نے
کی طرف اشارہ کر کے کہا۔“ پچھاؤ..... اے..... آج اپنے ہاتھ سے ذبح کروں گا۔“
”فہر..... نہیں..... تم کیا کر رہے ہو..... میں مر گیا تو تمہیں اس کی ہوا بھی نہ
لے گی۔“ فومان بے ساختہ بول پڑا۔

”فوب..... تو تم جانتے ہو۔“ قلندر نے طویل سانس لی۔

”جانتا ہوں..... لیکن یہاں ہر گز نہیں بتاؤں گا..... جھیل پر چلو۔“
”وہ کیوں.....؟“

”بیکار تم نہیں سمجھ سکو گے۔ کشتی پر بیٹھ کر نشاندہی کرنی پڑے گی۔“

”چلو..... یہی سہی..... لگے ہاتھ یہ کام بھی اس وقت ہو جائے گا..... لیکن قاسم کی
ذی تو تمہیں یہیں سے کرنی پڑے گی۔“

”لگ..... کر دوں گا..... وہ سکیم لاج میں ہے۔“

”تم اے یہاں بلواؤ گے..... لیکن اتنا یاد رکھنا..... مجھ سے کسی قسم کی کوئی چال نہ
بکرو گے۔“

”ل..... لیکن میرا حصہ۔“

”ایک ریزہ بھی تمہیں نہ مل سکے گا..... اس قسم کی شرائط کا وقت گزر چکا ہے.....
بہتر سے احکامات کی تعمیل یا موت ہی پر بات ٹھہری ہے۔“

”میں خودی اُسے جا کر یہاں لاسکتا ہوں..... میری تحریر پر بھی اُسے وہاں سے نہیں
بھانپ سکتا۔“

”میں نے ہمیشہ ڈھیل دی ہے..... کبھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ہمارے درمیان
سب سے بڑا جھگڑا بھی تک طے نہیں ہو سکا۔“
”تم کیا چاہتے ہو۔“ فومان مردہ سی آواز میں بولا۔

اس موٹے کو اپنی تمام ترتیاریوں سمیت میرے حوالے کر دو اور اس جگہ کی صحیح نشاندہی
کر دو..... ورنہ یہاں دفن شدہ لوگوں میں تمہارا اضافہ میرے لئے کسی قسم کی بھی دشواری کا
باعث نہ ہو گا۔

حمید فومان کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔ یہ وہی
فومان تھا جس کے نام سے نوی چار کے باشندوں کا دم نکلتا تھا۔ اس نے متحیرانہ انداز میں قلندر
کی طرف دیکھا۔
”جلدی کرو.....!“

”تم مجھے میری خواب گاہ سے کیسے لائے۔“ فومان نے جواب دینے کی بجائے پوچھا۔
قلندر نے قہقہہ لگایا کچھ دیر یکساں انداز میں ہنستا رہا پھر بولا۔ ”ڈھیل دینے کی یہ وجہ تو
نہیں تھی کہ میں کسی طرح مجبور تھا۔ میں جب بھی چاہتا تمہیں کسی خارش زدہ اور ناکارہ کتے کی
طرح مار ڈالتا۔ تم نے اپنے بچاؤ کے لئے جتنے انتظامات کر رکھے تھے میری نظروں میں ان کی
وقع باز پچھ اطفال سے زیادہ نہیں۔ جب ضرورت سمجھی تمہیں تمہاری خواب گاہ سے نکال
لایا..... فضول باتوں میں کیا رکھا ہے..... اب بھی راہ راست پر آ جاؤ۔“

”مم..... کیا بتاؤں..... آخر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ مجھے صحیح جگہ کا علم نہیں ہے۔“
”تو پھر مجھے اس موٹے کے اغواء کا مقصد ہی بتا دو۔“

”مم..... وہ.....!“

”شٹ اپ.....“ قلندر حلق پھاڑ کر دھاڑا۔ ”اب تم بتاؤ یا نہ بتاؤ..... میں تمہیں ہر حال
میں مار ڈالوں گا..... تم نے عہد شکنی کی ہے..... تم نے فریدی کو بتا دیا ہے کہ میں پتھر دے
لئے کام کرتا ہوں۔“

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے اسے بتایا ہے۔“

”وہ مجھے بہرہ دیا کہ رہا تھا۔“

نہ اڑا رہا ہو۔ پھر تیزی سے بیہوش آدمی کی جانب بڑھا..... اس کی گھٹی ڈاڑھی ٹٹولی اور جگہ سے بال اکھڑنے لگے۔ ذرا ہی ہی دیر میں چہرہ صاف ہو گیا۔ حمید کے پیروں تلے زرمین ہی نکل گئی۔ وہ فریدی ہی تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ مظلوم ہوتا تھا جیسے بیہوش ہونے سے قبل کسی اذیت میں مبتلا رہا ہو..... اس کا سر چکرانے اور وہ آدمی اس گرفتاری کی تفصیل بتا رہا تھا۔ تو پھر ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے مونا کو ملے۔ یہ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ہم مونا کو کی عمارت میں ادھر ادھر بھٹکتے ہی پھر نکلے کہ ایک آدمی نے جس کا چہرہ کوٹ کے کار اور فلت ہیٹ کے جھکے ہوئے گوشے کے پوشیدہ تھا ہمیں بتایا کہ فریدی اب میک اپ کر کے کہیں جا رہا ہے اور اس وقت ڈائمننگ میں موجود ہے۔

”وہ آدمی کون تھا جس نے تمہیں بتایا تھا۔“

”پیڈرو جناب۔ انہوں نے خود ہی بتایا تھا۔“

”نکل دیکھی تھی تم نے۔“

”نہیں جناب موقع نہیں مل سکا تھا..... ضرور کوشش کرتے لیکن خدشہ تھا کہ کہیں فریدی کی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“

حمید نے محسوس کیا جیسے قلندر کسی الجھن میں پڑ گیا ہو..... کبھی بیہوش فریدی کی رہنمائی تھا اور کبھی اس آدمی کی طرف جو اس سے گفتگو کرتا رہا تھا۔

دفعہ دروازہ کھلا اور ایک قد آور نقاب پوش ہال میں داخل ہوا جس کے داہنے ہاتھ میں ایک چارپانچ کاریو والور تھا۔

”کس فکر میں پڑ گئے ہو۔“ اس نے ریو والور کا رخ قلندر کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا میری دخل اندازی گراں گزری ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری نیت میں بھی کیا ہوا ہے..... تم مجھ سے کٹ کر اپنے لئے الگ راستہ بنانا چاہتے ہو۔“

”تم ہو کون.....؟“ قلندر غصیلے لہجے میں چیخا۔

”پیڈرو.....!“

”کیوں ہے؟“

قلندر نے اپنے آدمیوں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ”سکیم لاج..... دیو قامت آدمی..... غوطہ خوری کے ساز و سامان سمیت جاؤ..... بیس منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔“

”یار فومان..... میں تمہیں اتنا چاہا نہیں سمجھتا تھا۔“ دفعتاً حمید نے مضحکہ انداز میں ”تم نے کسی لاوارث بیوہ کی طرح ہاتھ پیر ڈال دیئے ہیں۔“

”اوہ..... تم چپ رہو۔“ قلندر منھتیاں سمجھتے ہوئے طرف جھپٹا۔

لیکن قبل اس کے کہ اس تک پہنچتا پیچھے سے فومان نے اس پر چھلانگ لگائی۔ شاندار کی طعنہ زنی بار آور ہوئی تھی۔ فومان نے اسی طرح سنبھالا لیا تھا جیسے اس دوران میں کوئی نہ ہو۔ قلندر کے وہ تینوں ساتھی وہاں سے جا چکے تھے جنہیں اس نے سکیم لاج جانے کی ہدایت دی تھی۔ قلندر کیلئے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا اس لئے اسے سنبھلے کا موقع نہ مل سکا اب فومان اور وہ فرش پر پڑے ہوئے ایک دوسرے کی گرفت سے نکل جانے کے لئے زور کر رہے تھے۔ ”واقعی تم بل فائٹر ہو فومان۔“ حمید پر جوش لہجے میں کہتا رہا۔ ”بہت اچھا اپنی کلائی اور طرح گردن پر بجائے رکھو..... ویری گڈ..... دباؤ ڈالتے رہو۔“ پھر اس نے سارہ کو اشارہ کیا کہ وہ جلدی سے اس کی رسیاں کھول دے۔ سارہ نے اشارہ تو غالباً سمجھ ہی لیا تھا لیکن اعصاب پر قابو نہ پاسکتے کی بناء پر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکی۔

ٹھیک اسی وقت آمد و رفت والا دروازہ آواز کے ساتھ کھلا اور تین چار آدمی کی باحس و حرکت آدمی کو اٹھائے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ قلندر نے چیخ کر کہا۔

”اے سنبھالو..... اس کا دماغ چل گیا ہے۔“ انہوں نے پہلے ان دونوں کو تنہی نظروں سے دیکھا تھا اب بیہوش آدمی کو فرش پر ڈال کر ان کی طرف جھپٹے۔ دوسرے ہی لمحے میں فومان ان کی گرفت میں کھڑا ہانپ رہا تھا..... اور قلندر اُسے نظر انداز کر کے اس طرح بیہوش آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جیسے اس سے تو محض مذاق ہوتا رہا ہو۔

”یہ کون ہے.....!“ قلندر نے بیہوش آدمی کو گھورتے ہوئے پوچھا جس کے چہرے؟ گھٹی ڈاڑھی تھی۔ آنے والوں میں سے ایک آگے بڑھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”فریدی“

”میک اپ میں تھا۔ ہم دھوکا کھا جاتے لیکن پیڈرو نے بروقت مدد کی۔“

”پیڈرو.....!“ قلندر اچھل پڑا اور اس آدمی کو اس طرح گھورنے لگا جیسے وہ اس کے

ی کی پشت گاہ کے اوپری حصے کو مضبوطی سے تھامے ہوئی تھی۔ دفعتاً حمید نے کہا۔ ”خدا
ہوش میں آؤ..... مجھے چپکے سے کھول دو..... ورنہ ہم سب ختم کر دیئے جائیں گے۔“
ٹھیک اسی وقت قلندر غریبا۔ ”فومان ہوش میں آؤ..... ہمارے لئے کسی نے جال بچھایا
ہے۔ پیڈرو کا کوئی وجود نہیں ہے..... میں نے تم لوگوں کے لئے ایک ہوا تخلیق کیا تھا.....
اردھنل ایک نام ہے۔ تم مجھے ہی پیڈرو بھی سمجھ لو..... یہ آدمی جھوٹا ہے۔“ پیڈرو نے
بہ لگایا اور فومان قلندر کو گالیاں دینے لگا۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پیڈرو الٹے پاؤں چلتا ہوا دروازے کے قریب
..... اور ایک طرف ہو کر دروازے کا بولٹ گرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں قاسم تین
ہوں سمیت ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر حمید پر پڑی..... اور اُس
بڑے دردناک لہجے میں کہا۔ ”ہائے پتہ لگالیا سالوں نے..... اب قیا ہو گا.....“ اور پھر
اونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہیں دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دفعتاً فومان پر نظر پڑی
وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ اُسے سر جاوید کی حیثیت سے جانتا تھا۔

اگر وہ تینوں آدمی جو اس کے ساتھ آئے تھے متحیرانہ انداز میں کبھی لڑنے والوں کو
بچے اور کبھی اُس نقاب پوش کو۔ بلا آخر نقاب پوش نے ان کی حیرت رفع کر دی اور وہ بھی دم
اڑھ گئے۔ شائد ان میں سے کسی نے بھی پیڈرو کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا..... صرف نام
نہ سنے تھے۔

اچانک قاسم کی دھاڑ سنائی دی۔ ”ابے کون ہے تو جو میرے پیلا سے بھڑا ہوا ہے..... پیلا
میرا یادداشت واپس آگئی ہے۔“ وہ مکاتانے ہوئے ان دونوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”اے بد بخت..... یہ پیڈرو نہیں ہے۔“ قلندر بے بسی سے چیخا۔ ”پولیس نے کوئی
نہ لکھا ہے۔“ دفعتاً نقاب پوش نے ایک ہوائی فائر کیا اور آٹھ دس آدمی مسلح ہال میں گھس
گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مائی گنیں تھیں پھر نقاب پوش نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم سب اپنے
گھر میں جھگڑیاں پنپنے کے لئے تیار ہو جاؤ..... قلندر کا خیال بالکل صحیح ہے۔“

اس بار حمید نے بوکھلا کر بیہوش فریدی کی طرف دیکھا کیونکہ نقاب پوش نے یہ جملہ اسی
نہ لکھا اور لہجے میں ادا کیا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر سارہ سے کہا کہ وہ اب تو اسے کھول دے۔

”بہت اچھے..... میں فومان نہیں ہوں قلندر..... میں کر رکھ دوں گا۔“
سارے آدمی براہ راست میرے لئے بھی کام کر سکتے ہیں۔ تم خود سر ہوتے جا رہے ہو۔
میں نہیں چاہتا تھا کہ فومان سے ہمارا کوئی جھگڑا ہو لیکن تم نہیں مانے تھے۔ آخر کار فومان
تک پہنچی کہ مرکزی حکمہ سراغ رسانی کو متوجہ ہونا پڑا..... تم نے اپنی ضد کی بناء پر فومان
جھگڑا کیا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں حضور والا۔“ فومان جلدی سے بولا۔ ”میں آؤ
آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں..... اور یہ محض آپ ہی کا خوف تھا کہ قلندر آج تک
رہا..... ورنہ اس جیسے نہ جانے کتنے میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے ہیں..... اور اب
بخت مجھ پر الزام رکھ رہا ہے کہ میں نے فریدی کو اس کی اطلاع دے دی ہے کہ یہ
کارندہ ہے۔“

”یہ غلط کہتا ہے..... میں جانتا ہوں کہ تم بہت محتاط آدمی ہو۔“ فریدی کو تم۔
بھی نہیں بتایا۔ ”بہر حال اس نے تمہاری سخت توہین کی ہے۔“
”میں شکر گزار ہوں جناب عالی۔“ فومان کل گیا۔

”لیکن تم اس وقت اپنی اصل شکل و صورت میں کیوں ہو۔“
”یہ بھی اسی حرام زادے کی حرکت ہے۔ میں اپنی خواب گاہ میں بے خبر سو رہا تھا
طرح اٹھوا لایا اور میرا پلاسٹک میک اپ بھی تباہ کر دیا۔“

”اس سے ضرور بدلہ لو..... ابھی اور اسی وقت..... بالکل پرواہ نہ کرو.....
میرے آدمی ہیں..... میری موجودگی میں قلندر کا ساتھ نہ دیں گے۔“

وہ سب دم بخود کھڑے رہے۔ انہوں نے فومان کو چھوڑ دیا تھا..... قلندر نے؟
طرف دیکھا اور پھر فومان کو گھورتا ہوا بولا۔ ”حق نہ بنو..... یہ پیڈرو نہیں ہے۔“
”دیکھ لیا تم نے فومان..... یہ ایسا ہی کمینہ ہے۔“ نقاب پوش نے کہا۔ ”چونکہ
آدمیوں نے آج تک میری شکل نہیں دیکھی..... اس لئے یہ سمجھتا ہے کہ انہیں
ورغلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔“ فومان نے قلندر پر چھلانگ لگائی اور وہ دونوں
بھیڑیوں کے سے انداز میں لڑنے لگے۔ سارہ سہم کر حمید کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

ان سبھوں کے جھٹکریاں پڑ چکی تھیں..... قاسم نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا کہ فریدی بولا۔
”پوش رہو ورنہ تمہارے بھی جھٹکریاں لگا دوں گا۔“

”لغادو.....!“ وہ حلق پھاڑ کر دہاڑا۔ ”میں نے کب کہا تھا کہ میرا پتہ لغاد..... ہاں میں تو..... اے میں ہی رہ گیا تھا تم لوگوں کی سراگ رسانی کے لئے..... اچھا چلو.....“
یہی میں اپنی آنٹی تو بھی ساتھ لے چلوں گا.....!“ پھر حمید کی بقیہ رات قاسم کے
مرنے تھانے میں گزر گئی تھی۔

اس نے اس کی آنٹی کو بھی دیکھا جو نومی چار کی ایک پیشہ ور عورت ثابت ہوئی تھی۔
اسم بار بار یہی کہتا تھا۔ ”ارے تم لوگ مجھے دودن بھی چین سے نہیں گزارنے دو گے۔ ہائے
اباں تم بھی ساتھ نہیں دیتے کیوں نہیں پایا اور آنٹی کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ مجھے
بلدی سے افریقہ لے کر چلے جاتے..... اب میں قیاقروں..... ہائے آنٹی۔“

مگر آنٹی بیچاری تو حوالات میں پہنچ گئی تھی۔ تقریباً چار بجے صبح فریدی واپس آیا۔ اور
اس نے ساڑھ سے قلندر کے مختلف ٹھکانوں کے متعلق پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پھر گفتگو کے
ذرائع سے حمید کو ایسا لگا جیسے قلندر فرار ہو گیا ہو۔ استفسار کرنے پر فریدی نے بتایا کہ قلندر
حوالات سے فرار ہو گیا ہے۔ اس خبر پر ساڑھ تو فوری طور پر بیہوش ہو گئی تھی اور حمید جھلاہٹ
لی اپنی بوٹیاں نوج رہا تھا۔ قلندر نے دراصل فریدی کی عدم موجودگی میں ایس۔ پی کو
عملیاء دی تھیں اور کہا تھا کہ اس کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی اگر اُس نے اسے
حوالات سے نکال کر کسی آرام دہ کمرے میں نہ رکھا۔ اس نے اسے وزارت داخلہ کے
سیکرٹری کے حکم نامے کے متعلق یاد دہانی کرائی تھی۔ ایس۔ پی نے سوچا تھا کہ مرکزی محکمہ
رائہ رسانی والے اپنے طور پر جواب دہی کرتے رہیں گے لہذا وہ خود کیوں اپنی پوزیشن
نظر سے اٹھالے کیونکہ اُسے تو وہ حکم نامہ اپنے ڈی۔ آئی۔ جی کے توسط سے ملا تھا۔ قلندر
سنے اس حد تک اطمینان دلایا تھا کہ وہ اُسے حوالات سے نکال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ پھر
ایک لمحے کے بعد پتہ ہی نہ چل سکا کہ قلندر کہاں غائب ہو گیا۔

حمید قاسم سے اس کی کہانی سن چکا تھا لہذا اُس ڈرامے کا مقصد معلوم کرنے کے لئے
بہمکن تھا۔

ادھر نقاب پوش نے نقاب اتار دیا تھا۔ فومان بھی دم بخود رہ گیا۔ لیکن قلندر اس کا
تنا کھڑا تھا جیسے اس دریافت کے بعد بھی وہ فریدی سے ٹکرا جائے گا۔ فریدی نے فوس کر کے
”تم صرف جاسوسی ناولیں لکھتے ہو اور میں جاسوس ہوں۔“

”تو پھر میرا کیا بگاڑ لو گے..... تم نے پتہ نہیں کس چکر میں مجھے پھانس لیا ہے۔ میں
لوگوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا..... میں تم سے اپنی محبوبہ ساڑھ کو واپس لینا چاہتا
لہذا تم نے میرے خلاف کسی قسم کی سازش کر ڈالی..... لیکن تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔
کے لئے تمہیں سیکریٹری برائے امور داخلہ کا اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔“

”اس اعتراف کے بعد کہ تم ہی پیڑرو ہو میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔ یہاں
میرے خصوصی اختیارات کا دائرہ عمل شروع ہوتا ہے جس کی خلاف کوئی قدم اٹھانے کے
سیکرٹری صاحب کو صدر مملکت سے اجازت حاصل کرنی پڑے گی۔ جھٹکریاں ڈال دو
سبھوں کے ہاتھوں میں۔“

”میں نے اس قسم کا کوئی اعتراف نہیں کیا۔“
”کیوں..... فومان.....!“ فریدی نے اُسے مخاطب کیا۔
”میرا نام فومان نہیں ہے..... میرا نام جاوید ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم کیا چاہتے
ہو اور مجھے یہاں کیوں پکڑوا بلایا ہے۔“

قلندر اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور آنکھ بھی ماری۔
فریدی زہر ملی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یہ دیکھو..... یہ ریوالور نہیں ہے بڑی فونٹ
والا شپ ریکارڈر ہے..... تم سبھوں کی آوازیں من و عن ریکارڈ ہوئی ہیں..... تم کسی بڑے
عدالت میں اسے جھٹلا نہ سکو گے..... تمہارا اعتراف ہی ریکارڈ کرنے کے لئے میں نے
ڈرامہ ترتیب دیا تھا..... ورنہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جب چاہتا تمہاری گرد
دبوچ لیتا۔“

اُس کے خاموش ہونے سے پہلے ہی قاسم دہاڑا۔ ”یہ سب فبول باتیں ہیں..... میرا
یادداشت واپس آگئی ہے..... میں منور جاوید ہوں..... گھبراؤ نہیں پایا..... میں گواہی دوں
گا کہ تم میرے باپ ہو۔“

پرنیدی نے بتایا کہ فومان نے سونے کی نشاندہی کر دی ہے..... اور فی الحال قاسم
بہت مناسب آدمی اس کے حصول کے لئے ملنا مشکل ہے..... لہذا یہ خدمت وہی انجام
قاسم سب کچھ سن رہا تھا..... تڑ سے بولا..... ”جرور نکال دوں گا..... مگر
چھوڑ دیجئے..... ہائے میرا مقدر..... ادھر میرا قوتی کام بنا اور ادھر دھڑ سے سالی
رہانی آکھدی..... ہائے اب میں قیاقروں۔“

ابعد حمید کو پہلی بار علم ہوا کہ بلیک فورس میں ایک ایسا آدمی بھی ہے جو بڑی حد تک
بے مشابہت رکھتا ہے۔ صرف رنگت فریدی کے مقابلے میں کسی قدر دہتی ہوئی ہے۔

تمام شد

”قلندر اور فومان شرکت میں اسمگلنگ کرتے تھے۔ قلندر نے خود کو کسی پارٹنر
شخصیت پیڑرو کا نمائندہ ظاہر کر کے اس بزنس کی شروعات کی تھی۔ دونوں اعلیٰ پیمانے پر
اسمگلنگ کرتے رہے۔ قلندر پیڑرو کے ہوتے سے فومان یا جاوید کو دہلائے بھی رہتا تھا۔ پچھ
سال وہ مشرق وسطیٰ سے پانچ من ہونا ایک بہت بڑے گیس سلنڈر کی شکل میں ڈھال کر
لا رہے تھے کہ اچانک بحری پولیس کو اس کی اطلاع مل گئی۔ ان کے اسٹیر کا تعاقب کیا گیا۔
نیوی کی بنائی ہوئی نہر کے ذریعے جھیل میں داخل ہوئے اور کسی مخصوص مقام پر وہ سونا پانی
میں پھینک دیا گیا۔ فومان سنیر پر موجود تھا۔ صرف اُسے اور اُس کے خاص آدمیوں کو علم تھا کہ
سونا کس جگہ پھینکا گیا ہے..... سونا وہیں پڑا رہا..... فومان کی نیت میں فتور آیا۔ اس نے قلندر
کو بتایا کہ بدحواسی میں کہیں سونا پھینکا گیا تھا وہ جگہ کا تعین نہیں کر سکتا اس پر دونوں گروہوں
میں جھگڑا ہو گیا۔ فومان کبھی کبھی بڑی رازداری کے ساتھ سونے کو جھیل سے نکال لینے کی
کوشش کرتا رہا ہے۔ قلندر کے آدمی چھپ کر جھیل کی نگرانی کرتے تھے۔ لہذا اکثر ٹکراؤ ہوتا
تھا اور نومی چار کے باشندے فاروں کی آوازیں سنتے تھے۔ پھر فومان نے ایک اسکیم بنائی اس
کے کسی ایجنٹ نے شائد اُس سے قاسم اور اس کی قوت کا تذکرہ کیا تھا۔ لہذا اُسے اغواء کر کے
غوط خوری کی ٹریننگ دی جانے لگی۔ وہ پانی میں بہ آسانی پانچ من کا وزن سنبھال کر سطح
لے آتا..... یادداشت والا چکر بہتری تفریحات سمیت اس لئے چلایا تھا کہ قاسم الجھ کر رہ
جائے۔ غوط خوری کی مشق کے سلسلے میں اس سے کہا جاتا تھا کہ یہ اس کی یادداشت والی
لانے کے لئے کیا جا رہا ہے..... اب سائرہ کی شانہزادی کے متعلق بھی سنو..... قلندر کو علم
تھا کہ قاسم کو کس لئے اغواء کیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہم اس کی تلاش میں نومی پارک
آپہنچے۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ہم اس سونے ہی کی طرف نہ جان نکلیں۔ لہذا ہمیں
الجھانے کے لئے اس نے گرزائن اسٹیٹ کی شہزادی والا ڈرامہ شروع کر دیا..... زبردست قسم
کا عیار ہے..... اس رات سیونٹھ آئی لینڈ میں قلندر ہی تھا جو تمہیں لانچ سمیت لے بھاگ
تھا..... فومان نے بتایا ہے۔ اُس نے اُسی رات قاسم کو اس کے قبضے سے نکال لے جانے کی
کوشش کی تھی۔ لیکن فومان کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

اب حمید کو یاد آیا کہ اسے اس آدمی کا لب و لہجہ کچھ جانا پہچانا سا کیوں محسوس ہوتا رہا تھا۔

سنہری چنگاریاں

خطوط کا ایک انبار میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا
رہنا چاہئے..... یہ خطوط میری پچھلی کتاب ”بیباکوں کی تلاش“ سے
نقل رکھتے ہیں۔ اس انبار میں صرف آٹھ عدد خطوط ایسے ملے ہیں جن
کے راقوں یا راقماؤں کو یہ کتاب پسند نہیں آئی۔

ایک صاحب یا صاحبہ (نام سے جنس کا اندازہ کرنا دشوار ہے) رقم
ملاز ہیں کہ میں صرف ”جاسوسی ناول“ لکھا کروں۔ مزاج وغیرہ کی طرف
نظری دھیان نہ دوں۔ کہانی میں صرف ایک قتل ہو اور سراغ رساں مختلف
نہ کی گتھیاں سلجھاتا ہوا مجرم تک جا پہنچے۔“

محترم یا محترمہ! یقین مانئے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کسی کہانی میں
مے سے کوئی قتل ہی نہ ہو..... لیکن پبلک۔

ہماری قوم ہر وقت خون کو گرمائے رکھنا چاہتی ہے۔ پتہ نہیں آپ کو
یاد ہو یا نہ ہو کہ سری ادب کے طوفان سے پہلے ہمارے یہاں تاریخی
ناولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا جن کے ہر صفحے پر ”کشتوں کے پشے“ نظر آیا
کرتے تھے۔ اُس سے بھی پہلے مرزا غالب تک اکثر ”دھول دھپے“ کا شکار
ہوئے ہیں۔ بہر حال کیا عرض کروں..... اکثریت ایسے پڑھنے والوں کی
بے جو کتاب کے ہر صفحے پر ”دھول دھپا“ دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی میں
تلاش ہو کر لکھتا ہوں۔

(مکمل ناول)

ایک صاحب کو ”بیباکوں کی تلاش“ میں پیش رس کے علاوہ اور کہیں

بھی انجمن کا طریق کار نظر نہیں آیا..... ان کو ایک ایسے صاحب ساتھ بٹھا دیا جائے جو صبیحہ کے کردار کو سرے سے غیر ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے دونوں ہی کو تشفی بخش جواب دینے میں آسانی ہوگی۔ تو آپ دونوں ہی سنئے! صبیحہ کا کردار محض انجمن کا طریق کار واضح کرنے کے لئے لایا گیا تھا..... اس کی وضاحت کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو چند حرفوں میں یہ لکھ دیا جائے کہ ”انجمن کا پیشہ بلیک میلنگ تھا.....“ یا پھر کسی واقعہ کے سہارے یہ چیز قاری کے ذہن نشین کرائی جائے..... پہلا طریقہ کہلاتا ہے ”رپورٹ“ اور دوسرا ”کہانی“ تو پھر میں کہانی ہی لکھنے بیٹھا تھا..... رپورٹ نہیں۔

جنازہ

بالآخر وہ جنازہ پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔

جنازے کے ساتھ چالیس آدمی تھے۔ لیکن کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ مرنے والا کون تھا یا اُسے کہاں دفن کرنا ہے۔

ہوا یہ کہ شہر کی ایک بھری پڑی سڑک پر ایک نیک دل شہری کو ایک جنازہ نظر آیا، جس کے ساتھ صرف پانچ آدمی تھے..... پانچواں کبھی ایک پائے کو کاندھا دیتا کبھی دوسرے کو۔ اُس نیک دل شہری نے سوچا کہ قبرستان تک پہنچتے پہنچتے پانچوں کے کاندھے مثل بوائے گے لہذا وہ بھی ازراہ ہمدردی جنازے کے ساتھ ہولیا اور جلد جلد کاندھا بدلنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے راگیروں کو بھی ترغیب دیتا گیا کہ وہ اُس کار ٹائپ میں حصہ لیں۔

اس طرح اُن پانچوں کی مشکل آسان ہو گئی اور ذرا ہی سی دیر میں جنازے کے ساتھ بہت سے لوگ نظر آنے لگے۔

وہ غلطی نیت سے جنازے کو آگے بڑھائے لئے جا رہے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جانا کہاں ہے۔ لیکن اُس وقت تو سبھی چونکے جب شہری آبادی بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ پھر کسی نے با آواز بلند کھوں کو مخاطب کر کے پوچھا تھا ”کہ جانا کہاں ہے۔ تدفین کس قبرستان میں ہوگی۔“

اس سوال پر وہ سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔ کسی کے پاس

ایک صاحب کو یہ ناول اس لئے پسند نہیں آیا کہ اس میں مجرموں اور سراغ رسانوں کے مابین مورچہ بندی نہیں ہوئی۔

بہر حال مختلف قسم کی پسند رکھنے والے حضرات بعض اوقات مجھے چکر کر رکھ دیتے ہیں۔ خیر صاحب..... یہ رہیں سنہری چنگاریاں۔ اس میں آپ کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو آپ چاہتے ہیں۔

ایک

بھی اس کا جواب نہیں تھا۔

آخر جنازہ وہیں سڑک کے کنارے رکھ دیا گیا۔ وہ سب براہ راست ایک دوسرے سے اُس کے متعلق پوچھنے لگے۔

تب اُس نیک دل آدمی کے دل میں شبہ گذرا کہ ہونہ ہو اُس نے دھوکا کھایا ہے۔ کچھ لوگ خاص طور پر اُسے گھور رہے تھے؟ شاید انہوں نے یاد رکھا تھا کہ اُسی آدمی نے انہیں اس کا رُتوب میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی۔

اب تو وہ نیک دل آدمی بے حد زور سے نظر آنے لگا۔..... سوچ رہا تھا کہ الزام اُس کے سر جائے گا۔..... خود اُس سے یہ حماقت سرزد ہوئی تھی کہ اُس نے اُن پانچوں آدمیوں کو اس حیثیت سے نہیں دیکھا تھا کہ اُن کی شکلیں بھی یاد رکھنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ وہ تو اب یقین کے ساتھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ان لوگوں میں وہ پانچوں بھی موجود ہیں یا نہیں۔

بالآخر اُسے اپنی کہانی بقیہ کو سنانی پڑی اور لوگ اُسے بُرا بھلا کہنے لگے۔ پھر کسی نے گہوارے پر سے چادر ہٹادی۔ لاش کفن میں لپٹی پڑی تھی۔ ایک آدمی نے مردے کا منہ دیکھا چاہا لیکن اُس نیک دل آدمی نے جواب کافی ذہین نظر آنے لگا تھا اُسے اس سے باز رکھا۔ اُس نے تجویز پیش کی کہ لاش کو ہاتھ لگائے بغیر یہ جنازہ جوں کاتوں کسی پولیس اسٹیشن پر لے جایا جائے۔ اُس کے اس مشورے کی مخالفت نہیں کی گئی تھی۔

جنازہ پر نیشن کے تھانے پر لایا گیا تھا۔ اور جب تھانے کے انچارج نے کفن کی ڈوری کھول کر مردے کا منہ دیکھنا چاہا تو مٹی کی ایک ہانڈی لڑھک کر گہوارے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔

لاش کا سر غائب تھا اور اُس کی جگہ ہانڈی رکھ دی گئی تھی۔ کلائیوں سے ہتھیلیاں غائب تھیں اور ٹخنوں سے پنچے الگ کر لئے گئے تھے ان کی بجائے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں بچ رہی تھیں۔ اس طرح جوڑ دی گئی تھیں کہ کفن کے اوپر سے پنچے معلوم ہوں۔

اور یہ کسی عورت کی لاش تھی جسم کی بناوٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ عمر بیس اور پچیس

بیاں رہی ہوگی۔ جلد سفید تھی۔

نیک دل آدمی کو پھر آگے آنا پڑا۔ پوری داستان دہرائی اُس نے اور شبہ میں اُسی وقت بائبل۔

تھانے کے انچارج کو کسی طرح باور نہ کرا سکا کہ اُسے اُن پانچوں آدمیوں میں سے بھی شکل یاد نہیں رہی تھی۔

سنی نیز واقعہ تھا، اس لئے بات فوری طور پر محکمہ سراغ رسانی تک جا پہنچی۔ لاش بھی شناخت تھی اس لئے بھلا کر مل فریدی کے علاوہ اور کون آگے آتا۔

مید تو چھوٹے ہی بولا تھا۔ ”احتمق تھے وہ پانچوں۔..... ارے اس جنازے کو سیدھے لے چلے آتے خواہ مخواہ راگبیروں کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی۔“

پھر پرسنن کے تھانے پہنچ کر اُس نیک دل آدمی سے پوچھا تھا۔ ”کیوں صاحب۔..... پکانی ہاؤز میں نہیں بیٹھتے۔.....!“

”نہیں جناب۔.....؟“ نیک دل آدمی نے اس عجیب سوال پر بولکھلا کر جواب دیا۔ ”یہی بات ہے، ورنہ پانچ ہزار جنازے آپ کے سر سے گذر جاتے لیکن آپ کے کان اُن نہ سنی۔“

”دوسری طرف فریدی لاش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُن سمجھوں کو تھانے کی کمپاؤنڈ میں لے رکھا گیا تھا، جنہوں نے اُس نیک دل آدمی کی ترغیب پر جنازے کے جلوس میں شرکت کی۔“

لاش کا جائزہ لے چکنے کے بعد فریدی نے اُن سے بھی کچھ سوالات کئے تھے پھر وہ اس سوال آدمی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”اُن میں کوئی ایسا نہیں جس نے آپ کی طرف اشارہ نہ کیا ہو۔“ فریدی نے اُس سے کہا۔ ”مجھے خود ہی اعتراف ہے جناب عالی کہ میں نے ہی انہیں ترغیب دی تھی۔“

”آپ نے اس جنازے کو کہاں دیکھا تھا۔“

”پنچا روڈ کے کراسنگ پر۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے۔“

”جی ہاں..... میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔“

”اُس وقت کتنے آدمی تھے۔“

”صرف پانچ۔“

”کسی ایک کا حلیہ بتا سکیں گے۔“

”کاش مجھے معلوم ہو تاکہ میں گڑھے میں گرنے جا رہا ہوں۔“

”کیا مطلب.....!“

”اُس صورت میں انہیں بغور دیکھ کر اُن کی شکلیں ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں۔“

”اس بھیڑ میں کسی کے متعلق بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بھی اُن پانچ

میں سے ہو سکتا ہے۔“

”نہیں جناب۔ اگر ایسا ممکن ہو تا تو بہت پہلے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال چکا ہوتا۔“

”ایک بار پھر کوشش کیجئے۔“ فریدی نے کہا اور اس بھیڑ کی طرف پلٹ آیا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے لاک اپ کے سلاخوں دار دروازے کے قریب

گزرتے رہے لیکن یہ شناختی پریڈ بھی ناکام رہی۔ وہ کسی کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ

کچھ نہ کہہ سکا۔

حوالات میں پہنچ جانے کے بعد وہ نیک دل آدمی بے حد ندوس نظر آنے لگا تھا۔

”میں کب تک یہاں رہوں گا۔“ اُس نے فریدی سے پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ ان حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ضابطہ

کاروائی بہر حال ضروری ہوتی ہے۔“

”یعنی اب مجھے کوئی ضامن بھی تلاش کرنا پڑے گا۔“

”مجبوری ہے..... وہ سبھی آپ ہی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور آپ کو

اعتراف ہے اس لئے قانون اُسی کی پابندی کرے گا جو ایسے حالات میں ضروری ہے۔“

”تو پھر براہ کرم میرے گھروالوں کو اطلاع بھجوا دیجئے، تاکہ وہ ضمانت کا انتظام کر سکیں۔“

”بہتر ہے..... میں ابھی محرر کو بھیجتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور پھر وہ دونوں انچارج

بکس میں واپس آگئے۔

”میری وائٹ میں تو لاش کی شناخت ناممکن ہے۔“ حمید بولا۔

”اور اب سارے شہر میں پوچھتے پھرئیے، اس جنازے کے متعلق جسے صرف پانچ آدمی

ہم پہنچے تھے۔“ انچارج بولا۔

”میرا خیال اس سے مختلف ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

انچارج استفہامیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم سیدھے وہیں پہنچیں گے جہاں سے جنازہ اٹھا تھا۔“ اس نے کہا اور

ہمارا گوشہ توڑنے لگا۔

”ہو سکتا ہے جناب، خدا کا شکر ہے کہ آپ تشریف لے آئے ورنہ میرے تو فرشتے

بچہ نہ کر سکتے اس سلسلے میں۔“

”اب اُس طرز کے گھروالوں کو اطلاع بھجوانے کی کوشش کیجئے۔“ فریدی نے اٹھتے

ہوئے کہا۔ ”اس کی ضمانت بھی آج ہی ہونی چاہئے۔“

”کچھ دیر بعد حمید لنکن میں بیٹھتا ہوا زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”اب ہم سیدھے وہیں

جائیں گے جہاں سے جنازہ اٹھا تھا کیونکہ اب وہاں خیرات بٹ رہی ہوگی۔“

”تم شاید اسے مذاق سمجھے ہو۔“ فریدی نے سوچ آن کرتے ہوئے کہا۔

”صاحب مجھے اس سے ذرا برابر بھی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ مذاق تھا یا حقیقت تھی.....

میں نے آج ہی چھٹی کے لئے درخواست دی ہے۔ یہاں کا موسم آج کل میری برداشت سے

بڑا ہے۔“

”کہاں جاؤ گے؟“ فریدی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”گازی چل پڑی تھی۔“

”کسی بھی مل اسٹیشن کا رخ کروں گا۔“

”تھا.....!“

مارت کے سامنے رک گئی۔

فریدی نے حمید سے بھی اترنے کو کہا..... وہ بے دلی سے اترا تو ضرور لیکن عمارت اگل ہونے کے سلسلے میں فریدی کا ساتھ دینے پر تیار نہیں تھا۔

”پلو.....!“ فریدی نے اُس کا بازو پکڑ کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

برآمدے میں پہنچ کر فریدی نے کال بل کا مٹن دبایا۔

شاید ایک منٹ بعد ایک بوڑھا آدمی باہر آیا تھا۔

”کیا مسٹر گومز تشریف رکھتے ہیں۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”میں ہی گومز ہوں..... فرمائیے۔“

”میں گوانیز کر سچین ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر سے معلوم کر کے آیا ہوں کہ آپ اپنی کات ایک حصہ کرایہ پر دینا چاہتے ہیں۔“

”جی ہاں.....!“

”مجھے ایک رہائشی مکان کی ضرورت ہے..... کتنے کمرے ہیں اس حصے میں۔“

”آپ کی تعریف.....؟“

”مجھے احمد کمال کہتے ہیں۔“

”اوہ..... دیکھئے مسٹر کمال..... مجھے افسوس ہے، ارادہ تو تھا کرائے پر اٹھانے کا

..... لیکن آج ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرا بھتیجا یو کے سے واپس آ رہا ہے، اس کے لئے

کارہائس کا مسئلہ درپیش ہو گا، اس لئے اب میں معذور ہوں۔“

حمید نے فریدی کے چہرے پر گہری مایوسی کے آثار دیکھے۔

”دوسری طرف بوڑھے کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا غصہ دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔“

حمید کو اس پر حیرت ہوئی۔ اُس کی دانست میں فریدی نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں

کہی تھی جس کی بناء پر بوڑھے کو کسی ناخوشگوار ذہنی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا۔

آخر بوڑھے نے کھر کھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا آپ نے سوسائٹی کے کسی کارکن

اس پر حمید نے ایک آزاد لطم شروع کر دی۔

تہائی آغاز ہے میرا تہائی انجام

تہائی سے بچ کر میں جاؤں گا کہاں

جگ بیتے دو تہا جانوں کی تہائی ٹوٹی تھی

اُن کی یکجائی نے میری تہائی کو جنم دیا۔

تہائی آغاز ہے میرا تہائی انجام

جن کی تہائی ٹوٹی تھی، اُن کو سات سلام

”بیچارے والدین۔“ فریدی نے ٹھنڈی سانس لی۔ لیکن تیسرے مصرعے میں ”نہ“

زائد ہے، چوتھے مصرعے میں ”دیا“ زائد ہے، دوسرا مصرعہ بھی ناقص ہے۔“

”آزاد لطم ہے۔“ حمید نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”مادر پدر آزاد ہوگی..... ورنہ آزاد لطم کے لئے بھی کچھ پابندیاں ہیں۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ہر قسم کی پابندی پر۔“

”پھر غالباً رات کا کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

”کیوں.....؟“

”پابندی ہی ٹھہری معدے کی۔“

”میں چھٹی چاہتا ہوں چھٹی..... سمجھے آپ۔“

”اوہ ہم چرچ روڈ کے کراسنگ پر پہنچ گئے ہیں۔“ فریدی نے کہا اور چوراہے سے

قدر آگے بڑھ کر گاڑی روک دی۔

پھر وہ نیچے بھی اتر گیا لیکن حمید وہیں بیٹھا رہا..... سنیچر کی شام اور اس طرح غار

ہو جائے؟ وہ سوچتا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔

قطعی نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ فریدی گاڑی سے کیوں اترا تھا اور اب کیا کر رہا ہے، بلکہ

دوسری سمت دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی واپس آ گیا اور گاڑی پھر چل پڑی اور پھر جی۔ سی۔ ایچ سوسائٹی۔

کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔

”جی نہیں.....!“ فریدی نے سادگی سے جواب دیا۔

”پھر.....؟“ بوڑھے کا لہجہ جھٹکا تھا۔

”نہ اس نے نام پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا..... ویسے کیا ابھی تک آپ لوگوں نے اپنا پرانا اصول تبدیل نہیں کیا۔“

”جی نہیں.....“ بوڑھے نے غصیلے لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے مڑی رہا تھا۔

فریدی بولا۔ ”ڈرانسنے..... ایک منٹ۔“

”فرمائیے.....!“ وہ جھلا کر بولا۔

”اگر میں اپنا نام ولیم جوزف بتاتا تو.....؟“

”بس ختم کیجئے..... ہاں..... ہم نہیں چاہتے کہ کوئی غیر کرئین ہماری سوسائٹی

میں آباد ہو۔“ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”ایسا نہ کہئے..... ابھی حال ہی میں میرے ایک غیر عیسائی دوست نے یہاں ایک

عمارت کرائے پر حاصل کی ہے۔“

”جی ہاں..... میں جانتا ہوں، لیکن اس نے فراڈ کیا تھا۔ خود کو عیسائی ظاہر کر کے

مکان کرائے پر حاصل کیا تھا..... اب اگر اس نے فوراً ہی مکان خالی نہ کیا تو سوسائٹی اس کے

خلاف فریب دی کا مقدمہ قائم کر دے گی۔“

”اوہ..... تو کیا اس کے فراڈ کا علم ہو گیا ہے لوگوں کو.....!“

”اگر اس کے خاندان میں آج کسی کی موت نہ ہو جاتی تو شاید ہم اُسے عیسائی ہی سمجھ

رہتے۔ جنازہ تو بہر حال لے جانا ہی پڑا۔“

”آج موت ہوئی ہے کسی کی۔“ فریدی نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”جی ہاں۔“ بوڑھے کا لہجہ اب بھی درست نہیں ہوا تھا۔

”اوہ..... تب تو مجھے وہاں جانا چاہئے لیکن مکان کا نمبر یاد نہیں رہا۔ کیا اس سلسلے

آپ میری راہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن اگر اُس نے غلط نام بتا کر مکان حاصل کیا تھا تو یہ بڑی

تھی۔“

”ہائیں جانب جو پہلی سڑک گھومتی ہے اسی پر جیمز ولا.....!“ بوڑھے نے کہا اور اس

رہی چلا گیا۔

فریدی بھی واپسی کے لئے مڑ گیا۔

”یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”دیکھا کتنی آسانی سے اس عمارت کا پتہ چل گیا جہاں سے جنازہ اٹھایا گیا تھا۔“

”آخر کیسے۔“

”ابھی بتاؤں گا.....!“ فریدی گاڑی میں بیٹھتا ہوا بولا۔

گاڑی کچھ دور چل کر بائیں جانب مڑی اور پھر ٹھیک جیمز ولا کے سامنے رک گئی۔

چوٹی سی عمارت تھی۔ سامنے پختہ برآمدہ تھا اور پھر رہائشی کمروں کا سلسلہ شروع ہو گیا

بائیں باغ نہیں تھا۔ برآمدے کے نیچے حالانکہ کچی زمین تھی لیکن پھر بھی یہاں کیاریاں

بنائی گئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے مکینوں کو اس سے دلچسپی نہ رہی ہو۔

فریدی نے گاڑی برآمدے کے قریب ہی روکی تھی اور متواتر ہارن بجائے جا رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں برآمدے میں چل کر گھٹی بجائیے۔“ حمید نے کہا۔

”نفسوز ہے..... اندر کوئی نہ ہو گا۔“ فریدی نے جواب دیا اور ہارن بجاتا رہا۔

تھوڑے ہی فاصلے کی ایک عمارت سے ایک آدمی برآمد ہوا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا

کے قریب آکر رک گیا۔

”کس کی تلاش ہے۔“ اس نے پوچھا اور حمید نے اس کے لہجے میں بھی ناخوشگوار

نہ کی۔

فریدی نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے جیمز ولا کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔

”جنازہ گیا تھا۔“ اس نے برا سامنے بتا کر کہا۔ ”ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا۔“

”تمنا سخت الجھن میں ہوں۔“ فریدی نے پر تشویش لہجے میں کہا۔ ”آخر کس طرح لے

گئے تھے تدفین والی گاڑی آئی ہو گی۔“

”رنگت.....!“

”رنگت یقیناً سرخ و سفید تھی..... بال بھی اخروٹ کے رنگ کے تھے لیکن وہ اہل
نہ کی طرح اردو بولتی تھی۔ لب و لہجہ میں اجنبیت نہیں تھی۔“

فریدی مزید کچھ پوچھنے والا تھا کہ پشت سے آواز آئی۔ ”کیا وہ لوگ واپس آگئے؟“
آواز میں اتنی سیکس اپیل تھی کہ حمید بے اختیارانہ انداز میں مڑا تھا۔ سوال کرنے والی
نہی نظر میں دل لوٹنے والی ثابت ہوئی۔

کھلتی ہوئی گندی رنگت تھی، اور بوجھل پلکوں والی، بڑی بڑی آنکھیں، چہرہ بھرا بھرا
اوپری ہونٹ پر سبزی مائل ہلکی سی روئیدگی تھی اور ہونٹ تو ایسے لگتے تھے جیسے اجتنا کے
ہاتھ نے تراشے ہوں۔

ساری اور آدھے پیٹ کی نمائش کرنے والے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کا اصل حسن تو
علاء کا تناسب ہی تھا۔

عمر میں اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔
مالک مکان جو اُسے غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا، ہاتھ جھٹک کر بولا۔ ”اپنا کام کرو.....
نہی کیوں فکر ہے۔“

لیکن لڑکی نے اُس کے لہجے کی پرواہ کئے بغیر پوچھا۔ ”یہ لوگ کون ہیں! کیا ان کے عزیز ہیں۔“
”جاذ یہاں سے۔“ مالک مکان غریبا۔

”ایسا بھی کیا۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”نہیں محترمہ ہم اُن کے عزیز نہیں ہیں۔“
”تو پھر اُن کے ہم مذہب ہوں گے۔ کر سچین تو ہر گز نہیں ہو سکتے۔“ لڑکی نے کہا۔

فریدی پھر دروازے کی طرف مڑ کر قفل کا جائزہ لینے لگا تھا۔ شاید اس نے اُن کی گفتگو
نہ اُگل انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”کیا ہماری پیشانیوں پر تحریر ہے کہ ہم کر سچین نہیں ہیں۔“ حمید نے مسکرا کر پوچھا۔
”یہ بات نہیں..... یہاں کسی نے بھی اُن بچاروں کی پرواہ نہیں کی کیونکہ وہ کر سچین
نہ تھے۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ اپنی کسی انجمن کو فون کر کے جنازہ والی گاڑی منگوا لے

”نہیں کا نہ ہوں ہی پر لے گئے تھے؟“ جواب ملا تھا۔

”اوپہ تو کچھ اعزہ کو خبر ہو گئی ہوگی..... کتنے آدمی تھے؟“

”پانچ آدمی تھے۔“

”مالک مکان سے کہاں ملاقات ہو سکے گی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”کیوں؟“ تیکھے لہجے میں کہا گیا۔

”میرا خیال ہے اب وہ لوگ واپس نہ آئیں گے..... کیوں کہ یہاں سب ہی جان

ہوں گے کہ وہ کر سچین نہیں تھے؟“

”آپ کون ہیں.....؟“

”میں نے آپ سے مالک مکان کے متعلق پوچھا تھا.....؟“

”میں ہی ہوں مالک مکان۔“ اس کا لہجہ بے حد غصیلی تھا۔

فریدی نے اپنا کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ لے کر بڑی لاہ
سے اس پر نظر ڈالی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں حمید نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے
”سی۔ آئی۔ بی۔“ اس نے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔

”جی ہاں..... میں آپ کی موجودگی میں اپنے طور پر مکان کی سلاشی لینا چاہتا ہوں۔“

”وارنٹ..... میرا مطلب ہے سرچ وارنٹ ہے آپ کے پاس۔“

”اس کی فکر نہ کیجئے۔“

”کیا کوئی گڑبڑ ہے۔“

”آئیے۔“ فریدی کی گاڑی سے اتر کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

وہ برآمدے میں آئے اور مالک مکان ان کی طرف مڑ کر بولا۔ ”لیکن یہ تو قتل؟“

”یہاں کتنے لوگ رہتے تھے؟“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”وہ..... غالباً میاں بیوی تھے۔“

”عورت غیر ملکی تھی۔“

”یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ ساری یا فراک اور شلوار پہنتی تھی۔“

لیکن اُس نے کہا کہ گوانیز کرچین ہاؤسنگ سوسائٹی کا پتہ سن کر کوئی یقین نہ کرے گا۔ سمجھیں گے کہ کوئی بد معاش آدمی اُن کا وقت برباد کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ کہتا ہے پیارا۔ کون یقین کرے گا کہ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں کسی غیر کرچین کا بھی رہا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے علاوہ اور کسی کو بھی خدا نے نہیں پیدا کیا۔ وہ اپنی بد بختی بناء پر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔

”یہاں..... وہی پانچوں تولے گئے تھے۔“
”یقیناً کہاں سے آئے تھے۔“
”پتہ نہیں..... میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اُوہ آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں ان کے شاسا بھی نہ ہوں..... پھر..... یہاں..... کیوں؟“

”اُوہ..... دراصل..... ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود کو عیسائی ظاہر کر کے کیوں آئے تھے۔“

”اس لئے کہ ہر آدمی کو حق حاصل ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر جہاں چاہے رہے۔“
”آواز جوش کی شدت سے کانپ رہی تھی۔“ اس عمارت کا چونا گارا اسٹینس وغیرہ کوئی بنانی ماں کے پیٹ سے ساتھ نہیں لایا تھا۔“
”دیکھو.....!“ مالک مکان نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

”پلیز.....!“ فریدی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔
”لوکی کہتی رہی۔“ وہ یہاں رہنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ بستی پسند تھی، لہذا انہیں یہاں رہنے کے سلسلے میں تھوڑا سا فراڈ بھی کرنا پڑا۔ میں پوچھتی ہوں آخر ان کے یہاں قیام نے عیسائیت یا عیسائیوں کو کیا نقصان پہنچا۔ کوئی بتائے مجھے۔ یا کہ وہ عیسائیوں سے معلوم ہوئے تھے۔ اگر گھر میں ایک موت نہ ہو جاتی تو قیامت تک کسی کو اُن کی اصلیت نہ چل سکتا..... یا خدا اب تو عیسائیوں کے دم لگا کر پیدا کیا کرتا کہ وہ آسانی سے نہ جا سکیں۔“

”خاموش رہو۔“ مالک مکان مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔
”آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔“ فریدی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”میرا وہ لوکی انہیں کار کی طرف جاتے دیکھتے رہے۔“
”تمہاری گاڑی بڑی شاندار ہے۔“ لوکی نے کہا۔

”دیکھو..... حد ہوتی ہے۔“ مالک مکان پہلے سے بھی زیادہ بھر کر بولا۔ ”تمہارے باپ سے شکایت کروں گا..... سمجھیں۔“
”وہ بھی کرچین ہیں۔ تمہارا عی ساتھ دیں گے۔“
”جلی جاؤ یہاں سے۔“

دفتر فریدی ان کی طرف مڑ کر مالک مکان سے بولا۔ ”میں یہی پسند کروں گا کہ آپ با دیر تک بالکل خاموش رہیں۔“
مالک مکان نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ فریدی پھر فٹ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”تو آپ کو اُن لوگوں سے ہمدردی تھی؟“ حمید نے پوچھا۔
”بڑی پیاری لڑکی تھی، میں اس کے لئے مغموم ہوں۔ پتہ نہیں اچانک کیسے مر گئی۔“
”پچھلی شام تک میں نے اُسے برآمدے میں چہل قدمی کرتے دیکھا تھا۔ بالکل اچھی تھی۔“
”کہ چہرے سے تھکن بھی نہیں ظاہر ہوتی تھی۔ مجھے دیکھ کر سر ہلایا تھا اور بڑے دلکش انداز میں مسکراتی تھی۔“

”اور..... اور..... شوہر.....!“ حمید نے پوچھا۔
”اُس سے بہت کم ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ٹریولنگ ایجنٹ تھا کسی تجارتی کمپنی کا۔“
”زیادہ تر تنہا ہی تھی۔“

”بالکل تنہا.....؟“
”نہیں ایک بوڑھا ملازم بھی تھا۔“

”ایئر کنڈیشنڈ لنکن.....!“ حید کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔

”تم لوگ کون ہو؟“

”ہمیں سوسائٹی کے دفتر سے اس کام پر معین کیا گیا ہے۔“

”کس کام پر۔“

”یہ معلوم کریں کہ وہ فراڈ کر کے یہاں کیوں آئے تھے۔“

”صورت سے ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو اور کر سچیں بھی نہیں معلوم ہوتے۔“

”ہاں تو..... مرنے والی کا شوہر..... کیا اُس کے متعلق کچھ نہ بتاؤ گی۔ صورت نم“

سے مراد ہے میری۔“

”خوبصورت تھا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”اپنی بیوی کی طرح تو نہیں لگے۔“

بہر حال وجہ یہ تھا۔ پچیس اور تیس کے درمیان سمجھ لو۔“

”کوئی خاص پہچان.....!“

”نہیں کوئی ایسی نمایاں خصوصیت تو نہیں تھی..... متوسط قد تھا..... جامد“

معمولی تھی۔ البتہ خوش لباس اور جامہ زیب تھا۔ اس خصوصیت کی بناء پر لڑکیاں ضرور اُس کے

طرف متوجہ ہو سکتی تھیں۔“

”اور ملازم.....!“

”بوڑھا اور صورت حرام تھا۔ خاموشی سے بھی دیکھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کانٹے“

دوڑے گا۔“

”اس کی کوئی نمایاں خصوصیت۔“

”یہی سب سے بڑی نمایاں خصوصیت تھی شکل دیکھ کر کلکھنے کے تصور ذہن میں“

ابھرتا تھا۔“

”تو وہ لڑکی پسند تھی آپ کو.....؟“

”بہت..... مجھے بہت اچھی لگتی تھی..... لیکن اُس سے مل بیٹھنے کا کبھی اتفاق نہیں“

ہوا تھا۔ بس ہم شاساؤں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلاتے تھے۔ مجھے اس کی

بہت اچھی لگتی تھی۔“

”مکھلے جٹنے والے بھی آتے ہوں گے۔“

”میں نے ایک کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ اکثر رات کو آتا تھا اور وہ اُس کی لمبی“

پانی میں بیٹھ کر کہیں جاتی تھی۔“

”اُس نے والے کا حلیہ۔“

”جلد کیا بیان کروں..... میرا خیال ہے کہ میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”یعنی..... کون تھا۔“

”وزارت خارجہ کا کوئی بڑا آفیسر.....!“

”کیا.....؟“

”میرا خیال ہے میں نے کہیں اُس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ عہدہ یاد نہیں رہا۔ اُس کی“

لی نمبر پلیٹ پر نمٹری آف فارن افیئرس بھی تحریر تھا۔“

”اوہ تو آپ اس کی ٹوہ میں بھی رہتی تھیں؟“

”اُسے دیکھ کر ایک خواہش پیدا ہوتی تھی دل میں۔“

”کیسی خواہش.....!“

”یہ کہ..... کاش خدا نے مجھے مرد بنایا ہوتا۔“

”اُسی لئے آپ اس کی ٹوہ میں رہتی تھیں۔“

”افتخار ترک کی طرف سے ایک غراتی ہوئی سی آواز آئی۔“ جولی۔“

”وہ وہ بوکھلا کر مڑی۔ حید بھی دیکھنے کے لئے مڑا تھا۔“

”ایک قد آور اور گھنی مونچھوں والا آدمی لڑکی کو گھور رہا تھا“

”اوہ..... ڈیڈی.....!“ وہ مردہ سی آواز میں بولی۔“

”تم کہاں کیا کر رہی ہو۔“

”لگ..... کچھ نہیں..... بس یونہی.....!“ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔“

”نہ نے دونوں کو وہاں سے جاتے دیکھا۔ پھر وہ قریب ہی کی ایک عمارت میں“

داخل ہو گئے۔

ایک ٹھنڈی سانسِ حمید کے گٹھے ہوئے سینے سے آزاد ہوئی۔ لڑکی کے چلنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

”اور وہ آدمی جس نے اُسے آواز دی تھی؟“

”جیری وکٹر..... اس کا باپ.....؟“

”ہاں کرتا ہے۔“

”غیر متحرک ہے۔“

”سرکاری یا پرائیویٹ.....!“

”پرائیویٹ..... ذاتی ورکشاپ رکھتا ہے۔“

”یہاں نے والی سے لڑکی کی دوستی تھی۔“

”پتہ نہیں؟“ مالک مکان نے اُسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ کہہ

تھی۔“

حمید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ مالک مکان کے لہجے میں بیزاری تھی۔ ”میں بہت مصروف آدمی ہوں

ی خبر ہوتی ہے کہ گرد و پیش کیا ہو رہا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس مخلوط الحواس لڑکی

غائب سے بہت سی باتیں کی ہیں۔“

”مخلوط الحواس کیوں؟“

”وہ مذہب کا مضحکہ اڑاتی ہے..... کہتی ہے کہ کرائسٹ بھی آدمی ہی تھا..... جو

بہاؤ کو زندہ رکھنے کے لئے سولی پر چڑھ گیا۔“

”وہ خود کیا کرتی ہے؟“

”باتیں بنانے کے علاوہ اور کبھی کچھ کرتی نہیں دکھائی دی۔“ مالک مکان نے تلخ لہجے

میں کہا۔

”آپ اُس سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”اُس سے یہاں کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ وہ جو بوزھوں کا مضحکہ اڑائے اسے کیا کہیں

”کوہ.....!“

اور وہ تصویر

مالک مکان اور فریدی پھر برآمدے کی طرف واپس آ رہے تھے۔ دروازے کے قریب

رکتے ہوئے فریدی نے مالک مکان سے کہا۔ ”آپ ہر پوچھنے والے سے یہی کہیں گے کہ:

سوسائٹی کے دفتر کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“ مالک مکان نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

فریدی نے رسواچ پر نظر ڈالتے ہوئے حمید سے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو.....“

ابھی آیا۔“

حمید سر کو جنبش دے کر مالک مکان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ الجھن میں تھا۔ آخر اتنی جلدی وہ ٹھیک اسی جگہ کیسے آپہنچے جہاں پر واردات ہوئی تھی

ویسے وہ اس لڑکی کو دیکھ لینے کے بعد کسی قسم کی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اُس

سریلی آواز کی بازگشت اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ چند لمحوں پر تفکر انداز میں مالک مکان کے چہرے پر نظر جمائے رہا پھر بولا۔ ”تیرا

کون تھی؟“

”جولی وکٹر.....!“ مالک مکان نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کہاں رہتی ہے؟“

”سامنے.....!“ اُس نے سڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”نہیں.....!“ فریدی نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی.....!“ دفعتاً مالک مکان گھکھلیا۔ ”اب اسے دوسروں کے لئے سوسائٹی

باجب سے رہنے دیجئے۔“

”کیوں.....؟“

”مجھے لوگوں کے سوالات کے جواب دیتے دیتے تنگ آگیا ہوں، اگر انہیں یہ معلوم

ہو کہ محکمہ سراغ رسانی خود بخود اس طرف متوجہ ہو گیا ہے تو میں انہیں اس کی وجہ کیا

سگا۔“

فریدی فوراً ہی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حمید سے کہا۔ ”اچھی بات ہے اسے

ہائی ہی کی حد تک رکھو۔“

حمید سڑک کی طرف مڑا..... سامنے والی عمارت کی ایک کھڑکی میں جولی کا چہرہ

دکھ رہا تھا اور وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً اس نے ہاتھ اٹھا کر کچھ اس قسم کا اشارہ کیا جیسے اُسے عمارت کی پشت پر آنے کو

دہی ہو۔ حمید سر کی جنبش سے اس تجویز پر صاد کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ عمارتوں کے درمیانی راستے سے گذرتا ہوا ٹھیک اسی عمارت کی پشت پر رکا۔

غالباً یہیں اس بستی کا اختتام ہوا تھا۔ عمارت سے تھوڑے ہی فاصلے پر زمین ڈھلوان

تھی اور پھر کھیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔

لڑکی ایک دروازے سے نکلتی دکھائی دی..... اور اُس نے پھر ہاتھ اٹھا کر غالباً کھیتوں

کی طرف اشارہ کیا۔

حمید نے اپنی گدی سہلائی اور آگے بڑھ کر ڈھلان میں اترتا چلا گیا..... یہ کوئی خشک

زمین تھی۔ تھوڑی سی نیچی تھی کہ وہاں تک پہنچ جانے کے بعد عمارتوں کی صرف چھتیں

نکری تھیں۔

حمید وہیں رکا گیا..... لڑکی تیزی سے نیچے اتر رہی تھی۔ پھر وہ اس کے قریب بھی

نہیں گئی۔ لیکن خاموش کھڑی ہانپتی رہی۔ شاید دوڑتی ہوئی ڈھلان کے سرے تک آئی تھی۔

”ابھی کل ہی کی بات ہے..... مسٹر برکت مسج جو بہت بوڑھے ہیں ادھر سے گذر

رہے تھے ان کا راستہ روک کر کہنے لگی۔ آخر اب کس امید پر جی رہے ہو۔ وہ بیچارے پریشان

ہو گئے..... لیکن انہوں نے ہنس کر بات اڑانی چاہی بس سر ہی تو ہو گئی کہنے لگی..... اب

جلدی سے مر جاؤ..... کسی تو اتنا جسم کے حصے کی روٹیاں کیوں ضائع کر رہے ہو۔“

”جینس معلوم ہوتی ہے.....“ حمید پر تھمیں لہجے میں بولا۔

”پاگل ہے۔“ مالک مکان نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ مزید کچھ کہنے والا تھا کہ فریدی کی کار

آکر رکی اور وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کار سے اتر کر وہ سیدھا برآمدے ہی میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے ان میں

سے ایک اس نے مالک مکان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے پڑھ کر دستخط کر دیجئے۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”سی آئی بی کے سربراہ سے آپ کی درخواست۔ آپ نے اس میں ہمارے ٹکے کو اس

فراڈ سے آگاہ کرتے ہوئے تشویش ظاہر کی ہے کہ وہ لوگ آپ کے مکان میں کوئی غیر قانونی

حکمت کرتے رہے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”میں فوری طور پر مکان کی تلاشی لے سکوں گا۔“

”لہلہ..... لیکن.....!“

”فکر نہ کیجئے..... اس کی ذمہ داری آپ پر نہ ہوگی۔ اسی لئے تو میں آپ سے ضابطہ

کی کارروائی کے لئے استدعا کر رہا ہوں۔“

مالک مکان نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس پر اپنے دستخط کر دیئے۔

اب فریدی مقفل دروازے کی طرف متوجہ ہوتا ہوا حمید سے بولا۔ ”تم دوسرے

پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کر سکتے ہو۔“

”یعنی اب ہم ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر کی طرف سے پوچھ گچھ نہیں کر رہے؟“

حمید نے پوچھا۔

میری مرضی۔“

پھر کیوں دوڑی آئی تھیں۔“

نص ایسی سے متعلق گفتگو کرنے کیلئے۔ مجھے اس کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔“

مجھے حیرت ہے کہ اُس سے ملنا جلنا بھی نہیں تھا اور گہرا صدمہ بھی پہنچا ہے۔“

”کیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں ایسی باتیں۔“

”میں شاعر بھی ہوں۔“

”نزل وزل کہہ لیتے ہو گے۔“ وہ بُرا سامنہ بنا کر بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ورنہ آپ سے الجھ پڑتا۔“

”اردو ادب پر گہری نظر ہے میری۔“

”آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا۔“ حمید نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”تمہارے ساتھی کے بارے میں کچھ پوچھنے کے لئے۔“

”ہائیں..... میرے ساتھی سے تمہیں کیا سروکار.....!“

”کیادہ مرنے والی کا کوئی عزیز ہے۔“

”کیوں.....؟“

”اُس لڑکی کی آنکھیں بھی ایسی ہی خوں ناک تھیں..... اور مجھے دراصل اس کی

نہایت زیادہ اچھی لگتی تھیں۔“

حمید نے ٹھنڈی سانس لی اور منہ چلانے لگا۔

”مگر وہ بہت مغرور معلوم ہوتا ہے۔“ لڑکی کہتی رہی۔ ”اُس نے ایک بار بھی میری

نہیں دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ کم از کم ایک بار تو نظریں ملتیں۔“

”اے..... اے..... تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔“

”کیا..... یہ میری خواہش تھی۔ محض یہ تجربہ کرنا چاہتی تھی کہ میرے جسم میں

نامیروں دوڑتی ہیں یا نہیں جیسی اس سے نظر ملتے ہی دوڑ جاتی تھیں۔“

”انہما بس اب کام کی باتیں کرو۔“

سانسوں کے ساتھ جسم کا اتار چڑھاؤ بڑا دلآویز معلوم ہو رہا تھا۔ وہ براہِ راست حمید کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور حمید احمقانہ انداز میں پلکیں جھپک رہا تھا۔ آخر وہ خود ہی بولی۔

”دیکھو..... میری زبان سے ایک غلط بات نکل گئی تھی۔“

”کون سی بات.....!“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے اُس آدمی کی تصویر کہیں نہیں دیکھی تھی..... میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی

بہت بڑا آفیسر ہے۔“

”تو پھر نمبر پلیٹ والی بات بھی.....!“

”نہیں..... نہیں..... وہ بالکل ٹھیک ہے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ پر منسٹری آف فارن

افئیرز لکھا ہوا تھا۔“

”لیکن اندازے سے آپ اسے کوئی بڑا آفیسر کس بناء پر سمجھ سکتی ہیں۔“

”شاندار آدمی ہے..... بے حد وجہہ.....!“

”میرے ساتھی سے بھی زیادہ.....!“ حمید نے پوچھا۔

”اوہ..... تمہارا ساتھی۔“ لڑکی نے طویل سانس لی اور خاموش ہو گئی پھر تھوڑی دیر

بعد بولی۔ ”نہیں اتنا شاندار نہیں تھا۔“

”بہت خوب.....!“ حمید مضحکانہ انداز میں ہنس پڑا۔

”کیوں.....؟“ اس نے تھکے لہجے میں پوچھا۔

”وہ میرا کلرک ہے..... اور میں ایڈووکیٹ ہوں۔“

”ہوں.....!“ وہ بُرا سامنہ بنا کر رہ گئی۔

”لہذا یہ قطعی غلط ہے کہ شاندار اور وجہہ آدمی بڑے آفیسر ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔“

”آجکی ہاؤسنگ سوسائٹی کے سیکریٹری نے ہمیں اس معاملے کی تفتیش پر مامور کیا ہے۔“

”تب تو میں ہرگز تم سے اس لڑکی کے متعلق گفتگو نہیں کروں گی۔“

”کیوں.....؟“

”کیا مطلب.....!“

”مطلب یہ کہ تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا۔“

”اُس سے کسی طرح ایک بار نظر ملوادو۔“ لڑکی گھکھکی۔

”کیا تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”نہیں..... ہر گز نہیں۔“

”ہا ہا ہو جائے گا۔ کیونکہ ابھی تک اس نے کرپین ہاؤسنگ سوسائٹی کے لوگوں کے بڑی ادواہیں نہیں سنی تھیں۔ عام طور پر خیال تھا کہ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے مہذب و کردار کے مالک ہیں۔“

”چپ چاپ چڑھائی کی طرف بڑھتا چلا گیا..... مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارہ کی۔“

”سوچ رہا تھا کہ آخر پڑوسیوں سے کیا پوچھتا پھرے۔ ہو سکتا ہے فریدی کا اشارہ صرف کی طرف رہا ہو۔“

”لیکن یہ لڑکی؟“

”کچھ دیر بعد وہ پھر اسی عمارت کے سامنے نظر آیا جہاں فریدی کو چھوڑا تھا..... لیکن اب کہاں تھی؟ دروازہ بھی مقفل نظر آیا..... مالک مکان کا کہیں پتہ نہ تھا۔“

”کیا مصیبت ہے؟ جھنجھلاہٹ میں مبتلا ذہن سوچنے لگا۔ کوئی تک ہے اس زیادتی کی؟ اب کے لئے ٹیکسی تلاش کرتے پھرے۔“

”دفن مالک مکان پھر اسی عمارت کے پھاٹک پر نظر آیا جہاں پہلے دیکھا گیا تھا۔ حمید تیزی ل کی طرف بڑھا۔“

”اوہ..... آپ ابھی یہیں ہیں جناب.....!“ اس نے حمید سے پوچھا۔

”جی ہاں..... کیا..... میرے لئے کوئی پیغام ہے؟“

”جی نہیں..... کیا پیغام۔“ مالک مکان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ..... کرئل صاحب۔“

”جی نہیں..... انہوں نے مجھ سے آپ کے لئے کچھ نہیں کہا۔ مکان کے بارے میں میں نے اسے محکمے کی اجازت حاصل کے بغیر دوبارہ نہ تو کھولا جائے اور نہ وہاں کی کسی بات لگایا جائے۔“

”کیا انہوں نے کہا تھا کہ آپ مجھ تک یہ اطلاع ضرور پہنچائیں؟“

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”بس ختم کرو۔“ حمید کا لہجہ بے حد خشک تھا۔ ”اگر کسی نے ہمیں یہاں اس نالے میں کھڑے دیکھ لیا تو۔“

”میں نہیں ڈرتی ان چیزوں سے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”بلکہ اگر کوئی کسی قسم کے شے بڑھتا ہو کر میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کہتا ہے تو ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتی ہوں۔“

”ارے تم تو لذتوں کی فیکٹری معلوم ہوتی ہو۔“

”اچھا جملہ ہے..... پسند آیا۔“

”یہ بڑی مونچھوں والا کون تھا جسے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگی تھیں؟“

”مسٹر جبری وکٹر..... مائی قادر..... مسٹر وکٹر اور قادر کے توانی کیسے رہے! کیوں؟“

”میرا وقت نہ برباد کرو.....“ حمید چڑھائی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”ٹھہرو.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”اگر میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھا“

”تو بڑی زحمت میں پڑ جاؤ گے وکیل صاحب۔“

”کیا مطلب.....!“

”اگر تمہارا گریبان پکڑ کر چیخنا شروع کر دوں تو کیسی رہے۔“

”مزہ آجائے۔“ حمید آنکھیں بند کر کے بولا۔ ”میں خود کو لذتوں کا پرنٹنگ پریس محسوس کرنے لگوں گا۔“

”اچھا جاؤ دفع ہو جاؤ..... میں تمہیں دیکھ لوں گی۔“

”حمید بچ مچ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر کسی نے انہیں یہاں اس نالے میں کھڑے دیکھ لیا تو“

”آپ نہیں جانتے۔“

”تلفی نہیں۔ ہم جیسے لوگ تو صرف احکامات کے پابند ہوتے ہیں۔“

”اؤہ.....!“

پھر وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ حمید تیزی سے دوسری طرف مڑ گیا۔ چرچ روڈ تک ہی جاتا تھا کیونکہ دور دور تک کوئی ٹیکسی نہیں دکھائی دیتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ فارن آفس کے کسی ایسے بھٹی کا پتہ لگنا دشوار نہ ہو گا جو بہت سوشل انجیل اتنی ہی معلومات کافی ہیں یہاں سر کھپانے سے کیا فائدہ۔

اچھی طرح اندھیرا پھیل گیا تھا اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے الیکٹرک پولس کے بگائے لگے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چرچ روڈ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک بائیں جانب ایک اسکوٹر درپلے سے قہقہے کی آواز آئی۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ اس لئے بے ساختہ مڑنا پڑا۔

جولی وکٹر مضحکہ انداز میں ہنس رہی تھی۔ لیکن حمید کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ کسی کے پردھیان دیتا۔ وہ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کو دیکھتا رہ گیا۔ سیاہ جین اور ہلکی ٹرٹ میں گویا قیامت سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”اؤہ..... کہاں جانا چاہتے ہو..... میں پہنچا دوں۔“ اُس نے بڑے بے تکلفی سے

”تخت..... تم پہنچا دو گی۔“

”ہاں آؤ جلدی کرو“

”مج کے اخبارات خوب فروخت ہوں گے۔“

”کیا مطلب.....!“

”میں نے ابھی تک اس شہر میں ایسی کوئی بدعت نہیں دیکھی۔“

”جلدی سے صاف صاف کہو..... کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”تم پیچھے بیٹھو گی..... میں چلاؤں گا۔“

حمید وہاں سے ہٹ کر پھر سڑک پر آگیا۔ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا ضروری ہے؟

لیکن کیا پوچھ گچھ کی جائے؟ اؤہ ٹھیک..... اُس کار کے بارے میں جس کا تیز کرنے کیا تھا؟ لیکن ضروری نہیں کہ وہ سچ ہی بول رہی ہو۔

حمید پھر مالک مکان کی طرف پلٹا۔

”ایک بات.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کیا یہاں کبھی آپ نے کوئی ایسا دیکھی ہے جس کے نمبر پلیٹ پر مشنری آف فارن افیئرز لکھا رہا ہو۔“

”اکثر دکھائی دیتی تھی.....“ مالک مکان نے اکتائے ہوئے لہجے میں لاپرواہی سے

”کیا وہ کوئی بہت وجہ آدمی تھا۔“

”ارے بھٹی صاحب ہوتے تھے اُس پر.....!“

”کون بھٹی.....؟“

”ممکن ہے آپ نہ جانتے ہوں..... وہ تو بہت مشہور آدمی ہیں۔ بہت سوشل

میں نہیں جانتا کہ ان کا عہدہ کیا ہے۔“

”کار خود ڈرائیو کرتا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ خود ہی ڈرائیو کرتے تھے۔“

”لڑکی اس کے ساتھ باہر بھی جاتی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

اُس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”دیکھئے!

میں دل کا مریض ہوں۔ آج بہت زیادہ ذہنی جھٹکے لگے ہیں۔ براہ کرم یہ بتا دیجئے کہ آ

ٹھکے اچانک اس طرف کیسے متوجہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ خود کو عیسائی ظاہر کر کے کوئی مکان

پر حاصل کر لینا ایسا بڑا جرم نہیں ہے جس کے لئے ٹھکے سراغ رسانی کو حرکت میں آنا پڑے۔

”آپ کو یہ سوال میرے چیف سے کرنا چاہئے تھا۔“

”آپ ہی کرم کیجئے میرے حال پر ورنہ مجھ پر دل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے اپنی لاعلمی پر۔“

”کیوں.....؟“

”لوگ کہیں گے کیسا ناقص شہر یا بوائے فرینڈ ہے کہ خود پیچھے بیٹھا ہوا ہے۔“

”اب تو تمہیں پیچھے ہی بیٹھنا پڑے گا۔“

”کوئی زبردستی ہے..... میں پیدل جاؤں گا۔“

”رحمت میں پڑو گے..... اگر میرا کہنا نہ مانا۔“

”کیا کرو گی تم.....!“

”وہی پرانا حربہ..... شور مچانا شروع کر دوں گی۔ لوگ اکٹھا ہو جائیں گے۔“

حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اچھی بات ہے.....“

لیکن.....!“

لیکن جملہ ”لیکن“ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

حمید کو اس مسئلہ خیزی پر ہنسی آرہی تھی۔ لوگ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے اور اسکوٹر برق رفتاری سے اڑا جا رہا تھا۔

وہ قطعی خاموش تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکی اسے کہاں لے جاتی ہے۔ لے کہاں جاتی.....

یونہی بے مقصد شہر کی مختلف سڑکوں پر لے پھر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد حمید نے محسوس کیا کہ وہ کچھ عجیب تماشہ بن کر رہ گئے ہیں۔ کئی جگہ تو آوارہ

کے لوگوں نے آوازے بھی کسے تھے لیکن وہ اسی طرح ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔

آخر ایک جگہ وہ اسکوٹر روک کر جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اے..... کیا پٹرول

مفت ملتا ہے۔ مجھے تم بتاتے کیوں نہیں کہ کہاں جانا ہے۔“

”تار جام.....!“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پٹرول اور ڈلوائے لیتے ہیں۔“

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ میں تمہیں تار جام لے جاؤں گی۔“

”اچھا تو پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔“

”اترو نیچے۔“

”ہر گز نہیں..... یہاں تم شوق سے شور مچا سکتی ہو۔ بھیڑ تو پہلے ہی لگ گئی ہے۔“

”مگر.....!“ دھاڑ کچھ اور وزنی ہو گئی۔ ”سور کے بیچ! تم باز نہیں آؤ گے۔“

”مگر.....!“ دھاڑ کچھ اور وزنی ہو گئی۔ ”سور کے بیچ! تم باز نہیں آؤ گے۔“

”مگر.....!“ دھاڑ کچھ اور وزنی ہو گئی۔ ”سور کے بیچ! تم باز نہیں آؤ گے۔“

”مگر.....!“ دھاڑ کچھ اور وزنی ہو گئی۔ ”سور کے بیچ! تم باز نہیں آؤ گے۔“

حمید نے بوکھلا کر نہ صرف سلسلہ منقطع کر دیا بلکہ جولی وکٹر کو ایک گندی سی گالی بھی دی۔ فوری طور پر خیال آیا تھا کہ وہ اسے بیوقوف بنا گئی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ہوتھ سے باہر نکل کر دیکھا تو اسکو ٹر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

وہ دانت پیتا ہوا پھر ہوتھ کی طرف مڑ گیا۔

وہی نمبر پھر ڈائیل کئے۔ دہاڑ پھر سنائی دی اور حمید نے کسی عورت کی سی آواز میں کہا ”میں جولی ہوں۔“

”تم کہاں ہو۔“

”گیسپر کے ساتھ۔“

”کیا.....؟ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“

”ڈیڈی..... یہ ظلم ہے۔“

”ڈیڈی کی بچی..... اب میں تجھے ماروں گا۔“

حمید ماؤتھ پیس بی میں کھانسنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ دوبارہ بولنے پر آواز کچھ بھرائی ہوئی سی ہو تاکہ دوسری طرف سے بولنے والا کسی قسم کے شبہ میں نہ مبتلا ہو سکے۔ لیکن دوسری طرف سے فوراً ہی آئی۔ ”تم کھانسنے رہی ہو..... تو اس حرامزادے نے بلاآخر تمہیں بھی چرس پینا سکھایا دیا۔ آج تمہاری خیریت نہیں، فوراً واپس آؤ۔“

”ڈیڈی.....!“

”واپس آؤ.....!“

”اچھا.....“ حمید نے مردہ سی آواز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس بار ہوتھ سے باہر نکلا تو ایسا خوش و خرم نظر آ رہا تھا جیسے اچانک کسی خوشخبری نے دل کی کلی کھلا دی ہو۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر واپس آیا۔ فریدی لائبریری میں کسی چارٹ پر جھکا ہوا ملا۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتا حمید نے خود ہی اپنی کار گزار یوں کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ لیکن کہانی کا وہ حصہ صاف اڑا گیا جس میں جولی وکٹر اپنے سکوٹر سمیت داخل ہوئی تھی۔

”بھئی.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا زیر لب بڑبڑایا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”اے ایک بھئی کو جانتا ہوں جو بہت سوشل تھا..... ثقافتی تحریکوں میں حصہ لیتا رہتا لیکن.....!“

”لیکن کیا.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اُس نے کہا اور اُس میز کی طرف بڑھا جس پر فون رکھا ہوا تھا۔ کسی کے ڈائیل کر کے ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”فسٹری آف فارن افئیرز کے مسٹر بھئی کی ایکس آر نیور چاہئے۔ ہاں میں گھر سے بول رہا ہوں..... ہوں ٹھیک ہے..... بیس منٹ کافی لگے۔“

سلسلہ منقطع کر کے وہ حمید کی طرف مڑا۔ آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”اس مکان کی تلاشی کا کیا نتیجہ نکلا؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں..... انہوں نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔“

”لاش کے سر ہتھیلیوں اور پنجوں کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”وہ کسی سوٹ کیس میں بہ آسانی لے جائے جاسکے ہوں گے۔“

”اسی طرح لاش بھی ٹھکانے لگائی جاسکتی تھی۔ اس گھڑاگ کی کیا ضرورت تھی۔ اس ناؤ کی کوکانوں کاں خبر نہ ہوتی۔“

”اس طرح لے جانے کے لئے لاش کے بھی ٹکڑے کرنے پڑتے۔“

”پھر بھی یہ حماقت..... میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی۔“ حمید نے پاپ میں تمباکو

نہوئے کہا۔ لاش کو مکان ہی میں چھوڑ کر لاپتہ ہو سکتے تھے۔ آخر اس طرح شارع عام پر

لے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”نی الحال صرف یہی ایک الجھاؤ ہے۔“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

غرائز میں کہا۔

”خیر ہو گا۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔ ”آپ اتنی جلدی ٹھیک اسی

بے جا پانچتے تھے۔“

”سامنے کی بات تھی۔“

”یعنی.....!“

”خود ہی ذہن پر زور دو۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”کیا ضرورت ہے۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا اور پاپ سلگانے لگا۔

یہ جملہ ادا کرتے وقت جنازے کا خیال آیا۔ پھر مذہبی نقطہ نظر سے جنازے کو پاؤں
قدم پہنچانے کی تاکید یاد آئی اور پھر تو ذہن فراموشی بھرنے لگا۔

ذرا ہی سی دیر میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ فریدی اتنی جلدی ٹھیک اسی جگہ کیے جا رہا تھا جہاں سے جنازہ اٹھایا گیا تھا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جی۔سی۔ایچ سوسائٹی میں کوئی غیر عیسائی نہیں رہتا۔ اس کا بھی
تھا کہ مکانات کرایہ پر حاصل کرنے کے لئے مالک کی بجائے سب سے پہلے سوسائٹی کے
سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ وہاں سے کھل کر یہ جواب تو نہیں ملتا کہ کسی غیر عیسائی کو
کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا بلکہ خواہشمند کے نام سے مذہب کا اندازہ کر کے اسے کسی جیلے
دیا جاتا ہے۔

فریدی نے اس نیک دل آدمی سے خاص طور پر پوچھا تھا کہ اس جنازے پر اس کی
نظر کہاں پڑی تھی۔ مقام کے تعین پر بار بار زور دے رہا تھا۔ بہر حال یہ معلوم کر لینے کے
کہ اس نے وہ جنازہ چرچ روڈ کے کراسنگ پر دیکھا تھا جائے واردات کا پتہ لگانا حقیقتاً مشکل
نہیں تھا۔ اس جگہ اسے جنازے کے ساتھ صرف پانچ آدمی نظر آئے تھے اس کا مطلب یہ
کہ جنازہ کسی قریبی ہی بستی سے روانہ ہوا ہو گا اور وہ بستی بھی ایسی ہی ہو سکتی تھی
دوسرے مذاہب کے لوگ آباد رہے ہوں۔ ورنہ جنازے کے ساتھ صرف پانچ ہی آدمی
ہوتے۔ ایسے موقع پر ہر مسلمان کو جنازے کو چالیس قدم پہنچانے کا فرض یعنی طور پر
ہے چاہے وہ کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ لہذا یہ بات طے پاگئی کہ وہ کسی ایسی بستی سے
ہوا ہو گا جہاں مسلمان آباد نہ رہے ہوں۔ شہر میں جی۔سی۔ایچ سوسائٹی کے علاوہ اور کسی
بستی نہیں تھی۔ چرچ روڈ کے کراسنگ سے قریب بھی تھی..... جنازے کے ساتھ

ی آدمیوں کا ہونا یہ بھی ثابت کرتا تھا۔ کراسنگ تک پہنچنے کے لئے اس نے کوئی لمبا
نہیں طے کیا۔ ورنہ کتنے ہی مسلمان راگبیر اس کے ساتھ ہوتے۔

حمید نے طویل سانس لی اور فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیوں.....؟ کیا سوچ رہے ہو۔“ فریدی مسکرایا۔

”جی کہ میں دیدہ و دانستہ اچھا کار گزار نہیں بننا چاہتا۔“

”کیونکہ کارگزاری کا تعلق اس سے ہے۔“ فریدی نے کپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”ہو گا.....!“ حمید نے لا پرواہی سے شانے جھٹکائے۔ ”کار گزار گدھوں پر ناکارہ

ن کا بوجھ بھی لا دیا جاتا ہے۔“

”ہوں..... تو تم اس لئے بھن رہے ہو کہ میں اطلاع ملتے ہی خود کیوں دوڑ پڑا تھا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ اتنے میں فون کی کھنٹی بجی..... فریدی نے ہاتھ بڑھا کر ریسپور اٹھایا

”تھ پیس میں بولا۔“ ”ہیلو..... ہاں..... ہاں..... ٹھیک ہے..... میں چرچ روڈ

کراسنگ پر منتظر رہوں گا۔“

ریسپور رکھ کر وہ حمید کی طرف مڑا۔

”شاید ہمیں پھر وہیں جانا پڑے۔“ اس نے کہا۔

”ضرور تشریف لے جائیے۔“ حمید کا لہجہ بے حد سعادت مند تھا۔

”اوہ تو تم اس سے یہ بھی نہیں معلوم کرنا چاہتے کہ وہ تمہیں اس طرح کیوں چھوڑ

تھی۔“

”کیا مطلب.....!“ حمید کے لہجے میں تلخی بھی تھی اور حیرت بھی۔

”میں جولی وکٹر کی بات کر رہا تھا۔“

”غلت ہے میری زندگی پر.....!“ حمید پیرنچ کر بولا۔

”غلط نہ سمجھو..... وہ محض ایک اتفاق تھا کہ کسی نے تمہیں دیکھ لیا، خاص طور پر کسی

ن کے لئے ہدایت نہیں دی گئی تھی..... چلو.....“ فریدی اسے دروازے کی طرف

باتے ہو بولا۔

اب وہ پھر چرچ روڈ کے کراسنگ کی طرف جا رہے تھے۔

ایک جگہ فریدی نے گاڑی روکی..... بائیں جانب والے فٹ پاتھ سے ایک آواز
گاڑی کی طرف آیا اور فریدی کو زرد رنگ کا ایک لفافہ دے کر آگے بڑھ گیا۔
گاڑی پھر چل پڑی۔

کچھ دیر بعد حمید کی دانست میں وہ پھر مالک مکان کو بور کر رہے تھے۔

فریدی نے جیب سے وہی زرد لفافہ نکالا جو اُسے راستے میں کسی نے دیا تھا.....
لفافے سے ایک تصویر برآمد ہوئی۔

”ذرا دیکھیے.....“ فریدی نے اُسے مالک مکان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ نے اسی بھٹی کا تھکرہ کیا تھا.....؟“

مالک مکان نے اُس پر اچھتی سی نظر ڈال کر کہا۔ ”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”آپ نے اسے آخری بار یہاں کب دیکھا تھا۔“

”یہ تو کل رات بھی آئے تھے ان لوگوں کے پاس۔“

”عورت کا شوہر بھی موجود تھا.....؟“

”جی ہاں..... کل وہ بھی کہیں باہر ہی سے آیا تھا۔“

”اچھا شکریہ.....!“ فریدی اس سے تصویر لے کر جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ ”مزا

تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”خدا ارباب دیکھ کر ہے۔ میں دل کا مریض ہوں۔“ مالک مکان نے گھٹکھٹا کر کہا۔

”اوہ فکر نہ کیجئے۔ آپ کے لئے کوئی پریشان کن بات نہیں ہو سکتی۔“ فریدی اس کا

تھپک کر بولا۔

واپس پر حمید نے جولی وکٹر کے مکان پر اچھتی سی نظر ڈالی۔ کسی کھڑکی میں بھی روشنی

دکھائی دی۔

دوسری طرف فریدی کہہ رہا تھا۔ ”اور یہ بھٹی پچھلے سال ایک حادثے کا شکار ہو کر

مرچکا ہے۔“

”مرچکا ہو گا..... لیکن میری نیندیں حرام کرنے کے لئے اسے دوبارہ پیدا ہونا پڑا
“حمید نے جلتے بھنے لہجے میں کہا۔

غیر معمولی کھوپڑی

فریدی کچھ نہ بولا۔ کار تیز رفتاری سے شہر کی سڑکوں پر دوڑتی رہی..... پھر حمید
بنے لگا۔

پھر کہیں گاڑی رکی تھی اور فریدی نے اُسے جھنجھوڑ کر ہوشیار کیا تھا۔

”میں جاگ رہا ہوں۔“ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ان دنوں نہ جانے کیوں اس
ذہن پر جھلاہٹ طاری رہتی تھی۔ کبھی کبھی موڈ اچھا بھی ہوتا..... لیکن زیادہ تر
شگوار اثرات ہی ذہن پر چھائے رہتے۔

”اتر.....!“ فریدی نے اُسے دوسری جانب کے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے

حمید اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ ویسے وہ اپنے نیم غنودہ ذہن پر قابو پانے کی کوشش
رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بسور بسور کر کام کرنے سے تھکن کا احساس بڑھ جاتا
ہے پھر کیوں نہ ہنسی خوشی جہنم میں بھی چھلانگ لگادی جائے۔

لہذا اب اس نے گاڑی سے چھلانگ لگائی اور سامنے والی عمارت کے پھانک میں گھستا چلا گیا۔
”کہاں جا رہے ہو.....!“ فریدی غریبا۔

حمید بالکل کسی فلمی مسخرے کے سے انداز میں مزا اور اس طرح پلکیں جھپکانے لگا جیسے
نافرملی زبان میں کہی ہوئی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”واپس آؤ.....!“

مڑنا ہی پڑا..... لیکن وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے..... فریدی کے اس رویہ پر چڑھ گیا تھا اور یہ غصہ اتنا شدید تھا کہ اس پر مرگ ناگہاں کا خوف بھی غالب نہ آسکا۔
پھر جھوٹک دیا..... اٹھا کر جہنم میں۔ واہ رے قربانی کے بکرے، وہ سوچتا اور نامعلوم
نیکی بدلیات کے مطابق چلتا رہا۔

برآمدے سے گذر کر وہ ایک راہداری میں داخل ہوئے۔ زیادہ دور نہیں چلنا پڑا.....
”اے کمرے میں داخل ہو رہے تھے جہاں کھڑکی کے قریب حمید نے کسی کا سر دیکھا تھا۔
وہ اب بھی کھڑکی کے قریب ہی ایک کرسی پر نظر آیا..... اور اب اُس کا چہرہ بھی
ماہا سکتا تھا۔

پچاس پچپن سال کا ایک صحت مند آدمی تھا۔ لیکن سر کی بناوٹ غیر معمولی تھی۔ اسی
بہمید کو سوچھی بھی خوب..... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس آدمی کو دیکھنے لگا۔
اُس نے بے حد پرسکون لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے۔“

حمید کو یہاں تک لانے والے نے پشت سے جواب دیا۔ ”یہ ایک گاڑی سے اتر کر پھانک
اُس پڑا تھا..... کسی نے اسے آواز دی تھی۔ یہ پھر پلٹ گیا تھا۔ دونوں گاڑی کے قریب
آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے تھے۔ یہ پھر اندر آیا تھا اور کھڑکی میں جھانکنے کی کوشش
نے لگا تھا۔“

”دوسرا کہاں ہے۔“ کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے پوچھا۔
”وہ گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔“

”خدا غارت کرے میرے اس شوق کو.....“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔
”وہ آدمی اُسے گھورنے لگا کچھ بولا نہیں۔“

ریوالور کی نال حمید کی گردن سے ہٹ چکی تھی۔ لیکن اسے استعمال کرنے والا اب بھی
سکے پیچھے موجود تھا۔

”لیکن تم انہیں زبردستی یہاں کیوں لائے۔“ کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے
سستے پوچھا۔

”بہت بہتر جناب۔“ وہ گاڑی کا چکر کاٹ کر فریدی کے قریب پہنچتا ہوا بولا۔
”سدرے ہوئے موڈ میں نظر آرہے ہو۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا
مسکرایا۔
”قطعاً.....!“

”تب تو میں نے بدل دی اپنی اسکیم..... ادھر دیکھو..... سامنے اس کھڑکی
میں..... وہ آدمی بیٹھا ہوا ہے۔“
حمید نے مڑ کر دیکھا..... کھڑکی سے کسی کا سر نظر آ رہا تھا۔ چہرہ دوسری طرف تھا۔
پھر فریدی کی طرف مڑا۔

فریدی بولا۔ ”تم کھڑکی کے قریب جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرو گے اور اسے ایک
گندی سی گالی دے کر تیزی سے گاڑی کی طرف پلٹ آؤ گے۔“
”جی.....!“ حمید کی آنکھیں بھی ”جی“ کی طوالت کے ساتھ ہی پھیلتی چلی گئیں۔
”جلدی کرو.....!“ فریدی اُس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔
”مم..... مطلب یہ کہ.....!“
”چلو.....!“

حمید ٹھنڈی سانس لے کر پھانک کی طرف چل پڑا..... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
فریدی کیا کرنا چاہتا ہے۔
وہ طوعاً و کرہاً کھڑکی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

قریب پہنچ کر چوکھٹ کے نچلے حصے پر ہاتھ رکھے اور پنچوں کے بل کچھ اور اوپر اٹھنے کا
ارادہ کر رہا تھا کہ کوئی ٹھنڈی سی چیز گدی سے آگئی۔ ساتھ یہ بھی محسوس ہوا جیسے فریدی کی
گاڑی کا انجن اشارت ہوا ہو اور وہ آگے بھی بڑھ گئی ہو۔

ایک گندی سی گالی حمید نے خود اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے چپ چاپ دونوں
ہاتھ اٹھا دیئے۔ کیونکہ گدی سے چپک جانے والی ٹھنڈی چیز کسی ریوالور کی نال ہی ہو سکتی تھی۔
”بائیں طرف مڑو.....“ کسی نے آہستہ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”اوہ..... تو کیا..... عجیب اتفاق ہے۔“ حمید نے سنبھالا لیتا چاہا لیکن حالات کا علم نہ
کی بناء پر کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچی۔

”نقلی نہیں۔“ وہ آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کسی قسم کی صفائی کی ضرورت نہیں۔ اب
پیشن پولیس ہی تمہیں یہاں سے لے جائے گی۔“

”کچھ غلط نہ سمجھئے۔ کرئل صاحب کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یقین کیجئے میں تو
کے نام تک سے واقف نہیں۔“

”وہ آدمی کچھ بولے بغیر حمید کو اس طرح گھورتا رہا جیسے اُس کی کہی ہوئی بات کو تولنے کی
راہ رہا ہو۔“

”میں یقین نہیں کر سکتا۔“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ دونوں کے درمیان کیا ہے۔ لیکن اگر مجھے کرئل ہی نے بھیجا
اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“ حمید بولا۔

”یہ بھی تمہی بتاؤں گے۔“

حمید کچھ کہنے والا تھا کہ کافی کی ٹرائی آگئی۔

عجیب جکر ہے۔ اس نے سوچا۔ ابھی اینٹی کرپشن پولیس کی دھمکی دی تھی اور اس سے
انی منگوا چکا تھا۔

کافی کی ٹرائی اس کے قریب لگادی گئی اور وہ اپنے لئے کافی بنانے لگا۔ اب حمید نے دیکھا
پہ ایک ہی تھا۔ پکاسور معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر اپنی اس خوش فہمی پر تاؤ آنے
اس نے رسمی اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے کافی طلب کی تھی۔

وہ خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتا اور حمید کو گھورتا رہا۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز
ناتھی لیکن ہاتھ پیر سے مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ کھوپڑی انڈے کے چھلکے کی طرح شفاف
۔ لیکن اس کی بناوٹ کی بناء پر ہزاروں میں پہچانا جاسکتا تھا۔

کافی ختم کر کے اس نے پائپ سلگایا اس دوران میں حمید پر سے ایک پل کے لئے بھی نظر
مٹائی تھی۔

”ان صاحب کا کوئی قصور نہیں جناب۔“ حمید نے نہایت ادب سے کہا۔ ”میں نے
حرکت ہی ایسی کی تھی۔“

”یعنی.....!“

”بس کیا عرض کروں اپنے اس خط کے ہاتھوں برباد ہوں۔“

”اس خط کا تذکرہ میرے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔“ وہ آدمی مسکرا کر بولا۔

”کاسہ سر کی بناوٹ کا مطالعہ۔“

”اوہ..... تو آپ کو میری کھوپڑی دور ہی سے قابل توجہ نظر آئی تھی۔“

”یہی بات ہے..... میں نے اپنے ساتھی سے گاڑی روکنے کو کہا تھا اور اُسے کچھ بتا دیا۔“

بغیر پھانک میں گھس پڑا تھا۔

”لیکن ساتھی کیوں بھاگ گیا.....؟“

”ظاہر ہے مجھے اس طرح پکڑ لے جاتے دیکھ کر وہ کہے رک سکتا تھا۔ ویسے اُس پیارے
نے تو مجھے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔“

”بہر حال اب آپ کو قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع مل گیا۔“ اس آدمی نے کہا اور
دوسرے سے بولا۔ ”تم جاسکتے ہو۔ کافی کے لئے کہتے جانا..... آپ تشریف رکھئے جناب۔“

حمید شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

”قریب آجائیے۔“ پر شفقت لہجے میں کہا گیا۔ ”کرسی کھکانے کی زحمت بھی آپ ہی
کو کرنی پڑے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ حمید اپنی کرسی اس کے قریب کھسکا لایا۔

لیکن وہ متحیرانہ انداز میں اس کے سر ہی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”اس اینٹنگ پر میں تمہیں سو میں سے پچانوے نمبر دے سکتا ہوں کیپٹن حمید۔“ دفعتاً

اس آدمی نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

اُس کی زبان سے اپنا نام سن کر حمید سناٹے میں آگیا۔ پھر قبل اس کے کہ ذہن کوئی
دوسری فلابازی کھاتا وہ آدمی بولا۔ میں کرئل فریدی کو اتنا گھٹیا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔

”ہی استغفر اللہ..... یہ حقیر فقیر دوسرے ٹاپ کا واقع ہوا ہے..... دسکی ہی پر کر رہا ہے۔ سوئزر لینڈ وغیرہ کون بھاگتا پھرے۔“
”تم دونوں ہی.....!“

”ہیں جناب..... ہوتی ہے۔ اگر آپ نے میری شان میں کوئی نازیبا کلمہ زبان سے ادا فرمایا.....“ حمید جملہ پورا کئے بغیر ہی کرسی سے اٹھ گیا۔

”کیا کرو گے تم.....!“
”کر گزرنے کے بعد ہی غور کرتا ہوں کہ کیا کر گذرا۔“
”مجھے پہچانتے ہو.....؟“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا۔

”جی بہتر ہے کہ نہیں پہچانتا ورنہ ہو سکتا تھا کہ مروت آجاتی۔“
”میں نیشنل اسمبلی کا ممبر ہوں..... راٹھور..... نام سنا ہے کبھی۔“
”نہیں.....!“ حمید نے کہا تو لیکن نام سن کر سناٹے ہی میں آگیا تھا۔ مشہور لیڈروں اس کا شمار تھا۔ اگر تصویریں چھپوانے کا شائق ہو تا تو حمید نے یقیناً اسے پہچان لیا ہو تا۔ ملک بڑے صنعت کاروں میں سے بھی تھا۔
”ہوں.....!“ وہ غرایا۔ ”خیر اب پہچان لو گے۔“

چھین

یہ کس مصیبت میں پھنسا دیا جناب نے..... حمید کا سر چکرانے کے لئے اشارت لینے والا تھا کہ اچانک مزاح کی حس بھی بیدار ہو گئی اور اس نے بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔
”خیر کرنا چاہئے اپنی اس صلاحیت پر۔“
”کس صلاحیت پر.....!“ طنزیہ لہجے میں پوچھا گیا۔

حمید نے بھی جیب سے تمباکو کی پاؤچ اور پائپ نکالا..... پائپ میں تمباکو بھر کر بولا۔
”آپ کی صحت بہت اچھی ہے لیکن آپ تمباکو کی پی پی کر اسے تباہ کر لیں گے۔“
”میں دشمنوں کو کافی نہیں آفر کرتا۔“ اُس نے برا سامنے بنا کر کہا۔
”آخر میں بھی تو سنوں کہ دشمنی کی نوعیت کیا ہے۔“
”پچھلے سال سوئزر لینڈ میں ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا۔“

حمید کو یاد آیا کہ فریدی پچھلے سال صرف ایک ہفتے کے لئے باہر گیا تھا لیکن آج پہلے یہ معلوم ہوا کہ اُس نے وہ ایک ہفتہ سوئزر لینڈ میں گزارا تھا۔ پھر جب اس نے یہی خبر بتایا تھا کہ وہ گیا کہاں تھا تو اس سفر کی غرض و غایت کا علم حمید کو کیسے ہوتا۔
”سوئزر لینڈ جیسے ٹھنڈے مقام پر بھی جھگڑے ہو سکتے ہیں۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔
”وہ معاملہ بے حد گرم تھا۔“ جواب ملا۔ لیکن کہنے کے انداز سے پتہ لگانا دشوار تھا کہ جملہ حرا کہاں گیا ہے یا سنجیدگی سے۔

”مشہوری کا مقابلہ؟“ حمید نے پوچھا۔
”جی نہیں..... ایک لڑکی کا معاملہ تھا..... ایک ماہ سے وہ میرے ساتھ تھی اچانک آپ آکودے۔“

”یعنی کرنل فریدی۔“ حمید اچھل پڑا۔
”کیوں..... تمہیں حیرت کیوں ہے؟“
”کچھ نہیں..... یونہی۔“

وہ زہریلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں یہاں اُس کا ہر شناسا تحیر رہ جائے اس بات پر..... پارسائی کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں ناپہاں۔“
”تو..... اُس لڑکی کے لئے۔“

”ہاں..... اُسے میرے ہٹ سے زبردستی اٹھالے گیا تھا۔“
”قرب قیامت کی نشانی.....!“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
”تم نہیں تھے اُس کے ساتھ۔“

”وہ کوئی معمولی کھوپڑی نہیں تھی جسے دیکھ کر میں بے قابو ہو گیا تھا۔“

”میرا مذاق اڑا رہے ہو.....!“ وہ دہازا

”ہرگز نہیں..... بلکہ اس قدر خوش ہوں کہ اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے..... ارے کاسہ سر کی بناوٹ..... میرے خدا کاش میں آپ کو دنیا کے دوسرے بڑے آدمیوں کی کھوپڑیوں کے نمونے دکھا سکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ مستقبل قریب میں کیا ہونے والے ہیں۔ صدر مملکت..... نہیں..... یہ عہدہ تو صرف ملک کی مدد دہے..... لکھ لیجئے کہ آپ ایک بین الاقوامی شخصیت بننے والے ہیں۔“

راٹھور نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور حمید جلدی جلدی بولنے لگا۔ ”میں یہاں تک بتا سکتا ہوں کہ آپ کن حادثات سے دوچار ہوں گے اور کس طرح گلو غلامی حاصل کر سکیں گے..... اور..... اور یہ بھی بتا.....!“

ماؤتھ پیس میں اس کی ”ہلو“ کی دہاز سن کر یک بیک خاموش ہو گیا۔ راٹھور بھی تیز سے بول رہا تھا۔ لیکن وہ شائد گجراتی میں کچھ کہہ رہا تھا اور حمید کو گجراتی قطعی نہیں آتی تھی لہذا وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

راٹھور ریسور رکھ کر غصیلے انداز میں اُس کی طرف مڑا۔

”اب میری باری ہے سمجھئے۔“

”میری بھی ایک گزارش ہے..... وہ یہ کہ..... پلیز..... ایک منٹ ٹھہریئے۔“

مجھے بات پوری کر لینے دیجئے..... شکریہ۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ کرئل فریڈ کا غصہ مجھ غریب پر کیوں اتارنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں گا کہ کارنامہ میرے ساتھ وہ نہیں تجھے۔“

”میں الجھنا چاہتا ہوں کرئل فریڈی سے۔“

”ضرور الجھئے..... لیکن مجھے درمیان سے ہٹ جانے دیجئے۔“

”میں پوچھتا ہوں تم اس کمپاؤنڈ میں بغیر اجازت کیوں داخل ہوئے تھے۔“

”کہہ تو رہا ہوں کہ بے اختیاری میں یہ حرکت سرزد ہو گئی تھی..... اگر چھالک

پر بھی نظر پڑی ہوتی..... تو..... ارے توبہ توبہ۔“ حمید اپنا منہ پیٹنے لگا۔

”تو پھر میں تمہیں انٹنی کرپشن پولیس کے حوالے نہ کروں۔“

”جی ہاں..... میں تو یہی چاہوں گا کہ ایسا نہ ہو۔“

”تو پھر تمہیں..... ایک تحریر دینی ہوگی۔“

”کیسی تحریر.....!“

”تم اعتراف کرو گے کہ تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی دونوں بہت زیادہ شراب پیئے تھے اور گوشہ عافیت کی تلاش میں میری کمپاؤنڈ میں آگئے تھے۔ تم دونوں کو میرے ہاتھ ناگفتہ بہ حالت میں پکڑا تھا۔“

”ناگفتہ بہ حالت میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید اپنی معمولی قسم کی کھوپڑی سہلاتا ہوا

”کو اس مت کرو۔“

”اچھی بات ہے..... پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”میں تمہیں جانے دوں گا۔“

”یعنی..... یعنی..... وہ تحریر.....!“

”میرے پاس رہے گی۔“

”کیا فائدہ ہوگا اس سے..... میں تو کہتا ہوں کہ آپ مجھے جانے دیجئے اس سے بھی

اگتہ بہ حالت لکھ کر بذریعہ ڈاک آپ کے پاس بھیجوا دوں گا۔“

”تم یوں نہیں مانو گے.....!“ راٹھور نے پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ٹھہریئے..... ایک منٹ.....!“

”کو..... جلدی سے۔“

”میں تحریر دے دوں گا..... کاغذ قلم منگوایئے۔“

اور پھر حمید کو ایک ایسی تحریر دینی پڑی کہ سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔

نا سوچ رہا تھا اچھا ہے جھگڑیں گے وہی حضرت جو مجھے کچھ بتائے بغیر جہاں چاہتے ہیں

جھوٹک دیتے ہیں۔

جلد نمبر 31

289

سنہری چنگاریاں

کون جانے کہ آنے والے لمحات اسی قصے کو اور کتنا طول دے دیں۔

قصہ؟ لیکن قصہ کیا تھا؟ بھٹی کی تصویر کی شناخت کے لئے وہ جی سی ایچ سوسائٹی گئے تھے اور فریدی نے بتایا تھا کہ وہ تو عرصہ ہوا کسی حادثہ کا شکار ہو کر مر چکا تھا۔ پھر یہ مسٹر بھٹی بڑھ چلی رات تک مقتولہ کے مکان میں دیکھا گیا تھا کون تھا۔ جی سی ایچ سوسائٹی سے واپسی کے بعد حرکت.....؟ کیا مقصد تھا اس کا.....؟

پھر اس کا ذہن صرف لفظ ”مقصد“ کی تکرار کرتا رہا۔

سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا اور یہ پیدل چلنے والا تو شاید تنہا ہی تھا۔ دور دور تک کسی دوسرے آدمی کی پرچھائیں بھی نہ دکھائی دیتی تھیں۔

دفعتاً ایک تیز رفتار گاڑی اس کے قریب سے گزری اور کچھ ہی دور جا کر اس کے بریک بچڑائے۔ جھٹکے کے ساتھ رکی تھی اور پھر وہ ریورس گیر میں ڈالی گئی۔

دوسرے ہی لمحے میں حمید کو بھی رک جانا پڑا کیونکہ وہ اس کے قریب ہی آکر پھر رک گئی تھی۔

”کیپٹن حمید.....!“ اندر سے آواز آئی۔ ”گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

آواز راٹھور کی تھی۔ حمید کچھ نہ بولا۔ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ گاڑی کے اندر روشنی بگنی۔ راٹھور اسٹیرنگ تھامے بیٹھا اُسے گھورے جا رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے، تم پیدل جا رہے تھے، جہاں کہو پہنچا دوں۔“ اُس نے کہا۔

”شکریہ..... میں چلا جاؤں گا.....“ حمید بھنا کر بولا۔

”یاد تم تو بڑے خوش مزاج مشہور ہو۔“ راٹھور نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”صرف خوبصورت لڑکیوں کی حد تک۔“

”مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔“ راٹھور نے قہقہہ لگایا۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“

حمید نرمی طرح بھنایا ہوا تھا۔ اس نے سوچا..... چلو بیٹھو دیکھا جائے گا۔

اُس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا چاہا لیکن راٹھور اگلی نشست کا دروازہ کھولتا ہوا ”نہیں ادھر ہی آؤ۔“

راٹھور معمولی آدمی نہیں تھا۔ حمید اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی کسی پوزیشن میں پڑا قادر ہارڈ اسٹون کی پیشانی بھی پیچھے بغیر نہ رہ سکی۔ راٹھور سے ٹکراؤ کا مطلب تھا براہ راست حکومت سے ٹکراؤ۔

اُسے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ وہاں سے کس طرح رخصت ہوا تھا۔ ہوش تو سڑک پہنچنے کے بعد آیا تھا جب پسینے سے بھیکے ہوئے کپڑوں سے ٹھنڈی ہوا ٹکرائی تھی۔

پتہ نہیں وہ کس سمت جا رہا تھا۔ اپنے جوتوں کی کھٹ کھٹ کے علاوہ اس وقت اور کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔ کتنی ہی خالی ٹیکسیاں قریب سے گزر گئیں لیکن وہ اسی طرح چلتا رہا۔

انداز بالکل ایسے فلمی ہیرو کا سا تھا جو ہیروئن کو کھودینے کے بعد افق کے پار چلا جاتا ہے۔

اس سے قبل بھی کئی بار فریدی نے اُسے آزمائشوں میں ڈالا تھا لیکن اس حادثے نوعیت ہی الگ تھی۔

آخر اس حرکت کا مقصد کیا تھا..... لیکن فریدی کی وہ اسکیم کامیاب کہاں ہو تھی..... زبان ہلانے سے پہلے ہی وہ دھریا گیا تھا..... اگر گالی دے کر بھاگتا تو کیا صورت

ہوتی۔ کیا وہی چھپا ہوا آدمی فائر نہ کر دیتا جس نے اس کی گردن پر ریوالور کی ٹال رکھ دی تھی اور پھر یہ راٹھور..... سوئزر لینڈ میں کیا ہوا تھا۔ کیا حقیقتاً فریدی وہ ہے جو خود کو ظاہر کر

ہے۔ کسی لڑکی کے لئے جھگڑا؟ انہونی ہی سی معلوم ہوتی ہے۔ حمید کو اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے سال ایک ہفتہ کے لئے ملک سے باہر گیا تھا لیکن واپسی پر یہ بتانے سے گریز کرتا رہا تھا۔

وہ مدت اُس نے کہاں گزاری۔

حمید سوچتا رہا..... جھلاہٹ بڑھتی رہی..... قدم تیزی سے اٹھتے رہے..... منزل کا تعین کے بغیر۔

کبھی کبھی قریب سے کوئی تیز رفتار گاڑی گزر جاتی۔

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہوئی۔ مگر ختم کہاں ہوئی۔

آہا..... اس کے الفاظ میں تو پچھلی سیٹ پر قیامت ہی سوری تھی اور اُسی نے کراہ کر
کروٹ بدلی تھی۔

بھرے بھرے سے ہونٹ کسی قدر کھل گئے تھے جن سے سامنے کے شفاف دانت
نکلتے تھے۔ ایک پتلی سی لٹ گال پر خم کھا کر دہانے کے گوشے تک چلی آئی تھی۔ حمید
باجوس ہونے لگا جیسے خود اس کی ریڑھ کی ہڈی میں فوارے چھوٹ رہے ہوں۔

وہ جلدی سے پھر سیدھا ہو بیٹھا اور کنکھیوں سے راٹھور کی جانب دیکھا وہ پہلے ہی کے
انداز میں ونڈ شیلڈ پر نظر جمائے ہوئے تھا..... اس سے قطعی بے تعلق کہ دوسرے کس
ایم ہیں

حمید نے کھار کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی
آئی۔

آخر اُسے بولنا ہی پڑا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”رات بڑی خوش گوار ہے..... گھر میں جی نہیں لگ رہا تھا کہیں بھی چلے چلیں

حمید پر پھر جھلاہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ لیکن زبان نہ کھل سکی۔ سوچتا رہا..... واہ الو کے
اتنی بے تکلفی سے فرما رہے ہو جیسے ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے
ما..... اور یہ پیچھے کیا تمہاری خالہ محترمہ استراحت فرما رہی تھیں۔

”لیکن یہ رات میرے لئے تو بے حد ناخوشگوار ثابت ہوئی ہے۔“ حمید نے کچھ دیر
کہا۔

”اماں چھوڑو بھی..... ابھی تک اُسی اوہڑپن میں پڑے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگوں کو
بچے مڑ کر دیکھنا ہی نہ چاہئے۔“

”اتفاقاً نظر اٹھ گئی تھی۔“

”اُوہ..... میرا مطلب تھا گذری ہوئی باتوں کی فکر ہی نہ کرنا چاہئے۔ اُسے تو تم بار بار

حمید نے بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور راٹھور نے سوچ دبا کر گاڑی کے اندر بھی
روشنی کر دی۔

گاڑی چل رہی تھی اور حمید کنکھیوں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ راٹھور نے اپنے ہونٹ
نختی سے بھیجنے رکھے تھے۔

دفعتاً اُس نے اپنے ہاتھ سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”یہ لو۔“

”کیا ہے.....؟“

”تمہارا اعتراف نامہ۔“

”کیوں.....؟“

”فضول ہے میرے لئے۔ میں یونہی جب چاہوں تم لوگوں سے نپٹ سکتا ہوں۔“

”آپ خواہ مخواہ مجھے کیوں کھیٹ رہے ہیں۔ آپ کا جھگڑا کر تل فریدی سے ہوا تھا۔ مجھ

پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں..... کچھ اس خیال سے بھی۔ بہر حال تم اسے ضائع کر سکتے ہو۔“

حمید نے کاغذ کی تہہ کھولی..... وہ تحریر تھی جو کچھ دیر پہلے زبردستی اس سے لی گئی تھی۔

”نہیں.....!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میں اسے ضائع کرنے کی بجائے اپنی

حفاظت کی یادگار کے طور پر رکھوں گا۔“

”تمہاری مرضی.....!“ راٹھور نے لا پرواہی سے کہا۔

حمید نے اُسے بڑی احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

گاڑی چلتی رہی..... رفتار خاصی تیز تھی..... لیکن ابھی تک حمید نے اس سے

پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

”ہائے.....!“ پچھلی سیٹ سے ایک سریلی سی خواب آلود آواز آئی۔

حمید چونک کر مڑا۔

خالی الذہنی کا سا عالم تھا۔ پیر نہیں لڑکھڑاہے تھے۔ وہ مضبوطی سے زمین پر قدم رکھ کر
 تھوڑی دیر بعد وہ ایک عمارت میں داخل ہوئے جو تاریک نہیں تھی۔ بڑے بڑے
 میس لیمپوں نے اُسے بقعہ نور بنا رکھا تھا۔
 حید بولنے کے موڈ میں تھا۔ بولے جارہا تھا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اُسے اپنی آواز
 سنائی دیتی تھی۔ لڑکی ہنس رہی تھی۔ تھرک رہی تھی..... ناچ رہی تھی۔
 کئی قسم کے ساز بجاتے تھے۔
 نغمہ و نور کا سیلاب تھا کہ چاروں طرف سے امنڈ آیا تھا..... حید محسوس کر رہا تھا
 اس لڑکی کا وجود پورے ماحول پر چھا گیا ہو۔
 وہ بولے جارہا تھا بے ٹکان۔ یہ سمجھے بغیر کہ کیا کہہ رہا ہے اور سانسے بیٹھا ہوا راٹھور
 بالکل چند معلوم ہو رہا تھا۔
 ایک بار لڑکی تھرکتی ہوئی راٹھور کے قریب سے گزری اور اُس نے اسے حید پر دھکیل
 دونوں لڑکھڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر گرے..... اندھیرا ہو گیا..... اور ساز
 گئے..... پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ حید کا ذہن بھی اُسی اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔
 بھاگو
 سورج طلوع ہو چکا تھا اور شانہ کلی ہوئی کھڑکی سے براہ راست آنے والی شعاعوں کی
 تاپنے چہرے پر محسوس کر کے ہی وہ جاگ پڑا تھا۔ لیکن یہ کیا.....؟ اُس کے کپڑے
 لٹکتے۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا..... چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن اس کمرے میں کہیں کوئی
 ناچنے نہ دکھائی دی جس سے برہنگی کا ازالہ ہو سکتا۔ بستر پر چادر بھی نہیں تھی۔ وہ آنکھیں
 ہڈاڑ کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔
 یہاں ایک مسمری تھی، ایک میز اور دو کرسیاں۔ لمبوسات کی الماری بھی تھی اس کے
 بے بی چھوٹے سے اسٹول پر فون رکھا ہوا تھا۔
 وہ بھٹ کر الماری کی طرف آیا۔ الماری کا ہینڈل گھماتے وقت پھر فون پر نظر پڑی۔

مڑ کر دیکھ سکتے ہو۔“
 ”شکریہ.....!“ حید نے سعادت مندانہ انداز میں کہا اور باقاعدہ طور پر پچھلی سیٹ
 طرف مڑ گیا۔ لڑکی اب بھی اسی طرح سو رہی تھی..... فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ گال پر
 کھائی سی لٹ اب ہاتھ کے نیچے دب گئی تھی۔
 ”دیکھتے رہو۔“ راٹھور سنجیدگی سے بولا۔ ”اس کے ساتھ ہی ذاتی طور پر اپورٹ
 ہوئی پرنگالی شراب بھی ہے۔“
 ”مزید شکریہ۔“ حید نے کہا۔ اب وہ پچھلی سیٹ پر باقاعدہ جھکا ہوا اس طرح سونے
 کا جائزہ لے رہا تھا جیسے خس و خاشاک کے ڈھیر میں گری ہوئی سوئی تلاش کر رہا ہو۔
 راٹھور ہنس کر بولا۔ ”واقعی بڑے سوز ہو۔“
 پھر یک بیک سنجیدہ ہو کر غصیلی آواز میں کہا۔ ”تمہیں میرا احترام کرنا چاہئے۔“
 ”اکثر میرے والد صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔“ حید سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔ ”مگر
 کروں عورتوں کے معاملے میں مجبور ہوں..... آدم کی مجبوری سے بھی آپ واقف
 ہوں گے۔“
 بار برداری کے تین بڑے ٹرک سامان سے لدے ہوئے اُن کے قریب سے گزر گئے
 اب گاڑی رک گئی تھی۔
 راٹھور نے حید سے کہا۔ ”اسے جگادو.....!“
 گاڑی میں اب اندھیرا تھا..... حید نے ہاتھ بڑھا کر اُسے جھنجھوڑا..... وہ اچھا
 پڑی۔ ساتھ ہی حید کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہتھیلی میں کوئی چیز چبھ گئی ہو..... اُس نے ”سی
 کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔
 راٹھور غرا رہا تھا۔ ”اٹھئے رانی صاحبہ..... ایسی بھی کیا نیند۔“
 حید اپنی ہتھیلی میں سوزش سی محسوس کر رہا تھا..... اور عجیب سی سنسنی اس کے
 سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔
 راٹھور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک طرف چلنے لگا۔ وہ بس اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

اس کے ریسپور پر سرخ حروف میں ”نیاگرا“ تحریر تھا۔

اوہ..... تو کیا یہ نیاگرا ہوٹل کا کوئی کمرہ ہے..... اُس نے سوچا..... لیکن وہ پچھلے رات والی عمارت نیاگرا کی تو ہرگز نہیں تھی۔

الماری کا دروازہ کھل گیا۔ لیکن وہ خالی تھی۔ نہ تو اُسے اپنے کپڑے نظر آئے اور نہ کوئی ایسی چیز جس سے ستر پوشی کی جاسکتی۔

اب وہ سیدھا غسل خانے میں جاگھسا..... خدا کی پناہ۔ یہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ ایک تولیہ ہی مل گیا ہوتا..... اب کیا کیا جائے۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی اور وہ جھپٹ کر باہر نکلا۔ ریسپور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”کیا آپ کمرے ہی میں ناشتہ پسند فرمائیں گے۔“

”اوہ..... ہاں.....!“ حمید جلدی سے بولا۔ ”دیکھو بھی..... میں اس کمرے کا نمبر بھول گیا ہوں۔“

”سکینڈ فلور..... تھرٹی سکس..... جناب.....!“

”شکریہ..... میں ابھی ناشتے کے لئے خود ہی رنگ کروں گا۔“

”بہت بہتر جناب۔“ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی بھی آواز آئی اور حمید نے بھی ریسپور رکھ دیا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔ آخر اُسے یہاں کس طرح لایا گیا ہو گا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو اس طرح کسی کے قابو ہی میں کیوں آتا۔ ظاہر ہے کہ اُسے اپنی سمدھ نہ رہی ہو گی۔ تو کیا وہ اسے اسٹریچر پر ڈال کر یہاں لائے ہوں گے۔ رجسٹر میں نام کسی کا درج کر لیا ہو گا۔

”راٹھور..... راٹھور..... میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔

پھر فون کی طرف بڑھل۔ ہوٹل کے ایجنٹ سے رابطہ قائم کر کے ماؤتھ پیس میں بولا۔

”کاؤنٹر پلیز.....!“

کاؤنٹر کنکٹ ہو جانے کے بعد اُس نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ ”سکینڈ فلور کے روم“

رنی سکس میں کون مقیم ہے۔“

”آپ کون صاحب ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”سم بوڈی فرام سی۔ آئی۔ بی۔“ حمید نے جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے جناب..... یہ بات آپ کو سپروائزر ہی سے معلوم ہو سکے گی۔“

سپروائزر..... حمید نے ریسپور رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ تو اُسے اچھی طرح جانتا

ہے..... پھر کیا کیا جائے۔ شاید آواز بھی پہچان لے۔

دوبارہ فون کا سلسلہ سپروائزر سے ملوا کر آواز بدلتے ہوئے وہی سوال کیا جو کاؤنٹر کلرک

سے کیا تھا۔

”آپ کون صاحب ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”سم بوڈی فرام سی۔ آئی۔ بی۔“

”آپ یہاں تشریف لائے..... اپنا آئیڈنٹی کارڈ دکھائیے پھر بتایا جاسکے گا۔“

”کیا بات ہوئی۔“ حمید غرایا۔

”تو انہیں جناب..... میں مجبور ہوں۔“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

حمید تھوڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا پھر ریسپور رکھ کر دوبارہ سپروائزر ہی سے سلسلہ ملایا اور اُس بار اپنی اصل آواز میں اُسے مخاطب کرتا ہوا بولا۔ ”مسٹر شرما..... میں کیپٹن حمید بول رہا ہوں۔“

”اوہ..... تو آپ جاگ رہے ہیں۔ ابھی ابھی کسی نے فون پر آپ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہا تھا..... آپ ہی کے محکمے کا حوالہ دے کر لیکن میں نے فی الحال ہوٹل کے قوانین کی آڑ لے کر ٹال دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اب وہ خود ہی آ رہا ہو۔“

”فکر نہ کرو..... بس جلدی سے میرا ایک کام کرو۔ ایک پتلون ایک قمیض اور ایک

نیلان اپنے اسٹور سے لے کر بھجوا دو۔ قیمت نیچے آکر ادا کر دوں گا۔“

”سائز بتائیے..... ابھی بھجواتا ہوں۔“

حمید نے اُسے سائز بتا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب وہ دروازے کے قریب کھڑا کپڑوں کا منتظر تھا۔

پھر کپڑے بھی آگئے جو دروازے میں تھوڑا سا درہ کر کے باہر کھڑے ہوئے ورنہ لے لئے گئے تھے۔

کپڑے پہن لینے کے بعد جان میں جان آئی اور وہ باہر نکلا۔ پہلی منزل سے اتر کر سیدھا سپردانز کے کمرے میں آیا۔ شاید وہ اس کا منتظر ہی تھا اور کسی قدر مضطرب بھی۔

”تشریف رکھئے..... جناب۔“ پچھلی رات تو میں آپ کی حالت دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے پہلے کبھی اتنی زیادہ نہ پی ہوگی۔“

”میرے ساتھ کون تھا۔“

”دو حضرات..... جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”کیا یہ کمرہ میرے نام سے لیا گیا تھا۔“

”جی ہاں..... انہوں نے کہا تھا کہ وہ آپ کے ہمراہ ہیں۔ آپ ڈیوٹی پر تھے اور آپ نے بہت زیادہ پی لی، وہ دونوں ہمراہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے منگے کا کوئی آدمی آپ کو اس حال میں دیکھے۔ لہذا وہ آپ کو سیدھے یہیں لیتے چلے آئے۔“

ہوں..... کیا وقت تھا.....!“

”غالبا ساڑھے تین بجے تھے۔“

”تمہاری ڈیوٹی کس وقت سے شروع ہوئی تھی۔“

”تین بجے سے۔“ سپردانز مسکرا کر بولا۔ ”ادھر میں نے بھی تھوڑی سی احتیاط برتی،

آپ کا اصل نام رجسٹر میں درج نہیں ہونے دیا۔“

”بہتر۔“

”لیکن ایک بات اور سنو..... وہ لوگ اُس کمرے سے بیڈ شیٹ تک اٹھالے گئے ہیں۔

کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس سے میں..... مطلب یہ کہ..... میرے لئے تو تم نے ہی کپڑے بھجوائے تھے۔“

”اوہ..... یعنی..... اس کا مطلب یہ.....!“

”ہاں نہ صرف میرا پرس لے گئے بلکہ کپڑے بھی۔“

”تو کیا وہ آپ کے لئے اجنبی تھے۔“

”میں نے کسی کی شکل نہیں دیکھی..... یہاں کے ایک ہوٹل میں کولڈ ڈرنک سپ

ٹا..... پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔“

”اوہ..... تو یہ..... کوئی۔“

”بہتر ہے کہ اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ مجھے کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی

ڈرنک میں..... خیر..... ہاں تو میں کچھ دیر بعد کپڑوں کی قیمت ادا کر دوں گا.....

ی نام پر انگریج رہے گا۔“



”بہت اچھے۔“ فریدی نے قہقہہ لگایا۔ حمید نے شاید پہلی بار اسے اس طرح ہنستے دیکھا تھا

نابھی اُس کی مصیبت بھری داستان پر آئی تھی۔ لہذا اس کا بھی شعلہ جوالہ بن جانا بے حد

ی تھا۔

اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر چیخنے لگا۔ ”میں الو کا پٹھا ہوں اگر اب آپ کا کوئی غیر سرکاری حکم

ارے اگر وہ مجھے بحالت بے ہوشی قتل ہی کر دیتے تو کیا ہوتا۔“

”کیا تم مجھے اتنا بے خبر سمجھتے ہو؟“

”اوہ..... تو وہ سب کچھ آپ کے علم میں ہوا تھا۔“

”ہاں..... آں..... صرف نیا گرہ پہنچ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔“

”اُس راٹھور کو اگر میں نے شارع عام پر ننگا نہ کیا تو کچھ بھی نہ کیا۔“

”نہیں نہیں..... بغیر سمجھے بوجھے اتنا بڑا عہد ہر گز نہ کرو۔ وہ تو اس بے چارے نے

نہ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔“

”زندہ دلی.....!“

”ہاں بھی..... وہ خود کو بہت خوش مزاج اور زندہ دل تصور کرتا ہے۔“

”لیکن آپ اُسے گالی کیوں دلوانا چاہتے تھے.....“ حمید حلق کے بل چیخا اور اے کھانسی آنے لگی۔

”مصر..... مصر..... فرزند.....“ فریدی اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”میں مرزا یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی حفاظت کے لئے کس قسم کے انتظامات کر رکھے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ہونٹ ہلنے سے پہلے ہی تمہاری گردن دبوچ لی جائے گی۔“

”اور اگر وہ گولی ہی مار دیتا تو۔“

”اس سے پہلے خود اس کا جسم چھلنی ہو جاتا۔“

حمید نے پاپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بُرا سامنہ بنایا لیکن کچھ بولا نہیں۔

دفعۃً اُسے فریدی کے متعلق وہ انکشاف یاد آگیا جس نے حمید کو بڑی دیر تک متحیر رکھا تھا۔

”راٹھور سے بنائے محاصرت کیا ہے۔“ دفعۃً اُس نے سر اٹھایا۔

”میا اس نے نہیں بتایا۔“ فریدی مسکرایا۔

”آپ کی زبان سے سن کر زیادہ ملحوظ ہو سکوں گا۔“ حمید نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”جھگڑا ہوا تھا ایک لڑکی کے لئے۔“

”ہا.....!“ حمید نے آنکھیں بند کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ ”رس گھولتے رہے میرے“

کانوں میں..... مکرر ارشاد.....!“

”ایک لڑکی کیلئے جھگڑا ہوا تھا اور میں اسے زبردستی اٹھالے گیا تھا اس کے ہٹ سے۔“

”یہ شعر تو مطلع سے زیادہ زور دار ہے..... اس لئے سبہ کر ارشاد.....!“

”بڑی خوب صورت لڑکی تھی.....“ فریدی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وہ حمید کی باتوں پر دھیان دیئے بغیر یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔

”بڑی خوبصورت لڑکی تھی حمید صاحب..... لیکن وہ کوئی سوئیس لڑکی نہیں تھی۔“

”بہر حال لڑکی تھی۔“ حمید پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”سوئیس لڑکیوں میں سے“

”ماہِ زردوں سے زیادہ نہیں لگے ہوتے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ اب وہ خاموش ہو کر سگار سلگانے لگا تھا۔ حمید نے بھی سوچا کہ اب

عبدال دینا چاہئے۔ کئی سوال تھے ذہن میں..... بات بڑھتی تو ان سوالوں سے تعلق

بالِ بالِ بچنیں بدستور قائم رہتیں..... اس نے ایش ٹرے میں پاپ خالی کرتے ہوئے

لیکن آپ اس معاملے کو چھوڑ کر یک بیک راٹھور پر کیوں چڑھ دوڑے تھے۔“

فریدی کی نظر میز کے پائے سے ہٹ کر اُس کے چہرے پر جم گئی اور اس نے کچھ دیر بعد

بہنی نے سوئزر لینڈ میں اسی کے ہٹ میں دم توڑا تھا اور اس بات کا علم چند آدمیوں کے

ی اور کو نہیں تھا۔ میں جانتا تھا..... راٹھور جانتا تھا اور ہمارا سفیر برائے سوئزر لینڈ

اور دو آدمی اور بھی تھے۔“

”بہنی کے گھر والے تو جانتے ہی ہوں گے۔“ حمید نے کہا۔

”اس کا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں جسے اس کی موت یا زندگی سے دلچسپی ہو۔“

”لیکن بہنی کی موت صیغہ راز میں کیوں رہی۔“

”بعض بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔“

”یادہ اتنا ہی اہم تھا۔“

”نہیں..... اس سے تعلق رکھنے والے کچھ فرائض کی اہمیت نے اس پالیسی پر مجبور

نہ اس کی تنخواہ اب تک الگ رہی ہے اور اس کی وصولیابی بھی بہنی ہی کے جعلی دستخط

دل ہے۔ لہذا اس بہنی کا تذکرہ سن کر راٹھور کی طرف متوجہ ہونا ضروری تھا۔“

”گور وہ سفیر صاحب۔“

”وہ اب بھی سوئزر لینڈ میں ہے۔“

”لیکن آپ تو یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ راٹھور کتنا محتاط ہے۔“

”ہاں.....!“

”اُس کا یہ مطلب ہوا کہ اس پر پہلے ہی سے نظر تھی آپ کی۔“

”تو کیا تم سچ سچ یہ سمجھتے ہو کہ میں پچھلے سال سوئزر لینڈ عیاشی ہی کے لئے گیا تھا۔“

”خدا سب کو نیک تو فیت دے۔“ حمید نے کہا اور مسمی صورت بنائے بیٹھا رہا۔
”مجھے یہاں سے بھیجا گیا تھا..... بھئی کی موت کے بعد۔“

”اور آپ وہاں جا کر لڑکیاں اٹھانے لگے تھے۔“

”ہاں..... آں.....!“ فریدی تلخ لہجے میں بولا۔ ”لڑکیوں کے معاملے میں
اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں..... مثال کے طور پر تم نے کچھلی رات راضی
بالنقصیل پورے دن کی رپورٹ دے دی تھی۔“

”میں نے.....!“ حمید متحیرانہ انداز میں اچھل پڑا۔

”جناب نے.....!“

”ہرگز نہیں.....!“

”برخوردار تم نے اسے یہاں تک تو بتایا تھا کہ بھئی کی تصویر شناخت ہو جانے کے
ہم لوگ سیدھے اسی کی طرف گئے تھے۔“

”خدا کی قسم مجھے یاد نہیں آرہا۔“ حمید نے کہا۔ لیکن دفعتاً اُسے اپنی وہ کیفیت یاد آئی
تھیلی میں کوئی چیز چھپنے کے بعد ہوئی تھی۔ اسے یاد آگیا کہ وہ اس کے بعد ہی سے بے کا
بولے جا رہا تھا۔ لیکن اسے خود اپنی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا
جیسے تلوؤں سے آندھیاں سی کھوپڑی کی طرف جارہی ہوں۔

”میرے خدا.....!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور رحم طلب نظروں۔

فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہوں.....!“ فریدی غرایا۔ ”اب کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”صرف ایک بات..... کہ میں ہوش میں نہیں تھا۔“ حمید نے کہا اور پوری کہا

دہراوی۔ کہانی کے اختتام پر فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے رسی

اٹھالیا۔ کچھ سنتا رہا پھر بولا۔ ”نہیں جناب..... وہ کچھلی رات سے غائب ہے۔“

تک مجھے اطلاع نہیں دی کہ کہاں ہے۔ بہتر..... جی ہاں..... فوراً مطلع کر دوں گا جی۔“

خود ہی لے کر آؤں گا۔“

بمردہ رسیور رکھ کر حمید کی طرف مڑا۔

”شاید تمہارا اعتراف نامہ راضی نے ڈی۔ آئی۔ جی تک پہنچایا دیا۔ براہ راست طلبی کا تو

طلب ہو سکتا ہے۔ اچھا برخوردار جتنی جلد ممکن ہو شہر ہی سے نکل جاؤ..... چھوٹی

جس کے نمبر اور رنگ حسب ضرورت تبدیل ہوتے رہتے ہیں گیراج میں موجود ہے۔

میں نقل ہی ہوگی۔ تار جام کے ہوٹل روانو میں میرے پیغام کے منتظر رہنا۔“

حملہ

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار وقتی ضرورت کے تحت وہ افران

دور بھاگ چکا تھا۔ لیکن اس بار وہ وحشت زدہ تھا اپنی اس تحریر کی بناء پر جو اسے راضی

لپڑی تھی۔ وہ اعتراف نامہ اس کے کیریئر کو داغدار بنا دیتا۔

چھوٹی آسٹن تار جام والی سڑک پر ساٹھ اور ستر میل کی رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔

نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی۔ وہی سکوتر پھر دکھائی دیا جو شہر ہی سے اس کے پیچھے لگ گیا

لیکن اس پر کوئی عورت تھی۔ فاصلہ اتنا زیادہ رہا تھا کہ عورت پہچانی نہیں جاسکتی تھی۔ اس

بہا ضروری نہیں کہ وہ اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ بہتری خواتین بھی اب ایڈنچر کی تلاش

نہاں لے لے لے سفر کرتی ہیں۔

اس نے اپنی گاڑی کی رفتار کچھ اور تیز کر دی اور فوراً ہی محسوس کیا کہ اسکوٹر کی رفتار بھی

تباہت سے بڑھادی گئی ہے۔

دونوں گاؤں مابین فاصلہ اب بھی اتنا ہی تھا کچھ دور چلنے کے بعد حمید نے آہستہ آہستہ

کئی شروع کی اور اس عورت کی مشاقی پر عیش کرتا رہا کیونکہ اس طرح بھی

میسر کے نام پر حمید کی جان نکل گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے خود کو جولی پوز کر کے اس باپ سے فون پر گیسپر کے متعلق بات کی تھی اور اس کے باپ نے جواب میں کہا تھا کہ ”اے مارے گا۔“

جولی اس پورٹ سے جو حمید کا سوٹ کیس لایا تھا کہہ رہی تھی۔ ”گاڑی اور اسکوٹر دونوں بی کیراج میں رہیں گے۔“

”بہت بہتر جناب.....!“ پورٹ نے جواب دیا۔

”کرہ نمبر ۲ جناب۔“ کلرک حمید کی طرف کنجی بڑھاتا ہوا بولا۔

کچھ دیر بعد دونوں کرہ نمبر ۲ میں کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

”کیا حرکت تھی.....؟“ کچھ دیر بعد حمید نے غصیلی آواز میں کہا۔

”تمہیں اطلاع دینے آئی تھی کہ میں اس وقت سچ مچ چرس کے نشے میں ہوں۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”میری پشت پر تین نیلی دھاریاں ہیں۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“

”شائد تم بہت زیادہ چرس پی گئی ہو۔“

”ڈیڈی کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد میں نے سوچا کہ تم بہت بڑے سور ہو۔ اور پھر

رہز کو بتانا ہی پڑا کہ تم لوگ کون تھے لیکن یہ بتاتے وقت وہ بے حد خائف تھے۔ پھر مجھے

ام ہوا کہ وہ غیر معمولی آنکھوں والا کون تھا اب میں تم سے سمجھ لوں گی۔ کیپٹن حمید صبح ہی

تمہاری کوٹھی کے آس پاس منڈلاتی رہی تھی۔“

”جانتی ہو کتنا بوجھ ہے محکمہ سراغ رسانی نے کسی آفیسر کی ٹوہ میں رہنا۔“

”تم کرو..... اب ہم صرف مسٹر اینڈ مسز گیسپر ہیں۔“

”زبردستی۔“

”اُس وقت تک رہیں گے جب تک کہ میری پشت سے نیلی دھاریاں غائب نہ

ہوں۔“

دونوں گاڑیوں کے فاصلے میں کوئی فرق نہ ہونے پایا۔

”اونہ.....!“ کچھ دیر کے بعد وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ ”وہ لیڈی ڈاکٹر انجیلز رہا ہرگز نہیں ہو سکتی..... پھر ہوا کرے کوئی..... دیکھا جائے گا۔“

رودانو تار جام کے اچھے ہوٹلوں میں تھا جیسے ہی اس کی گاڑی پورچ میں رکی ایک ہونے تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

حمید نے پچھلی نشست پر پڑے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

”کاؤنٹر پر آؤ.....!“

پھر وہ گاڑی سے اتر ہی رہا تھا کہ وہ سکوٹر بھی کمپاؤنڈ میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

اور..... اور..... وہ اس لڑکی کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ یہ جولی وکٹر تھی۔

اس نے لاپروائی سے شانوں کو جنبش دی اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا برآمدے میں

ہو گیا۔

صدر دروازے سے گزر کر کاؤنٹر پر آیا۔

پھر جب وہ کاؤنٹر کلرک سے سنگل بیڈ روم کے لئے کہہ رہا تھا دفعتاً پشت سے آواز

”نہیں..... ڈبل بیڈ روم۔“

آواز جولی وکٹر کی تھی اور اس میں بیویوں کی سی غصیلی آواز کی جھلکیاں تھیں۔

بالکل ایسے ہی معلوم ہوتا تھا جیسے بیوی نے اپنے شوہر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

حمید چونک کر مڑا تھا اور پھر اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کا اضطراب طاری ہو

جیسے واقعی وہ اس کا نالائق شوہر ہی ہو۔

”ہوں..... ہوں..... ڈبل بیڈ.....!“ اُس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”بہت بہتر جناب۔“ کاؤنٹر کلرک رجسٹر کھولتا ہوا بولا۔ ”کیا نام لکھا جائے۔“

”مسٹر اور مسز گیسپر.....!“ جولی نے تیز آواز میں کہا اور پھر پتہ بھی اپنے ہی

لکھوا دیا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”تھا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”چیف میری جیب میں نہیں رکھا رہتا۔۔۔۔۔ تم اسے وہیں کوٹھی میں ہی چھوڑ آئی ہو۔“

”اوہ سنو۔۔۔۔۔!“ وہ یک یک بیک بنجیدہ ہو کر بولی۔ پھر کچھ سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر

پیش کے آثار تھے۔ آخر کچھ دیر بعد بولی۔ ”میں تنہا ہی نہیں منڈلا رہی تھی کوٹھی کے آس

نایک اور آدمی بھی تھا اور وہ صورت سے کوئی اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔“

”کیا اس نے میرا تعاقب کیا تھا۔“

”نہیں ایسا تو نہیں ہوا تھا۔“

حمید نے طویل سانس لی اور فریدی کے متعلق سوچنے لگا۔



لنگن بھانگ سے نکل کر سڑک پر آئی۔ فریدی نے جیسے ہی اسے قریبی موڑ پر موڑنا چاہا

دہری طرف سے ایک تیز رفتار گاڑی کے بریک چڑھائے۔ فریدی نے فوراً ہی بریک نہ

لگائے ہوتے تو ٹکر لازی تھی۔

دوسری گاڑی کے اسٹیرنگ پر کوئی عورت تھی۔ جس کے قریب ایک مرد بھی بیٹھا تھا۔

”آئین سمیٹا ہوا بڑے غصے میں گاڑی سے اترا۔“

”کیوں جناب۔۔۔۔۔ دیکھ کر نہیں۔۔۔۔۔!“

”غلطی میری نہیں تھی۔“ فریدی نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ ڈارلنگ۔۔۔۔۔ میرا دل۔“ دفعتاً گاڑی سے عورت کی منمناتی ہوئی سی آواز

آئی اور وہ گاڑی کی طرف دوڑا۔

”اب کیا مجھے بھی اپنے ڈیڑی سے پوانے کا ارادہ ہے۔“

”مجھے ان کی یہ عادت سخت ناپسند ہے۔“ وہ مُراسمانہ بنا کر بولی۔

”حیرت ہے کہ تم اسے برداشت کیسے کرتی ہو۔“

”مجھے خود بھی حیرت ہے؟“ اس نے معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

”بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”قطعی نہیں۔۔۔۔۔ یہ دیکھو کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔۔۔۔۔ عورتوں

احترام کرنے والے مہذب لوگ قطعی سخت ناپسند ہیں۔ میں ایسا شوہر چاہتی ہوں جو مجھ

غصہ آنے کے بعد درگزر نہ کرے بلکہ تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دے۔“

”کیا اس نقلی ازدواجی زندگی میں بھی یہی چلے گا۔“ حمید نے اپنے بازوؤں پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو میں نے تمہیں نروس کرنے کے لئے مسٹر اینڈ مسز کی

لکھوا دیا تھا۔“

”لیکن کاؤنٹر کلرک تو یہی سمجھا ہو گا کہ تم شوہر کو کڑی نگرانی میں رکھنے والی کوئی خاتون ہو۔“

”او نہہ۔۔۔۔۔!“ اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

اتنے لمبے سفر کے بعد بھی اس کے چہرے کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

حمید اسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اس سلونی رنگت کے لئے بیلے کی ادھ کھلی کھان

مناسب رہیں گی۔ کاش اس کے بال بھی اتنے لمبے ہوتے کہ جوڑا سجا سکتی جوڑے میں بیلے

کھیاں۔ بھرے ہوئے بھرپور ہونٹ۔۔۔۔۔ اوپری ہونٹ پر ہلکی سی سبزی مائل روئیدگی۔۔۔۔۔

اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم۔

دفعتاً وہ بولی۔ ”میں تمہارے لئے تمہارا اچھا نہیں کر رہی۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔!“

”تمہارے چیف کے لئے۔“

فریدی ابھی تک اپنی گاڑی سے نہیں اترتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عورت دونوں ہاتھوں سے بایاں پہلو دبائے کھڑکی پر جھک گئی ہے۔ کار وہی ڈرائیو کر رہی تھی اس لئے اچانک دھچکی وجہ سے اس کے اعصاب پر بُرا اثر بھی پڑ سکتا تھا۔

اب تو ازراہ ہمدردی فریدی کو بھی گاڑی سے اترنا پڑا۔

ابھی وہ اس کھڑکی کے قریب پہنچا بھی نہیں تھا کہ بائیں شانے پر شاید ایک باشت کی اونچائی سے طوفان گزر گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں وہ زمین پر تھا۔ پھر لڑھکتا ہوا سڑک کے نیچے چلا گیا۔ ٹامی گن سے نکلی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ بند ہو چکی تھی۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی جیپ جس سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی اندر یہ سب کچھ ہوا۔ شاید ہی کسی کی سمجھ میں آسکا ہو کہ یہ سب کیا تھا۔

فریدی نے گرتے گرتے اندازہ کر لیا تھا اس کار والے عورت اور مرد دونوں ہی چھٹی ہو گئے ہوں گے۔ حملہ آوروں نے غالباً انہیں پہلے ہی ختم کر دینے کی کوشش کی تھی ورنہ اس وقت فریدی کو شاید دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکتی۔

وہ دوسری گاڑی پر دھیان دیئے بغیر اپنی گاڑی کی طرف چھٹا۔ جیپ ابھی نظر میں ہی تھی..... لیکن بھی تیزی سے آگے بڑھی۔ ساتھ ہی فریدی نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا ایک مٹن دبایا اور بولنے لگا..... ”ہیلو..... ہیلو..... ہیلو.....“ کوارٹر..... تھرٹین سٹریٹ پر سیاہ رنگ کی ایک تیز رفتار جیپ شمال کی طرف جا رہی ہے..... اس نے ٹامی گن چلا کر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہ مری گئے ہوں..... ہلو..... ہلو..... میں فریدی آف سی آئی بی بول رہا ہوں۔ میں تعاقب کر رہا ہوں..... اس جیپ کا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ڈیش بورڈ سے آواز آئی۔ ”ہلو..... ہلو..... کرل

ڈیش بورڈ سے پھر آواز آئی۔ ”ہلو..... ہلو..... کرل پلیز..... کیا آپ جیپ کا نیچے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔“

”نہیں..... وہ بہت فاصلے پر ہے..... میں اس کی پوزیشن سے مطلع کرتا رہوں فریدی نے جواب دیا۔

”شکریہ جناب.....!“

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اسے ان راستوں سے گزرتا پڑا جہاں ٹریفک سنگٹل نہیں تھے۔ لہذا جیپ والے دیدہ دانستہ ان راستوں کو نظر انداز کر رہے ہوں۔

جلدی وہ ایک دیر ان سڑک پر مڑ گئی جو شہر سے باہر جاتی تھی۔ فریدی نے ٹرانسمیٹر پر ڈارٹر کو اس پتویشن کی بھی اطلاع دی۔

اب جیپ کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ فریدی کم از کم اتنا فاصلہ برقرار اپاتا تھا کہ ٹامی گن کا شکار نہ ہو سکے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی جگہ لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے اسے کوئی راہ فرار نہ ملے۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ جیپ کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ اس نے بھی ایکسیلیٹر پر دباؤ کم کیا۔

بلکہ ان کی چال اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اسے زد پر لے کر فائرنگ کرنا چاہتے تھے۔

بلکی سی مسکراہٹ فریدی کے ہونٹوں سے نمودار ہوئی اور اس نے اسٹیرنگ کے قریب ہاتھ رکھ کر اسے گود میں رکھ کر اس طرح ڈرائیو کرتے ہوئے مٹن پر انگلی رکھ دی۔ دروازے ہی میں ایک

ڈرائیو ہوا جس میں ہاتھ ڈال کر اس نے ٹامی گن نکالی اور اسے گود میں رکھ کر اس طرح ڈرائیو کرتے ہوئے مٹن پر انگلی رکھ دی۔ دروازے ہی میں ایک

ڈرائیو ہوا جس میں ہاتھ ڈال کر اس نے ٹامی گن نکالی اور اسے گود میں رکھ کر اس طرح ڈرائیو کرتے ہوئے مٹن پر انگلی رکھ دی۔ دروازے ہی میں ایک

ایک آدمی سینے کے بل ریٹکتا ہوا اس کی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا اور ٹامی گن بھی اس ہاتھ میں تھی۔ وہ کچھ دور ریٹکنے کے بعد مڑ کر اسی جانب دیکھنے لگا جہاں سے فریدی نے بیک کی تھی۔

فریدی نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا اور ریٹکنے والے سے تھوڑے ہی فاصلے پر گرداڑ کر رہ گئی۔
 ”ٹامی گن دور پھینک دو..... ورنہ چھلنی کر دوں گا.....“ فریدی نے چیخ کر کہا۔
 ریٹکنے والے کی ٹامی گن دوسرے لمحے میں دور جاگری اور وہ خود چاروں خانے چت گیا۔

قتل یا خودکشی

اس کے دونوں ہاتھ ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے اور وہ بلیکس چھپکائے بغیر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فریدی کی ٹامی گن کارخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

ٹھیک اسی وقت مخالف سمت سے فلائنگ اسکوئڈ کی تین کاریں آتی دکھائی دیں۔ ان میں ٹامی گاڑی کا سائرن چننے لگا تھا۔

فریدی نے بایاں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ تینوں گاڑیاں تھوڑے فاصلے پر ٹنکن کے قریب آگئیں۔ مسلح کاؤٹیل نیچے اتر آئے۔

سڑک پر چت پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال کر وہ جیب کے قریب سے آدمی کی طرف متوجہ ہوئے۔

وہ بے ہوش تھا..... دونوں رانوں کی ہڈیاں چور چور ہو گئی تھیں۔

فلائنگ اسکوئڈ کے کمانڈر نے فریدی کو بتایا کہ تھرٹین اسٹریٹ والی کار کے قریب دو ٹامی میں جن کے سینے چھلنی تھے۔ ان میں سے جو مرد تھا سڑک پر گر اٹھا..... اور

جیب دفعتاً اس طرح رک جیسے اچانک کوئی سانسے آگیا ہو۔ پورے بریک لگے تھے۔ منٹوں طور پر فریدی نے بھی پورے بریک لگائے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ٹامی گن سمیت ڈھلان میں چھلانگ لگا دی۔

فوراً ہی دوسری طرف سے ٹامی گن کی تڑتڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ ڈھلان میں کھول جھاڑیاں تھیں جن کی بناء پر فریدی زیادہ دور تک نہیں پھسلا تھا۔ ورنہ یہ چھلانگ اُسے ڈھلان کے اختتام ہی تک لے جاتی۔

وہ جلد سے جلد کسی مناسب سی جگہ مورچہ سنبھال لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ خود ادم آٹھتے تو بچاؤ بے حد مشکل ہو جاتا۔ وہ انہیں سڑک پر ہی روکے رکھنا چاہتا تھا۔

شاید وہ لوگ بھی خائف تھے کیونکہ انہوں نے جیب کی اوٹ ہی میں پوزیشن لے لی تھی اور ڈھلان کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اب فریدی ایک تناور درخت کی اوٹ میں پہنچ کر اس مقام کو بخوبی دیکھ سکتا تھا جہاں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔

جیب کے نیچے سے دوسری جانب ایک متحرک جسم نظر آیا اور فریدی کی ٹامی گاڑی تھوڑی سی گولیاں اگل کر خاموش ہو گئی۔ سائے میں ایک وحشت ناک چیخ دور تک گونجنے لگی۔

فریدی نے جہاں سے فائرنگ کی تھی اب وہاں نہیں تھا۔ تیزی سے جگہ تبدیل کی تھی۔ اس نے جیب میں دو آدمی دیکھے تھے ایک تو یقینی طور پر زخمی ہوا تھا یا مر گیا تھا لیکن دوسرا

ایک بیک اس کی ٹامی گن سے کچھ گولیاں ٹنکس اور جیب کے چاروں تار بیکار ہو گئے۔ ساتھ ہی اُسے اپنی گاڑی کا بھی خیال آیا..... کہیں دوسرا آدمی اُسے نہ لے اڑے

کنجی بھی اگنیشن ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جاگتے ہوئے ذہن نے صحیح رہنمائی کی تھی۔

ایک پل کے لئے بھی چوک جاتا تو وہاں سے واپسی خود اس کے لئے مسئلہ بن جاتی۔

عورت آدھے دھڑ سے کار کی کھڑکی کے باہر لٹکی ہوئی تھی۔

بہر حال فریدی کا یہ خیال درست نکلا کہ وہ محض اُن ہی دونوں کی وجہ سے بھاگتا رہا۔
ورنہ حقیقتاً مرنا تو خود اسے چاہئے تھا۔

اور پھر جب کچھ دیر بعد ہیڈ کوارٹر میں حملہ آور سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو پوری باز
کھل کر سامنے آئی۔

اس نے بتایا کہ وہ ریٹائرڈ فوجی ہے۔ اس کام پر آمادہ کرنے والے نے اس کے لئے
گن اور ایک جیب مع ڈرائیور مہیا کی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا
تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ایک گاڑی فریدی کی کار کا راستہ اس طرح روکے گی کہ ہوئے
ہے ایکسٹنٹ ہی ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا کام ہو گا کہ وہ فریدی سمیت دوسری کار والوں
بھی صفایا کر دے۔ لیکن وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس نے فریدی سے پہلے ان ہی دونوں کو ختم کرنا کیو
مناسب سمجھا تھا۔ وہ اس کا جواب نہ دے سکا۔ اول تو اسے اس سلسلے میں کوئی واضح ہدایت نہ
ملی تھی کہ حملے کی پہل کس سے کرے دوسرے وہ خود فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا
اسے کیا کرنا چاہئے۔

اور پھر جب اس نے اس کام پر اکسانے والے کا نام لیا تو سبھی متحیر رہ گئے۔ وہ
مشہور اور نیک نام ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ شہرت اس سلسلے میں رکھتا تھا کہ نہ صرف مجرمانہ
بسر کر رہا تھا بلکہ اپنی فقیرانہ زندگی کی بناء پر عوام میں مقبول بھی تھا۔ حاضرین کو اپنی سماعت
یقین ہی نہ آ سکا۔ لیکن فریدی کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ دیکھی گئی۔

”اب کیا خیال ہے۔“ اس نے ایس۔ پی ہومی سائیڈ سے پوچھا۔
”سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں بیراگی صاحب کا نام۔۔۔۔۔“ وہ مضطربانہ
میں ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

”دیکھنا تو پڑے گا۔۔۔۔۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔
ایس۔ پی ہومی سائیڈ نے فون پر نمبر ڈائل کر کے کسی کو مخاطب کیا اور شاید جواب

رسمی قدر متحیر بھی ہوا۔ ریسورر کہ کر فریدی سے بولا۔ ”وہ اپنی سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔“

”گھر کے نمبر معلوم کیجئے۔“ فریدی نے کہا۔

گھر کے نمبر اس نے دوبارہ فون کر کے کسی سے معلوم کئے تھے۔ انہیں بھی آزمایا۔ لیکن
جواب نہ ملا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی لیکن شاید ریسورر اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔
”کیا خیال ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میری دانست میں تو ہمیں خود ہی ان کے بنگلے تک

پہنچنا چاہئے۔“

”نک۔۔۔۔۔ کیا آپ کسی خاص نتیجے پر پہنچے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر بیراگی کا قتل ہمیں خود کشی ہی کی شکل

میں ملے گا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”ہمیں دیر نہ کرنی چاہئے۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔

فلائنگ اسکوئڈ کی گاڑیاں ایک بار پھر حرکت میں آ گئیں۔

ڈی۔ ایس۔ پی جو اپنے نام کے ساتھ بیراگی بھی استعمال کرتا تھا صرف اسی نام سے

مشہور تھا۔ رہائش ایک چھوٹے سے صاف ستھرے بنگلے میں تھی۔ بالکل تنہا رہتا تھا۔ حد یہ ہے
کہ سرکاری اردلی تک نہیں رکھتا تھا۔ اردلی کو حکم تھا کہ اپنے گھر پر پڑائیش کیا کرے اور تنخواہ
سرکاری خزانے سے وصول کرے۔ اپنے سارے کام خود اپنے ہاتھوں انجام دیتا تھا۔

بنگلے کا آمد و رفت والا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ ایس۔ پی نے کال مل کاٹن دیا لیکن جواب
نہ ملا۔ کچھ دیر انتظار کر کے وہ بلا آخر بنگلے میں داخل ہو گئے۔

بنگلہ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایس۔ پی نے اسے بلند آواز میں
پکارا۔ لیکن باز گشت کے علاوہ اور کچھ نہ سن سکا۔

اور پھر بیڈ روم میں بیراگی کی لاش چھت سے لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ گلے میں رسی کا پھندا
پڑا ہوا تھا اور رسی کا دوسرا سرا چھت کے کڑے سے بندھا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہاں قبرستان کا سناٹا طاری رہا۔ پھر ایس۔ پی فریدی کی طرف مڑا
فرش پر پڑے ہوئے سیلنگ فین کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”کرئل.....!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ پیشین گوئی تھی یا آپ کو پہلے
سے علم تھا۔“

”بیراگی جیسے لوگ بظاہر خود کو بے داغ رکھنا چاہتے ہیں اور ایسے حالات میں انہیں ہی
کرنا پڑتا ہے۔“

”لیکن یہ خودکشی..... آپ نے کہا تھا کہ قتل خودکشی کے روپ میں پیش کیا
جاسکتا ہے۔“

”یہی ہوا ہے..... یقین کیجئے..... بیراگی کو گلا گھونٹ کر مارنے کے بعد اس طرح
لٹکا دیا گیا ہے۔“

”لیکن..... لیکن.....؟“

”ادھر دیکھئے.....“ فریدی نے فرش پر پڑے ہوئے سیلنگ فین کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ ”خودکشی کرنے والے آسان سے آسان طریقہ اختیار کرتے ہیں چھت سے سیلنگ
فین اتارنا اور اس کی جگہ کڑے میں رسی باندھنا..... وقت چاہتا ہے پکتان صاحب.....“

جسے زہر میسر آسکے..... وہ رسی کے پھندے سے اجتناب ہی کرے گا۔ ذہنی یا جسمانی
اوتیوں سے بچنے کے لئے ہی لوگ خودکشی کی طرف جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں اس

خواب گاہ میں خواب آور گولیوں کی کئی شیشیاں موجود ہیں، دو تو بالکل ہی نئی ہیں ان کی سیل
تک نہیں توڑی گئی۔ یہ دو شیشیاں خودکشی کے لئے کافی نہ ہوتیں۔“

”لیکن ضروری نہیں کہ اس تک قانون کا ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی خواب آور گولیاں کام
کر جاتیں..... مضبوط اعصاب کے لوگوں پر یہ ذرا دیر سے اثر انداز ہوتی ہیں۔“ ایس۔ پی

نے کہا۔
”اول تو مضبوط اعصاب کے لوگوں کو خواب آور گولیوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔“

بہرے اگر وہ جلد سے جلد مرنا چاہتا ہے تو اس نے ڈرائنگ روم والی چھت کے کڑے کو
ہاں نہیں استعمال کیا۔ ڈرائنگ روم میں چھت کے پچھلے کی بجائے پیڈنٹل فین استعمال ہوتا

تھا۔ کڑا بالکل خالی تھا..... یہاں دراصل قاتل یا قاتلوں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔
ہاں اسے گلا گھونٹ مارا..... وہیں خودکشی کا منظر بھی ترتیب دے دیا۔ ہو سکتا ہے وہ بنگلے

کا پہلی بار آئے ہوں۔ بیراگی کو چھت سے پچکھا اتارنے سے قبل ڈرائنگ روم کا خالی کڑا
دریاد آتا..... اور وہ پچکھا اتار کر خودکشی کرنے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔

ایس۔ پی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ پھر اگر وہ قتل ہے تو اس کا
طلب ہوا کہ بیراگی بھی درمیانی آدمی ہے۔“

”صرف یہی نہیں بلکہ درمیانی آدمی کا خاتمہ اصل مجرم کو تاریکی میں رکھنے کا باعث بھی
ہو سکتا ہے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ پھر اس نے ایک بیک چوک کر کہا۔ ”وہ کار اور دونوں

ٹینس ان کے لئے آپ نے کیا کیا؟“

لاشیں ابھی تک شناخت نہیں ہو سکیں۔ گاڑی پر نصیر آباد کی نمبر پلیٹ ہے۔ نصیر آباد
فون پر رابطہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نمبر کی گاڑی وہاں سے پچھلی رات کو چوری
کی تھی۔ میں نے گاڑی کے مالک کو یہاں طلب کیا ہے۔

پھر ایس۔ پی نے اپنے ساتھیوں سے مڑ کر کہا۔ ”یہاں کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔“
”اب مجھے اجازت دیجئے۔“ فریدی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھہریئے کرئل۔“ وہ مضطرب انداز میں بولا۔ ”اگر یہ قتل ہی ہے تو آپ خطرے میں ہیں۔“
”میں ہر وقت خطرے میں رہتا ہوں۔“ فریدی مسکرایا۔ ”اور دروازے کی طرف



مید نے ایک بار پھر فون پر فریدی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور وہ مل ہی گیا۔

”جہیں بذریعہ سمن بھی لاش شناخت کے لئے طلب کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ کسی دوسرے طریقے سے یہی کام نہیں لیا جاسکتا..... مثلاً جہز!“

”جہز نے عورت کی لاش سے لاشی کا اظہار کیا ہے۔“

”تو کوئی اور پڑوسی۔“

”میرے چیف کا خیال ہے کہ چونکہ تم اس کی ٹوہ میں رہتی تھیں اس لئے تم نے

محبت سے وہاں آنے والی عورتوں پر نظر رکھی ہوگی۔“

”کیا بات ہوئی؟ بھلا عورتوں ہی پر خصوصیت سے کیوں نظر رکھی ہوگی۔“

”کیونکہ تم لڑکوں کی بجائے لڑکیوں سے محبت کرتی ہو۔ یہ بھی میرے چیف ہی کا خیال

ہو، نہ میں اتنا بھی ناامید نہیں تمہاری طرف سے۔“

”تم بھی الو ہو..... اور تمہارا چیف بھی۔“ وہ کسی قدر جھینپ کر بولی۔

حمید نے پہلی بار اُسے جھینپتے دیکھا تھا۔

”میرا چیف ہو سکتا ہے۔“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”کیونکہ وہ کسی سے بھی محبت کرنے کی

لاحت نہیں رکھتا۔“

”میں نہیں جاسکتی..... اور تم یہ کیا بکواس کر رہے تھے کہ میں اس کے لئے تمہارے

لپٹے لگی تھی۔“

”تم نے کہا تھا..... یا یہ غلط ہے۔“

”میں تمہارے لئے تمہارے پیچھے لگی ہوں۔“ وہ اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھا کر

کہا۔ ”کیونکہ تمہاری شکل الہڑ لڑکیوں سی ہے۔“

حمید نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ”سنا آپ نے..... چونکہ میری شکل الہڑ

لڑکیوں کی سی ہے اس لئے وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ خدا کی قسم..... کیا میں غلط کہہ رہا

تھ آپ کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا قطعی غلط ہے..... کیا؟ کیوں؟ ارے باپ

سہا؟ ہاں؟ ہاں؟ نہیں..... ہوں..... اچھی بات ہے“ وہ ریسور رکھ کر مڑا اور تھوڑی

”میں کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔“ حمید نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”اوہ اچھا.....“

آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کوٹھی کی نگرانی ہو رہی ہے جس وقت میں رولز

تھا ایک آدمی..... آپ کو معلوم ہے..... اور تو پھر مجھے یہ اطلاع کسی دوسرے سے

تھی..... ہائیں..... آپ کو کیسے معلوم ہوا اور تو کیا یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ارے

وہی لڑکی ہے..... بچھلی رات والی..... وہ جس کے سکوٹر پر..... کیا..... جی نہیں

..... وہ کہہ رہی ہے کہ میں تمہارے چیف کے لئے تمہارے پیچھے لگی ہوں۔ آپ

آنکھوں کے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا؟ کمال کرتے ہیں آپ

بھی..... کیسے پیچھا چھڑاؤں۔ وہ اس وقت بھی سامنے کھڑی اپنے مخصوص انداز میں

رہی ہے..... کیا؟ لاشیں..... اوہ..... لیکن وہ کیا کر سکے گی..... اگر وہ اس پر تیار

ہو تو..... اچھی بات ہے..... ٹھہریے پوچھتا ہوں۔“

حمید ماؤتھ پیس کو ہتھیلی سے بند کر کے جولی دکنر کی طرف مڑا۔

”میرا چیف کہتا ہے کہ وہاں دو لاشیں ملی ہیں..... اس کا خیال ہے کہ تم انہو

شناخت کر سکو گی۔“

”مم..... میں.....!“ وہ ہلکائی پھر ہنس کر بولی۔ ”تم مذاق کر رہے ہو۔“

”نہیں..... یہ حقیقت ہے۔ یہ چیف کا خیال ہے کہ وہ دونوں غالباً وہاں آتے جا

رہے ہوں گے جہاں سے لڑکی کا جنازہ اٹھا تھا۔“

”بھلا خواہ مخواہ خیال کیسے پیدا ہوا۔“

”مرد کی لاش کی شناخت مالک مکان مسٹر جہز نے کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق

لڑکی کے شوہر کی لاش ہو سکتی ہے۔ اب تمہیں عورت کی لاش کی شناخت کرنی ہے؟“

”دونوں لاشیں ساتھ ملی ہیں۔“ جولی نے پوچھا۔

”ہاں ایسا ہی ہوا ہے؟“

”لیکن میں اب شہر واپس نہیں جاتا چاہتی۔“

کھل کر گفتگو کرنا پسند کرو گے۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں..... کھل کر گفتگو نہ کرنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔“
”تم کسی بھی کیس کے سلسلے میں اس وقت تک کھل کر گفتگو نہیں کرتے جب تک کہ حالات کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہ لے لو۔“

”اکثر میں نے اپنے ادہام تک گوش گزار کر دیئے ہیں۔“

”اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہوگی۔“ ڈی۔آئی۔ جی مسکرایا۔

”ایک گزارش میری بھی ہے۔“

”کہو.....“

”حمید کو آپ نے براہ راست کیوں طلب فرمایا تھا۔“

”ادہ..... وہ ایک ذاتی مسئلہ تھا۔“

”کیا اس کے خلاف کوئی اہم رپورٹ ملی ہے۔“

”نہیں بھئی..... دراصل ایک رشتے کے سلسلے میں اس کے ایک خاندان کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں۔ وہ ان لوگوں کو قریب سے جانتا ہے۔“

”ادہ.....!“

”کیا وہ ابھی واپس نہیں آیا۔“

”جی نہیں..... میرا خیال ہے کہ جی۔سی۔ ایچ سوسائٹی والے کیس کی کوئی کڑی ہاتھ آگئی ہے اور وہ مجھ سے مشورہ لئے بغیر الجھ گیا ہے۔“

”میں اس وقت دراصل اسی کیس کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”آخر اس لاش کو اس طرح منظر عام لانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے جس طرح انہوں نے اس کے سر اور ہاتھ پیر غائب کر دیئے تھے اسی طرح لاش کے ٹکڑے کر کے اسے آہستہ عمارت سے ہٹا سکتے تھے۔ پھر خود بھی غائب ہو جاتے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔“

”اس کیس میں سب سے زیادہ دلچسپ پوائنٹ یہی ہے۔“

”تم کس نتیجے پر پہنچے ہو۔“

”یقین فرمائیے..... یہی سوال میرے ذہن میں بھی موجود ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا بیوقوف جواب نہیں مل سکا۔“

”پھر تم ٹھیک اسی عمارت میں جا پہنچے ہو..... جہاں سے جنازہ اٹھایا گیا تھا اور دوسرے نام پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ تم بچ جاتے ہو لیکن وہ دونوں مارے جاتے ہیں جنہوں نے ہمارا راستہ روکا تھا اور ان میں سے ایک جی۔سی۔ ایچ سوسائٹی والی مقتولہ کا مبینہ شوہر ثابت ہوتا ہے۔“

”وہ خاموش ہو کر کچھ دیر تک فریدی کے چہرے پر نظر جمائے رہا پھر بولا۔“ ”تم حملہ اردن کا تعاقب کر کے ایک کوزخمی کر دیتے ہو اور دوسرا تمہارے ہی ہاتھوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی نے تم پر حملہ کر لیا تھا۔ تم اس آدمی کے لئے بھی فوری طور پر پیشین گوئی کر دیتے ہو کہ اب تک وہ بھی قتل کیا جا چکا ہو گا اور اس قتل کو خود کشی کا رنگ دینے کی ٹش بھی کی گئی ہوگی۔ اس طرح پولیس کی رسائی ڈی۔ایس۔ پی بیراگی کی لاش تک ہوتی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تمہاری پیشین گوئی سے مختلف کہانی نہیں سناتی۔ یہ سب کیا.....؟ مجھے بتاؤ۔“

”میں کیا عرض کروں..... بعض اوقات قیاس بھی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب اس قسم کی سازشیں کرتے ہیں انہیں پل پل کی خبر رہتی ہے۔ اسی اندازے کی بناء پر نائنہ بیراگی کے قتل کی پیشین گوئی کی تھی۔“

”بہر حال تم نے بیراگی کو درمیانی آدمی سمجھ کر ہی پیشین گوئی کی ہوگی۔“

”جی ہاں..... میں جانتا تھا کہ بیراگی کو مجھ سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں ہو سکتی۔“

”مگر وہ کون ہو سکتا ہے..... جس کیلئے وہ اس حد تک جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔“

”کیا تو دیکھنا ہے.....“ فریدی نے جواب دیا۔

”اوہ..... سمجھ گیا.....؟ تم وزارت امور خارجہ کے سیکریٹری کی درخواست پر بھیجے جئے تھے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ ڈی۔ آئی۔ جی کے چہرے پر کسی قدر جھنجھلاہٹ اور شرمندگی کے لہجے آثار تھے۔



حمید نے اطمینان کا سانس لیا۔ تو ڈی۔ آئی۔ جی کے یہاں براہ راست طلبی کا راٹھور والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ بات اُسے فون پر فریدی نے بتائی تھی۔ لیکن واپسی کے لئے کچھ نہیں کہا تھا۔ تو پھر اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ ویسے تار جام کا ہوٹل رووانو ایسی ہی جگہ تھی کہ جب تک سہولت ہو وہاں قیام کیا ہی جائے۔

پڑھی لکھی خوبصورت لڑکیاں سرو کرتی تھیں۔ رات کے کھانے کے اوقات میں فلور ٹوہوتا تھا۔ کمرے ڈنر کے لئے الگ انتظام تھا۔ اگر کوئی میز پر تنہائی محسوس کرتا تو اس کے لئے ساتھی کا انتظام بھی بطریق احسن ہو جاتا تھا۔

کچھ بھی ہو۔ اس نے سوچا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فریدی کی زندگی خطرے میں تھی۔ اسے راٹھور یاد آیا۔ کیا یہ حرکت اسی کی ہو سکتی ہے..... خون کھولنے لگا اپنی بے بسی یاد آ کر۔

کاؤنٹر پر حساب بے باق کر کے وہ سوٹ کیس سنبھالے ہوئے باہر آیا۔ گیراج سے کار نکلا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ لیکن گھر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔

شہر میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے ریڈی میڈ میک اپ میں آگیا۔ یعنی وہی دونوں ہارنگ اپنی ناک کے تھنوں میں رکھ لئے جن کے کھچاؤ سے ناک کی نوک کے ساتھ بالائی نونٹ بھی کسی قدر اوپر اٹھ جاتا تھا اور سامنے کے دو دانت مستقل طور پر دکھائی دینے

”میں تمہارے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔“

فریدی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں آپ کو بتاؤں بھی تو کیا..... خیر سنئے..... آپ کو وزارت امور خارجہ کا جھٹی یاد ہی ہو گا۔“

”وہ جس کی موت کی تفتیش کے سلسلے میں تم سوئٹزر لینڈ گئے تھے۔“

”جی ہاں..... وہی.....!“ فریدی نے کسی قدر اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اس کے جنازے کے سلسلے میں چھان بین کرتے وقت ایک حیرت انگیز چیز سامنے آئی۔ وہ قحیٰ مسٹر بھٹی کی عدم آباد سے واپسی؟“

”کیا مطلب.....؟“ ڈی۔ آئی۔ جی چونک کر بولا۔

فریدی نے اسے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ ”بھٹی کی موت کی خبر چھپائی گئی تھی..... آج بھی بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں۔“

”لیکن یہ تو سوچو کہ اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”کیا آپ کو علم ہے کہ بھٹی کی موت کی خبر عام کیوں نہیں ہوئی تھی۔“

”غالبا کوئی بین الاقوامی چکر تھا۔“

”میں آج آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی..... یہ چیز انہیں بار کرائی گئی تھی جو بھٹی کی موت سے واقف تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اس کی موت کا تذکرہ کسی سے نہ کریں۔ کیونکہ اس سے بعض بین الاقوامی پیچیدہ گیاں ہو سکتی ہیں۔“

”پھر کیا بات تھی.....؟“ ڈی۔ آئی۔ جی مضطربانہ انداز میں آگے جھک گیا۔

”بات..... میرا خیال ہے کہ ابھی میں اس سلسلے میں کچھ نہ بتا سکوں گا۔“

”کیوں.....!“

”ایک بہت بڑے آفیسر کا نجی معاملہ ہے۔“

دیاگرہ کے کمرہ نمبر ۳۶..... دوسری منزل شاہد پرویز نام ہے۔“

”میں آری ہوں..... کہیں جانا مت.....“ آواز آئی اور فوراً ہی سلسلہ بھی منقطع

ہوا۔

حمید ریسور کریڈل میں رکھتے وقت سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے ایک کیس کی تفتیش کے دوران ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خود ہی مل بیٹھی تھی۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا بھی ان واقعات سے کوئی تعلق ہو۔

”بالکل نہیں.....!“ وہ دل کو سمجھانے لگا۔ وہ ایک کھلڈرسی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہلکی نظر نہیں رہتیں کہ کوئی کسی سے ان کا تعاقب کرائے۔ وہ خود ہی مل بیٹھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں میں سے کوئی اس کیلئے اتنا ہی پرکشش ثابت ہوا ہو کہ بے اختیار کھینچی چلی آئے۔ وہ کمرے میں ٹہلتا اور تمباکو پھونکتا رہا۔ آدھے گھنٹے میں کئی بار پاپ بھرا گیا تھا۔ ٹھیک ۱۵ گھنٹے کے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔

حمید نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ جانا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا رخ بھی بدی کی طرف رہا ہو گا۔ گھٹیلے جسم کا دراز قد آدمی تھا۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان رہی۔ لالہ چہرے کی رنگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ کشیدنی منشیات کا عادی ہے۔

”پیچھے ہٹو.....!“ وہ غرایا۔

حمید اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے پیچھے ہٹا چلا گیا۔ ساتھ ہی وہ اندر آگیا تھا۔ اس نے حمید کی طرف رخ کیے ہوئے لات مار کر دروازہ بند کیا اور ریوالتور والے ہاتھ کو دھشیاہ انداز میں نشانے کر بولا۔ ”میں تمہیں جانتا ہوں..... تم حکمہ سراغ رسانی کے ایک آفیسر ہو۔“

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”خوہ مخوہ.....!“ حمید سر جھٹک کر بولا۔

”خوہ مخوہ نہیں..... میں نے آج تک بلاوجہ قتل نہیں کیا۔“

لگتے تھے۔

پھر تاریک شیشوں کی عینک کا اضافہ تو گویا اس میک اپ کا فٹنگ ٹچ تھا۔ اب کون تھا جو حمید کو قریب سے بھی پہچان لیتا۔

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن وہ ابھی تک فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ شہر پہنچ کر ہی اس نے سوچا کہ اسے نیاگرا کی طرف جانا چاہئے۔ جہاں دوسری منزل کے کمرہ نمبر ۳۶ میں وہ اسی نام سے قیام کر سکے گا جو سپروائزر نے اس کے لئے منتخب کیا تھا۔

اس نے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کے قریب گاڑی روکی اور اتر کر بوتھ میں آیا۔ فون پر نیاگرا سے رابطہ قائم کر کے پروفیسر شرما سے وہ نام دریافت کیا جس کے لئے کمرہ بک کیا تھا۔ ”شاہد پرویز.....!“ وہ سلسلہ منقطع کرتا ہوا بڑبڑایا۔ ”نام تو اچھا خاصا ہے مگر فی الحال صورت ایسی نہیں ہے۔“

اس میک اپ کے بعد وہ آئینہ دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

تو اب وہ شاہد پرویز تھا اور یہ تو اس نے نیاگرا کے اس کمرے میں پہنچنے کے بعد ہی سوچا تھا کہ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سیدھا گھر چلا جاتا۔ لیکن چھٹی حس کو کیا کرتا جو کسی طرح بھی گھر کی جانب رغبت نہیں ہونے دیتی تھی۔

اس نے سوچا آخر وہ گھر کیوں نہیں جانا چاہتا۔ گھر کے بارے میں سوچتے ہوئے جولی وکٹر پھر یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کیوں نہ اسے فون کیا جائے اس کے گھر کے فون نمبر وہ بھولا نہیں تھا۔

ہوٹل کے ایجنٹ سے رابطہ قائم کر کے نمبر بتایا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دوسری طرف سے جولی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو..... کون ہے؟“

”پچانو.....!“ حمید احمقانہ انداز میں مسکرایا۔ ناک سے اسپرنگ نکال لیے تھے اس لئے مسکرانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”اوہ..... تم ہو..... کہاں سے بول رہے ہو۔“

”میرے قتل کر دینے کی وجہ بھی جلد ہی بیان کرو۔ کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابھی ایک لڑکی یہاں آ رہی ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں میری لاش دیکھے۔ اگر تم نے کوئی معقول وجہ بیان کر دی تو ہم یہاں سے کہیں اور چلے چلیں گے اور پھر تم مجھے مل کر دیتا۔“

حمید نے محسوس کیا کہ گیسپر ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے۔ اس نے اسے دوسری طرف اچھال دیا اور خود تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ گیسپر نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ لیکن جولی ان درمیان آتی ہوئی دھاڑی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”تم میری..... ٹوہ میں رہتے ہو..... کیوں؟“ وہ اس کا شانہ جھنجھوڑ کر بولی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر پلکیں چھپکائیں۔ ”خاموش کیوں ہو..... بولو“ اس نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ ”م..... میں..... ٹوہ..... میں..... سن..... نہیں تھا۔“ وہ ہکلیا۔ ”کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ تم اس کے ساتھ ہو۔“ ”کس نے اطلاع دی تھی۔“

”م..... میں نہیں جانتا..... اس نے نام نہیں بتایا تھا۔“ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے کینے ہو۔ کیا میں اس سے شادی کرنے جا رہی جاؤ..... نکلو یہاں سے..... چلے جاؤ..... اب کبھی اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ سر جھکائے ہوئے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ حمید نے اُسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور اہمیت انگیز تبدیلی کے متعلق سوچتا رہا۔

جولی وکٹر نے دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا اور حمید کی طرف مڑ کر بولی۔ ”مجھے افسوس..... یہ گیسپر تھا..... مجھے شدت سے چاہتا ہے۔ میرا کزن بھی ہے۔ ڈیڈی اسے پسند نہیں۔ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ خطرناک قسم کا غنڈہ ہے۔ کثرت سے چرس پیتا ہے۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ میں اس سے شادی کر لیتی..... لیکن تم نے ابھی دیکھا ہے۔“ ”کیا دیکھا ہے.....“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”م دبا کر بھاگ گیا۔“

”پھر کیا کرتا.....؟“

”بلف کر رہے ہو۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ ”ارے یار تم وجہ بیان کرو..... شاید میں تمہاری غلط فہمی رفع کر سکوں۔ اس سے پہلے بھی کئی حضرات محض غلط فہمی کی وجہ سے چڑھ دوڑے ہیں اور پھر انہیں شرمندہ ہونا پڑا ہے۔“ ”کیا آج کل تم جولی وکٹر کے ساتھ نہیں دیکھے جاتے۔“ ”میرا خیال ہے کہ تم اس کے والد نہیں ہو۔“ حمید نے ترش روئی سے کہا۔ ”تو تمہیں اعتراف ہے.....“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”ارے مجھے ڈر ہے کسی کا..... وہ خود ہی تو ملی تھی مجھ سے۔ میں نے کوشش نہیں کی تھی کہ وہ میری طرف متوجہ ہو..... اور پھر تم ہو کون۔“ جواب میں وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے دروازے کو دھکا دیا۔ بس پھر وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ حمید نے نہ صرف اس کے ریوالتور پر ہاتھ ڈال دیا بلکہ بائیں کپٹی؛ اس زور کا کہ رسید کیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اب ریوالتور حمید کی گرفت میں تھا..... اور جولی وکٹر دروازے میں کھڑی تھیں۔ انہیں اندازے میں پلکیں جھپک رہی تھی۔

دفعتاً جنینی نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ خود نہتا ہو چکا ہے حمید پر چھلانگ لگائی۔ جیہاں گولی نہیں چلاتا چاہتا تھا..... اور پھر بجلی کی طرح یہ خیال ذہن کے تاریک گوشوں سے ابھرا کہ ریوالتور خالی معلوم ہوتا ہے۔

اب دونوں فرش پر آ رہے تھے۔ اچانک جولی وکٹر چیخی۔ ”گیسپر..... گیسپر.....“ ”کیا ہو رہا ہے..... الگ ہو..... ہٹ جاؤ..... ہٹو۔“

”ایک بھر پور ہاتھ میرے منہ پر سید کر تا اور بال پکڑ کر گھسیتا ہوا یہاں سے لے جا رہا تھا مجھے عاشق نہیں چاہئے..... مسٹر کیپٹن..... میں مرد چاہتی ہوں۔“

”مردی خطرناک غنڈے ہوتے ہیں۔“

”نہیں..... مرد وہ ہے جو اپنی توہین کسی طرح بھی برداشت نہ کر سکے..... اور معاملے میں عورت، مرد، بیوی یا محبوبہ کی تخصیص نہ کرے..... کیا سمجھے۔“

”تو پھر یہاں کیوں آئی ہو۔“

”تمہاری زندگی تھی اس لئے قدرت کی طرف سے انتظام ہو گیا۔“

”اوہ..... کیا مجھے اتنا گیا گذرا سمجھتی ہو۔“

”کیا اس نے تمہیں ریوالتور سے کور نہیں کر رکھا تھا..... اگر میں نہ آجاتی تو تمہیں اس پر حملہ کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔“

”اے کس نے مطلع کیا ہو گا۔“

”ہو گا کوئی.....!“ جولی نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

”لیکن مجھے تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ کون ہے۔“

”کیوں.....؟“

”غالباً وہ گیسپر کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس قسم کی خبر! اُسے فوری طور پر اتنا مشتعل کر دیں گی کہ وہ قتل تک کر گذرے۔ ابھی کل ہی میرے چیف بھی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔“

”ہاں اس نقطہ نظر سے تو سوچنا پڑے گا۔“ جولی نے کہا اور اس کی آنکھوں سے گہرائٹ مترشح ہونے لگا۔

”چلو ختم کرو..... تم اپنے ہی متعلق مجھے کچھ بتاؤ۔“

”اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔“

”میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔“

”اوہ..... تو کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔“

”اور دیکھو..... تمہارے علاوہ اور کسی کو یہ نہیں معلوم کہ میں یہاں شاہد پرویز کے

ہم سے مقیم ہوں۔“

”ہوں..... سمجھی۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔ ”لیکن یہ تو سوچو ڈیر کیپٹن کہ مجھے اس سے کیا

فائدہ کہ میں خود ہی تم پر حملہ کر اؤں اور پھر خود ہی بچانے بھی دوڑی آؤں۔“

”قطعی فائدہ ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم الٹی کھوپڑی رکھتی ہو۔ اکثر فلموں

میں تم نے دیکھا ہو گا کہ ہیروئن غنڈوں میں گھری ہوئی ہے کہ اچانک کسی طرف سے ہیرو

نہوار ہو کر ٹوٹ پڑتا ہے ان پر۔ پھر تو ہیروئن کو اس سے محبت کرنی ہی پڑتی ہے۔“

”تو میں نے جناب کا دل جیتنے کے لئے یہ حرکت کی ہو گی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”کبھی آئینے میں بھی دیکھی ہے لومڑی جیسی شکل۔“

”تو پھر بکو جلدی سے کیا بات تھی..... میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میں..... ان لوگوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہوں جو تمہیں یا

نہارے چیف کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کبھی ہوئی بات کا وزن معلوم

کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دفعۃ جولی نے جھپٹ کر گیسپر کا ریوالتور اٹھا لیا جو اس ہنگامے کے دوران حمید کے ہاتھ

سے نکل کر ایک گوشے میں جاگرا تھا۔

”اب بتاؤ.....!“ وہ اس کا رخ حمید کی جانب کرتی ہوئی بولی۔

”ریوالتور خالی ہے.....!“ حمید مسکرایا۔

”تمہارا خیال غلط ہے..... یہ دیکھو.....!“

بے آواز ریوالتور کی گولی نے میز پر رکھے ہوئے بلوری الیش ٹرے کے ہزاروں ٹکڑے

کرائے۔

حمید خاموش ہو گیا۔ جولی مسکرا کر بولی۔ ”تم سمجھتے تھے شاید کیسپر نے ریوالور کی پروا نہ کر کے تم پر اس لئے چھلانگ لگائی تھی کہ وہ خالی تھا..... شش..... وہ ایسا ہی بے جگر ہے..... جب اس پر خون سوار ہوتا ہے تو عقل اس سے دور بھاگتی ہے..... یہ لو۔“

اس نے ریوالور حمید کی طرف اچھال دیا۔



فریدی بہت غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ ”پھر کیا ہوا۔“

”ریوالور میری طرف اچھال کر غصے میں بھری ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔“ حمید نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں جہاں تھا وہیں رہا..... پھر بڑی دیر بعد اپنے اعصاب پر قابو پا سکا تھا۔ وہ جا چکی تھی..... میں نے نیا گرا کی پوری عمارت چھان ماری۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیسپر کو فون پر اطلاع کس نے دی تھی۔“

”ظاہر ہے کہ وہ یا تو سپر وائزر ہو سکتا ہے یا پھر وہ لوگ جو تمہیں اس رات نیا گرا میں چھوڑ گئے تھے۔“

”راٹھور.....!“ حمید نے نراسام نہ بنا کر کہا۔

”کوئی بھی ہو سکتا ہے..... لیکن وہ جولی اور کیسپر سے اچھی طرح واقف ہے۔“

”آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”عنقریب ایک بڑا کھیل دیکھو گے۔“ فریدی مسکرایا۔

”کیا یہ کوئی ایسا ہی اہم معاملہ ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں کو ختم کر دینے کی ضرورت

محسوس کی جائے۔“

”کیوں نہیں..... خود سوچو..... میں نے بھٹی کی لاش نہیں دیکھی تھی اسے وہاں دفن کر دیا گیا تھا اور میں تدفین کے بعد سوئٹزر لینڈ پہنچا تھا۔ بہر حال اب وہی بھٹی یہاں زندہ

لہا جا رہا ہے اور ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو تم پر کوئی نشیلا دوا استعمال کر کے تم سے دن بھر پورٹ حاصل کر لیتے ہیں۔“

”اور یہ کہانی اس بے سرو پا لاش سے شروع ہوئی تھی۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں..... آں..... اسی کے توسط سے تو بھٹی زندہ ہوا ہے۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ بھٹی کے سلسلے میں آپ نے سوئٹزر لینڈ میں کیا کیا تھا۔“

”مصر کی علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔“

”آپ کو وہاں بھیجنے کا مقصد کیا تھا۔“

فریدی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھا کر وہ کچھ کہنے ہی

اتھا اور پھر ”ٹھیک ہے“ کہہ کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

”مقصد.....!“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے

جولی وکٹر تمہارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔“

”بھلا یہ میں آپ سے کیوں پوچھنے لگا۔“

”یہ بھی معقول بات ہے۔“ فریدی نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

حمید تھوڑی دیر تک خاموشی سے پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا پھر بولا۔

”تو بھٹی..... راٹھور کے ہٹ میں مرا تھا۔“

”ہاں..... اُسے الیکٹرک شاٹ لگا تھا۔ راٹھور کا بیان ہے کہ وہ اس وقت اپنے ہٹ

موجود نہیں تھا۔ بھٹی بحیثیت مہمان وہاں مقیم تھا۔“

”کسی سرکاری کام سے وہاں گیا تھا۔“

”نہیں وہ چھٹی پر تھا۔“

”پھر آپ کے بھیجے جانے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔“

فون کی گھنٹی پھر بجی اور فریدی اُسے جواب دینے کی بجائے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بار بھی اس نے پہلے ہی کی طرح خاموشی سے کال ریسیور کی اور سلسلہ منقطع کرنے سے

پہلے صرف اتنا ہی کہا کہ ”اُسے جلد از جلد حالات سے مطلع کیا جائے۔“

حمید کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور سوالات کا ایک ریلا تھا جو ذہن کے تاریک گوشوں سے ابھر کر شعور میں بالکل بچائے ہوئے تھا۔

دفعۃً اس نے فریدی کو عجیب نظروں سے گھورا شروع کیا۔

”خیریت.....!“ فریدی مسکرایا۔

”وہ لڑکی.....!“ حمید انگلی اٹھا کر بولا۔ ”اس لڑکی کے بارے میں تو پوچھ کر ہی رہوں ہوتے۔“

گا جسے آپ راٹھور کے ہٹ سے اٹھالے گئے تھے۔ مم..... میرا مطلب ہے لک کیوں اٹھالے گئے تھے۔ لفظ اٹھالے جانا ہی میرے لئے بے حد ہیجان انگیز ہے..... اس لئے مم..... میری ہکلاہٹ کو معاف..... فف..... فرمائیے گا۔“

”وہ بھی کی محبوبہ تھی۔“

”اوہ..... تو مردے کا مال سمجھ کر اٹھا کر لے گئے تھے۔ استغفر اللہ۔“

فریدی مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”وہ بھی حادثہ کے وقت ہٹ میں موجود نہیں تھی۔“

”تو اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے اٹھالے گئے ہوں گے۔“

”لفظ اٹھالے جانا بچ گچ تمہارے لئے کافی لذت انگیز ثابت ہو رہا ہے۔“ فریدی ننگ

لہجے میں بولا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تصویر نکال کر حمید کے سامنے ڈال دی۔

”کیا یہی تھی۔“ حمید نے بے ساختہ پوچھا۔ فریدی نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور

کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ حمید تصویر کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ تازک خدو خال والی ایک صحت مند لڑکی تھی۔

”جولی وکٹر اور اس کے پڑوسی تصویر کو شناخت کر چکے ہیں۔“ فریدی کھڑکی سے نظر

ہٹائے بغیر بولا۔

”اوہ.....!“ حمید اچھل پڑا۔ ”تو وہ بے سرو پا لاش اس کی تھی۔“

”قطعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے۔“

”لیکن..... لیکن..... آپ کو اچانک اسی کا خیال کیسے آیا۔“

”اس مکان میں جہاں سے جنازہ اٹھا تھا..... انگلیوں کے نشانات کی تلاش کی مہم کے

ان میں اس کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے تھے۔“

”تو کیا تصویر ہی کے ساتھ اس کی انگلیوں کے نشانات بھی آپ کے ریکارڈ میں

ہوتے۔“

”یقیناً..... ورنہ اتنی جلدی اس نتیجے پر کیسے پہنچتا۔“ فریدی رگڑ کا گوشہ توڑتا ہوا بولا۔

”تمہیں یہ معلوم کر کے مزید حیرت ہوگی کہ اس لڑکی کا تعلق دنیا کی خطرناک ترین تنظیم سے بھی تھا۔“

”تب تو آپ نے سوئٹزر لینڈ سے واپسی کے بعد بھی اس پر نظر رکھنے کی کوشش کی

لی۔“

”میں ایسا نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ وہ سوئٹزر لینڈ میں ہی مجھے جل دے کر غائب ہو گئی

۔ میں اسے راٹھور کے ہٹ سے زبردستی لے گیا تھا۔ ایک خاص معاملے کے متعلق اس

پوچھ گچھ کرنی تھی لیکن بلا خردہ میرے ہاتھ سے بھی گئی اور میں اپنے مقصد میں ناکام

”کس معاملے میں پوچھ گچھ کرنی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے حمید صاحب۔ اس معاملہ میں اس وقت تک کچھ نہ بتا سکوں گا جب

نصاب معاملہ اس کی اجازت نہ دے۔“

”اچھا..... اچھا.....!“ حمید نے سر ہلایا اور بولا۔ ”ایک بات اور..... کیا اس لڑکی

بھی بھٹی کی موت چھپائی گئی تھی۔“

”یقیناً.....!“

”مجھے حیرت ہے۔ بھٹی کوئی اہم سرکاری خدمت بھی انجام نہیں دے رہا تھا۔ چھٹی پر

تھاس کے باوجود بھی آج تک سرکاری کاغذات میں زندہ ہے اور اس کی تنخواہ بھی لگ رہی ہے..... دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ یہ ایک بڑے آفسر کا نجی معاملہ ہے۔ مجھے بتائیے کیا یہ جرم نہیں ہے۔ اس بڑے آفسر کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ.....!“

”میری بات سنو۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”بھئی کی موت وقتی طور پر چھپائی گئی تھی۔ اس کے بعد اسے سرکاری کاغذات میں زندہ رکھنے کی ذمہ داری صرف مجھ پر ہے میرے مشورے پر ایسا کیا گیا ہے۔“

”پہلے تو آپ نے کہا تھا کہ بھئی کی موت کی خبر پھیلنے پر بعض بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔“

”اس وقت میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔“

”جہنم میں جائے۔“ حمید گردن بھٹک کر بولا۔ ”میں بھی اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ یہ بتائیے کہ آپ گیسپر کے لئے کیا کر رہے ہیں۔“

”اب اس کی نگرانی بھی کی جائے گی۔“



ڈی۔ ایس۔ پی بیراگی کی حیرت انگیز موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ اخبارات نے تفصیل کے ساتھ واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ سب کچھ کسی بین الاقوامی گروہ کی سازشوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ دشمن ممالک کے جاسوس عرصہ سے کوشش کر رہے ہیں کہ محکمہ سراغ رسانی کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ایک آفسر کو اپنے راستے سے ہٹادیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی بیراگی غالباً انہیں کا ایجنٹ غدا سازش ناکام رہی۔ اس لئے اس کے پشت پناہوں نے اسے بھی ختم کر کے خود کشی اسٹینج کر ڈالی۔ انہیں خدشہ تھا کہ بیراگی ان کی نشاندہی کر دے گا۔ خیال ہے کہ آفسر مذکور کو سازش کا علم ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بیراگی کی موت کی پیشین گوئی کیسے کر سکتا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی

نہیں ہے کہ بیراگی کی موت رسی کے پھندے سے نہیں واقع ہوئی۔

دوسری طرف حمید سوچ رہا تھا کہ اگر یہ غیر ملکی جاسوسوں کی حرکت تھی تو اس کی پہلی لپا کی جارہی ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس انہیں تو چپ چاپ ٹھکانے لگا کر ان کی کوشش کی جاتی تھی۔

حمید نے یہی سوال فریدی سے کیا تھا؟ جواب ملا۔ ”بے پر کی اڑاتے ہیں..... یہ لوگ“

اس جواب پر بھنا کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر بات آگے نہیں بڑھی تھی اور حمید صرف یاد کرنے کے متعلق سوچتا ہوا گھر سے رخصت ہو گیا تھا۔

کیا چیز ہے۔ ایسی پرکشش لڑکیاں شاذ و نادر غی نظر سے گزری تھیں۔ ذہنی اعتبار سے عجیب سی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا اگر اس کی بکواس پر یقین کر لیا جائے تو وہ کھلی ہوئی مساکی بن کی حامل تھی۔ اسے رام گڑھ کی تیار یہ یاد آئی جو اپنے وحشیانہ قتل کے تصور سے بھی ناندوز ہوا کرتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک پبلک فون بوتھ سے جونی وکٹر کو متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن دوسری لائن سے غراتی ہوئی آواز سن کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”اب کیا کرے۔ اس وقت تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ساتھی کی تلاش تھی اپنے محکمے یا پیشے متعلق کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔“

بہر حال وہ اسی طرح بور ہوتا ہوا کیفے نوروز آ پہنچا۔ یہاں کاؤنٹر کلرک ایک لڑکی تھی۔ بالآخر پڑتے ہی حمید نے سوچا کہ اسے تو لڑکی کے بجائے ”چٹھی“ کہنا چاہئے۔ آخر کس بناء کی کہتا ہے کہ اس کے جسم میں بڑی بڑی آنکھوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ خاص کر اس کا منہ لگایا ہوا کامل ان کی جسامت کچھ اور بڑھا کر انہیں پورے جسم پر حاوی کر دیتا تھا۔

”چٹھی صاحبہ۔“ اس نے کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”ڈرائی فون ڈائریکٹری عناية

میرا نام شمی ہے۔ لڑکی ناخوشگوار لہجے میں بولی اور ڈائریکٹری اس کی طرف سرکائی۔

ہوئی رجسٹر پر جھک پڑی۔

”صرف چائے کے اضافہ سے آپ بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”جی.....! لڑکی نے تنکھی نظروں سے دیکھا۔

اس نے پرچہ پھاڑ کر گولی سی بنائی اور اُسے فلتس میں ڈال کر بہا دیا۔ اس قسم کی پیغام

بہاؤ کا مطلب یہ تھا کہ فریدی نے اس کے گھر چھوڑ دینے کے بعد ہی کوئی اہم فیصلہ کیا تھا اور

اپنے خود حمید کی نگرانی بھی اس کے منگے ہی کے آدمی کرتے رہے تھے۔ اس قسم کی پیغام رسانی

بانت ہوتی تھی جب شبہ ہو کہ خود مجرم سراغ رساں کی ٹوہ میں ہوں گے۔

شہزادہ اور ہی اس کی نوبت آتی تھی۔ لیکن ایسے مواقع پر انہیں ہمیشہ موت کے جبروں

میں بے وقوف نہیں ہوں مسٹر۔“ اس نے ڈائریکٹری اپنے طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

اس نے ہوٹل ڈی فرانس میں کافی پی اور بیٹھا سوچتا رہا کہ ابھی تو دو گھنٹے باقی ہیں۔ دیکھا

گئے گا..... ویسے اب اسے بہت زیادہ محتاط رہنا تھا..... دیکھتا تھا کہ اس کی نگرانی تو نہیں

ہوئی۔ اصول کے مطابق اس تک اس پیغام کے پہنچنے کے بعد سے منگے کے آدمیوں نے اس

کو یکے بیکال بند کر دی ہوگی تاکہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکے۔ یعنی نامعلوم تعاقب کرنے

باہر نکلتے نکلتے ایک آدمی اس طرح اس کے پہلو سے رگڑتا ہوا گزرا کہ بے اختیار تاؤں کو منگے سے متعلق سمجھ کر دھوکا نہ کھا سکے۔

آگیا۔ لیکن پھر سنبھل جانا پڑا۔ مخصوص قسم کا اشارہ تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب پر

مخصوص قسم کا دباؤ محسوس کیا تھا۔ مڑ کر دیکھے بغیر وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح دھکا دے

کر گزرنے والے نے کوئی چیز اس کی جیب میں ڈالی تھی۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے اسے جیب میں ڈال دیا۔

رہنے دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

لیکن اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی ایسے طریقے تک اختیار

ایسے میں اگر اچانک صاحب خانہ سے ملاقات ہو جائے تو فوری طور پر ”السلام علیکم“ ہی

گاڑی اسی کیفے کے سامنے چھوڑ کر وہ دوسری سڑک پر آیا اور ہوٹل ڈی فرانس کے باہر

”میرا نام شمی ہے۔“ لڑکی ناخوشگوار لہجے میں بولی اور ڈائریکٹری اس کی طرف سرکائی۔

ہوئی رجسٹر پر جھک پڑی۔

”صرف چائے کے اضافہ سے آپ بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”جی.....! لڑکی نے تنکھی نظروں سے دیکھا۔

”میں اپنی غلط فہمی پر تادم ہوں محترمہ۔“ حمید نے نہایت ادب سے کہا۔

”نہیں پہلے کیا کہا تھا۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”یہی کہ میری یادداشت اب قابل اعتماد نہیں رہی..... شمی میں چائے کا اضافہ اس کی

دلیل ہے۔“

”میں بے وقوف نہیں ہوں مسٹر۔“ اس نے ڈائریکٹری اپنے طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”ٹیلی فون خراب ہے..... لائن ڈیڈ ہو گئی ہے۔“

”مجھے کال نہیں کرنی..... صرف ایک نمبر کی تلاش ہے۔“

”تعارف حاصل کرنے کا گھٹیا طریقہ۔“

”خدا تمہیں تندرستی عطا کرے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

باہر نکلتے نکلتے ایک آدمی اس طرح اس کے پہلو سے رگڑتا ہوا گزرا کہ بے اختیار تاؤں کو منگے سے متعلق سمجھ کر دھوکا نہ کھا سکے۔

آگیا۔ لیکن پھر سنبھل جانا پڑا۔ مخصوص قسم کا اشارہ تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب پر

مخصوص قسم کا دباؤ محسوس کیا تھا۔ مڑ کر دیکھے بغیر وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح دھکا دے

کر گزرنے والے نے کوئی چیز اس کی جیب میں ڈالی تھی۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے اسے جیب میں ڈال دیا۔

رہنے دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

لیکن اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی ایسے طریقے تک اختیار

ایسے میں اگر اچانک صاحب خانہ سے ملاقات ہو جائے تو فوری طور پر ”السلام علیکم“ ہی

گاڑی اسی کیفے کے سامنے چھوڑ کر وہ دوسری سڑک پر آیا اور ہوٹل ڈی فرانس کے باہر

لے گا۔

”دوسری چلے آؤ۔“

حمید جھڑیوں میں گھس پڑا۔ فریدی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اندھیرے میں شکل نہ دکھائی دی۔ اس لئے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ بھی میک اپ میں ہے یا نہیں۔
 ”اس دروازے میں.....!“ وہ حمید کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔
 دوسرے ہی لمحے میں وہ چار دیواری کے اندر تھے۔ فریدی نے مڑ کر دروازہ مقفل کیا۔
 پھر اندھیرے میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔

یہ بڑی اچھی بات تھی کہ کمپاؤنڈ میں داخل ہونے کے بعد سے ابھی تک اس نے کسی لڑکی کی غراہٹ نہیں سنی تھی۔ ورنہ ہاتھ پیر پھول جاتے۔ اندھیرے میں کتوں کی غراہٹ اسے ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسے بیک وقت ہزاروں خبیث روہیں گونج پڑی ہوں۔

اس کا ہاتھ فریدی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اندھوں کی طرح چل رہا تھا۔ کمپاؤنڈ کے نزدیک ہی حصوں سے گزرتے ہوئے وہ بلا آخر رہائشی عمارت میں داخل ہوئے۔

پھر اندھیرے ہی میں انہوں نے زینے بھی ملے کیے اور عمارت کی تیسری منزل پر پہنچے۔ سر پر تاروں بھرا آسمان صد ہا سال پرانی کشت و خون کی کہانیاں سنارہا تھا۔ ایسے مواقع پر تیرہ کو اس عظیم ظلم کی بے کراں پہنائیاں ایسی کہانیاں ضرور یاد دلاتی تھیں اور وہ خود کو بھی ہزار ہا سال پرانا آدمی تصور کرنے لگتا تھا۔ سوچتا آج بھی تو سب ایک دوسرے کی گھات میں تھا۔ خون ضرور بہے گا خواہ وہ قانون ہی کے نام پر کیوں نہ ہو۔

فریدی اس سے کہہ رہا تھا۔ ”یہاں اس ٹیپ ریکارڈر کی تمہیں حفاظت کرنی ہے۔ وزیر موصوف کو نہیں معلوم کہ یہاں کوئی ٹیپ ریکارڈر بھی لایا گیا ہے۔“

”آپ کی موجودگی کا علم ہے انہیں۔“

”ہاں میری موجودگی کا علم ہے انہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی کیس کے سلسلے میں ان کا

آئے۔ لیکن مجھے اپنا بچاؤ بھی تو مد نظر ہے۔“

”کیا چکر ہے۔“

لیکن کوئی نہیں جانتا کہ مالک مکان کے علاوہ کتنے ہوں گے۔ کتنے جو سلام رسید کرنے سے پہلے ہی مزاج پر سی کر بیٹھتے ہیں اور پھر یہاں تو وزیر تجارت و صنعت کی کوٹھی معاملہ تھا۔ دو عدد مسلح ستر یوں کی خوفناک شکلیں بھی آنکھوں میں پھر گئیں۔ سنتری آڑا علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور پہلی ہی آواز پر جواب نہ ملنے پر گولی مار دینا ہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

حمید نے طویل سانس لی اور آہستہ آہستہ چلتا رہا۔
 کئی ایسی گلیوں میں گھسا جہاں اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔

منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل مطمئن ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ وزیر موصوف کی کوٹھی میں گھسنے کے بعد اسے کیا کرنا ہو گا۔ میک اپ کر لینے کے بعد کوٹھی کے قریب بھی پہنچ گیا لیکن اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہ مل سکا۔

گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے خونخوار قسم کے ستر یوں پر نظر ڈالی۔ ایک شاید پہلے سے وہیں کھڑا تھا اور دوسرا ابھی ابھی اندر کاراؤنڈ لے کر وہاں پہنچا تھا۔
 حمید آگے بڑھتا چلا گیا۔

عمارت کے گرد تقریباً دس فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ پورا چکر لے کر وہ عمارت کی پشت پر آ رہا۔

اب کیا نقب لگانی پڑے گی۔ وہ سوچنے لگا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت پشت سے ہلکی سی سن

سنائی دی۔ اگر سینی کا اندازہ نہ بچھتا ہو تا تو مڑتے وقت ریوالت ضرور نکل آتا۔

آواز کی جانب بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ جھڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں سے دیوار دوسری

جانب مڑی تھی۔ وہاں ہی جانا پڑا۔ کیونکہ اب وہ فریدی کی سرگوشی صاف سن سکتا تھا۔

”میں یہاں..... بھیجی کا خطر ہوں۔ خیر..... تم سنو..... سرخ رنگ کا بلب روشن ہوتے ہی ریکارڈ کو چلا دینا اور اس کا بھی خیال رکھنا کہ تم پر کسی کی نظر نہ پڑنے پائے۔“

”کیا بھیجی یہاں آئے گا..... اس چھت پر۔“

”بچوں کی سی باتیں مت کرو۔“

”اوہ..... تو مجھے یہاں تنہا رہنا پڑے گا۔“

”چلو بیٹھو.....!“ فریدی اس کے شانوں پر دباؤ ڈالتا ہوا بولا۔

حمید نے طویل سانس لی اور تن بہ تقدیر ہو گیا۔ اضمحلال تو پہلے ہی سے طاری تھا زمین پر..... وہ سوچ رہا تھا کہ یہ معرکہ اس کی آنکھوں کے سامنے سر نہ ہو سکے گا۔



یہ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ یہاں فریدی تنہا نہیں تھا۔ ایس پی ہومی سائیڈ بھی اس کے قریب ہی کھڑا اس کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں وزیر صاحب تنہا ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔

”انہیں علم نہیں ہے کہ یہاں میرے علاوہ اور کوئی بھی ہے۔“ فریدی نے سرکوشی کی۔
”اس لئے آپ محتاط رہنے گا۔“

”بہتر ہے۔“ ایس پی بولا۔

ہومی سائیڈ والوں کو ایس۔ پی ہیراگی کے قتل کے بعد سے چکر پر چکر آرہے تھے۔ شاید اسی لئے فریدی نے ان کے ایس۔ پی کو بھی اس مہم میں شریک کر لیا تھا۔
دفعۃً دوسرے کمرے سے کسی کے کھکھارنے کی آواز آئی اور فریدی پوری طرح اس طرف متوجہ ہو گیا۔

بھیجی پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وزیر صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ ان کے چہروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

بھیجی نے انہیں گھورتے ہوئے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”کیا فیصلہ کیا!“

”میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔“ وزیر صاحب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ بھیجی غرایا۔

”لیکن..... لیکن..... یہ تو سوچو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اور تمہیں اس سے

بانا فائدہ ہو گا۔“

”فائدہ.....!“ بھیجی زہر خند کے ساتھ بولا۔ ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے

سے کیا فائدہ ہو گا۔“

”اچھی بات ہے..... جو تمہارے دل میں آئے کر لو۔“ وزیر صاحب نے کانپتی ہوئی

واز میں کہا۔ ”ملک و قوم سے غداری کا مرتکب نہیں ہو سکوں گا۔“

”اچھی بات ہے..... تو پھر کل صبح۔“

”نہیں..... ابھی اور اسی وقت مسٹر بھیجی۔“ فریدی نے دروازے کو دھکا دے کر

رے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا رخ بھیجی کی طرف کیا۔ ایس پی ہومی سائیڈ جہاں تھا وہیں رہا۔

بھیجی ایک پل کے لئے چونکا تھا پھر اس کی آنکھوں میں طنزیہ سی مسکراہٹ ناچنے لگی۔
”کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تاکھڑا رہا۔“

”ہاتھ اوپر اٹھاؤ.....!“ فریدی جھکمانہ لہجے میں بولا۔

بھیجی کے ہاتھ جیبوں سے نکل کر اوپر اٹھتے چلے گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریدی

شائیں جانب چھلانگ لگائی۔ ایک پل کے لئے بھی غفلت برتی ہوتی تو سامنے والی میز ہی کی

اس کے بھی پر نیچے اڑ گئے ہوتے۔ شاید اس نے بھیجی کے ہاتھ میں وہ عجیب و غریب وضع

ایک ریوالور دیکھ لیا تھا۔ بے آواز..... اور چنگاریاں برسانے والا..... اس کی نال سے

نئی چنگاریوں کی دھار سی نکل کر میز سے ٹکرائی تھی اور میز کے چھتیرے اڑ گئے تھے۔

”خبردار.....!“ ایس پی ہومی سائیڈ نے دوسرے کمرے سے لٹکارا تو لیکن کھلے ہوئے

دروازے کے سامنے آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ آواز ہی پر بھیجی کے عجیب و غریب ریوالور کا رخ دروازے کی طرف پھر گیا تھا۔ چنگاریوں کی دھار نکل کر دروازے سے گزر گئی اور ایسا کڑا کڑا ہوا جیسے بجلی چمکی ہو۔ ایس پی نے اپنی پشت والی دیوار میں ایک فٹ قطر کا سوراخ ہوتے دیکھا۔ کچل کا سا کڑا کڑا اسی وقت ہوا تھا جب چنگاریاں دیوار سے ٹکرائی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت اس نے پے در پے تین فائروں کی آواز سنیں اور پھر ایک طویل چیخ مچی دھم سے گرا تھا۔

وزیر صاحب کی خوفزدہ آواز آئی ”اوہ..... اوہ یہ کیا ہوا.....؟“

”اب آجائیے..... کیپٹن۔“ فریدی نے اونچی آواز میں کہا تھا اور ایس۔ پی بھی تیزی سے اُس کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بھٹی فرش پر چت پڑا ہوا تھا..... اور فریدی دوسرے کمرے کی دیوار میں ہو جانے لگا تھا۔

والے سوراخ کو گھورے جا رہا تھا۔ ایس پی لاش پر جھک پڑا۔ دل کے مقام پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین گولیاں لگی تھیں جن سے ابھی تک خون ابل رہا تھا۔

”آپ لوگ محفوظ ہیں۔“ ایس پی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔

”بالکل.....!“ فریدی مسکرایا۔ لیکن وزیر صاحب دل پر ہاتھ رکھے ہوئے آگے پیچھے جھولتے ہوئے بولے۔ ”مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

فریدی نے جھپٹ کر انہیں سنبھالا۔ ورنہ وہ بھی لاش کے برابر ہی ٹیٹ گئے ہوتے۔



چار بجے صبح فریدی کے دفتر میں اس کے ساتھیوں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسے وزیر موصوف کے قتل کی سازش کا علم کیوں نہ تھا اور حمید سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی نے بھی کو مار کیوں ڈالا۔ بھٹی تنہا تھا اور تنہا مجرم خولہ کا ہی زبردست حربہ کیوں نہ رکھتا ہو فریدی کے کھیلنے کی چیز تھی۔ وہ ایسے ہی مجرموں کو زندہ

”تم بتاؤ..... وہ لاش کس کی ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے ایس پی سے پوچھا۔

”مسٹر رائٹور..... ایم پی کی۔“ ایس پی نے کہا۔

”نہیں.....!“ فریدی متحیرانہ لہجے میں چیخا۔

”جی ہاں۔“

”آپ نے مجھے وہیں کیوں نہیں بتایا تھا۔“ فریدی نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”مم..... میں خود بھی نہیں پہچان سکا تھا..... وہ تو ہسپتال میں مطلب یہ کہ وہاں وہ فول چہرے سے اتارا گیا تو..... وہ رائٹور صاحب تھے۔“

”میک اپ.....!“ فریدی کے لہجے کی حیرت اب بھی برقرار تھی۔

”جی ہاں..... حیرت انگیز میک اپ..... میں نے آج تک اتنا کامیاب پلاسٹک میک اپ نہیں دیکھا۔“

کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ حمید نے ڈی۔ آئی۔ جی کے ہونٹوں پر خفیف سی ہنسی دیکھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایس پی سے کہا۔ ”اب آپ جاسکتے ہیں۔“

ایس پی نے ایڑیاں بجائیں اور باہر چلا گیا۔

”کیا تم نے مجھ سے بھٹی کی موت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی ہاں کیا تھا..... اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ سوئٹزر لینڈ میں مر جانے کے باوجود بھی یہاں دیکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ مجھے تو اس کا تعاقب کرنا ہی تھا۔“

”مجھ سے بھی وہی باتیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے آنکھیں نکال کر بزرگانہ انداز میں کہا۔

”اب میں کیا عرض کروں۔ بھٹی کی موت کے متعلق پوری دنیا میں چند افراد کے علاوہ

اور کوئی نہیں جانتا۔ میں، آپ، راٹھور، سفیر صاحب اور سیکریٹری وزارت خارجہ..... آپ

نے بھٹی کی موت کی خبر آج تک اپنی ہی ذات تک محدود رکھی تھی۔ لہذا اب میں جو کچھ آپ

کو بتانے جا رہا ہوں اسے بھی آپ اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں؟“

”میں ابھی صاحب معاملہ سے فون پر اجازت لے چکا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ

ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کو بتائے بغیر کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ وہ بھی سوئٹزر لینڈ میں بھٹی کی

موت سے واقف ہیں۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے لیکن استدعا بھی کی ہے کہ آپ اس

معاملے کو بھی اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں۔ بھٹی بہت بڑا بلیک میلر تھا۔ ملک کی بڑی بڑی

شخصیتوں کی بعض ایسی کمزوریاں اسے معلوم تھیں جن کی بناء پر وہ انہیں بلیک میل کر سکتا تھا۔

ان میں دو شخصیتیں بے حد نمایاں تھیں ایک تو سفیر صاحب جو سوئٹزر لینڈ میں تھے اور

دوسرے وزارت خارجہ کے سیکریٹری صاحب اور یہ دونوں حضرات کسی ایک ہی معاملے میں

بلیک میل کئے جا رہے تھے۔ بھٹی نے انہیں دہلا رکھا تھا۔ غالباً اس نے اپنے سبھی شکاروں سے

کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ کسی طرح اچانک مر گیا تو اُن کے معاملات کھل کر منظر عام پر آجائیں

گے کیونکہ اُن کے خلاف سارے ثبوت ایک ایسی ہستی کے پاس محفوظ ہیں جو دنیا کی ایک

خطرناک تنظیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر اُن کے راز اس تنظیم کے ہاتھوں پہنچ گئے تو پھر ان کا

کہیں ٹھکانہ ہو گا۔ لہذا جیسے ہی سفیر کی دی ہوئی اطلاع سیکریٹری صاحب کو پہنچی ان کے ہاتھ

پر پھول کئے اور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ کسی پر اعتماد کریں۔ نظر انتخاب مجھ پر

ہی۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ آپ کے علم میں لائے بغیر میں ملک سے باہر جا کر

سی معاملے کی تفتیش کر سکتا۔ بہر حال میرے پیچھے پیچھے بھٹی دفن کیا جا چکا تھا۔ ہم نے راٹھور

صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ بھٹی کی موت کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کریں، انہیں بتایا کہ بھٹی

باموت کی خبر پھیلنے سے بعض بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے بڑے

لبوس سے وعدہ کیا تھا اور اس پر قائم بھی رہے۔ موت اس خیال سے چھپائی گئی تھی کہ اُس

جی کو خبر نہ ہونے پائے جس کے پاس بھٹی کے بیان کے مطابق اس کے شکاروں کے خلاف

بوت محفوظ تھے۔ پھر یہ مشہور کرنے کی کوشش کی گئی کہ بھٹی یورپ کے کسی ملک میں کسی

ہم فرض کی انجام دہی کے سلسلے میں مقیم ہے۔ اس کی تنخواہ بھی لگتی رہی اور جعلی دستخط سے

ان کی وصولیابی کا انتظام بھی کیا گیا۔“

”لیکن اب اس کے لئے کیا جواز پیش کرو گے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”سیکریٹری صاحب جانیں۔ مجھے اس سے کیا سروکار..... ہاں تو مجھے لڑکی پر اسی ہستی

شہر ہوا تھا جس کی طرف بھٹی نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کے سلسلے میں چھان بین شروع

اور دو تین دن ہی میں اس کا ثبوت فراہم کر لیا کہ وہ عالمی پیمانے پر منشیات کی غیر قانونی

بلات کرنے والے گروہ مافیا سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک شام میں اسے اپنے ساتھ لے جانا

ہوتا تھا۔ راٹھور صاحب اکڑ گئے کیونکہ وہ بھٹی کی موت کے بعد بھی انہیں کے یہاں مقیم رہی

ٹی۔ مجبوراً مجھے اس کو وہاں سے زبردستی اٹھالے جانا پڑا۔“

”زبردستی۔“

”جی ہاں..... مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ راٹھور صاحب

مائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ بہر حال میں اسے اپنی قیام گاہ پر لایا تھا لیکن چند

نٹوں کے بعد وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ اس کے بعد پھر میں نے پچھلے دنوں اس کی لاش اس

مات میں دیکھی تھی کہ سر غائب تھا۔ ہتھیلیاں اور پنچے کاٹ لئے گئے تھے۔“

”تو وہ اسی کی لاش تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے حیرت سے کہا۔

”میرا تو یہی خیال ہے۔ بھٹی کی دریافت کے بعد فوراً ہی میں نے مکان سے لئے گئے انگلیوں کے نشانات سے لڑکی کی انگلیوں کے نشانات کا موازنہ کرایا تھا۔ کچھ نشانات ان سے مل گئے تھے۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر فریدی نے بھٹی کی دوبارہ دریافت سے لے کر حمید کے راٹھور کے پنچے میں پھنسنے تک کی داستان سنائی اور ڈی۔ آئی۔ جی کی اجازت سے سگار سلگا کر بولا۔

”بھٹی کا نام آتے ہی راٹھور کا خیال آیا تھا۔ کیونکہ آنا قدرتی بات تھی۔ میں جانتا تھا کہ حمید کو اچانک اپنی کوٹھی میں دیکھ کر وہ کیا کرتے ہیں۔ لڑکی والے واقعے کے بعد سے وہ حضرت مستقل طور پر میری تاک میں رہتے تھے اور میں بھی ان کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا اور اس رات تو خصوصیت سے توجہ دینی پڑی تھی۔“

”تو تم جانتے تھے کہ بھٹی کے روپ میں وہ راٹھور ہی تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”راٹھور یا اسی کا کارندہ۔“

”ہرگز نہیں.....!“ ڈی۔ آئی۔ جی مسکرایا۔ ”اگر تمہیں اس کے راٹھور ہونے کا یقین نہ ہوتا تو اسے مارنے ڈالتے۔“

”چلے یہی سمجھ لیجئے۔ بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔ میں نے سوچا اگر زندہ گرفتار کرتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں۔ پتہ نہیں اور کن کن بڑی شخصیتوں کو بلیک میل کرتا رہا ہو۔ ان پر ردّ رکھ کر اپنا بچاؤ کر ہی لے۔ وزیر صنعت و تجارت کا حال آپ نے دیکھ ہی لیا۔“

”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ وزیر صنعت کو بھی بلیک میل کر رہا ہے۔“

”حمید کو جب اس نے اپنی کوٹھی میں پکڑا تھا۔ تو اس سے ایک ایسی تحریر لی تھی جس کی بناء پر وہ مستقبل میں اسے بلیک میل کر سکتا۔ یہیں سے میرا یہ شبہ یقین تک پہنچا کہ بھٹی کے روپ میں اب راٹھور ہی اس بزنس کو چلا رہا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ ایک بڑا صنعت کار

بھی تھا اور لیڈر بھی۔ لہذا اس کی بلیک میلنگ سیاسی اور اقتصادی ہی نوعیت کی ہوتی ہوگی۔ بھٹی

کی موت کے بعد صرف دو شکاروں کا اس سے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ سفیر برائے سوئٹزر لینڈ اور وزارت خارجہ کے سیکریٹری۔ چونکہ بقیہ دنیا کے لئے وہ مرچکا تھا اس لئے راٹھور بہ آسانی بھٹی کے روپ میں ان دونوں کے علاوہ اور سب کو دھوکا دیتا رہا۔ انہیں تو پھر چھیڑا نہیں گیا تھا

بہر حال میں نے قیاس کیا کہ وزیر صنعت پر بھی اس نے جال ڈالنے کی کوشش کی ہوگی سنس اور پر منٹ کے چکر میں..... اندازہ غلط نہ نکلا۔ وہ حقیقتاً انہیں بلیک میل کر رہا تھا اور انہیں سے انہیں دنوں نئی تجارتی پالیسی سے متعلق کچھ ایسے نکات ان سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جن کا منظر عام پر آنا ملک و قوم کے لئے سودمند نہ تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے وزیر موصوف کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔ انہیں یقین دلایا تھا کہ اس واقعہ کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ کچھ اس وجہ سے اور بھی میں اسے زندہ نہیں گرفتار کر سکا۔“

”لیکن..... وہ لڑکی..... کیوں قتل کی گئی..... اور لاش کی تشہیر کا کیا مطلب

نہ؟“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”اس کا صحیح جواب تو راٹھور ہی دے سکتا تھا۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ کسی زمانے میں راٹھور بھی بھٹی کے شکاروں میں سے رہا ہو گا اور اس نے بھی یہی قیاس کیا ہو گا کہ وہ لڑکی بھی

بھٹی کی ہمراز ہو سکتی ہے۔ لہذا بھٹی کی موت کے بعد وہ خود ہی بھٹی بن بیٹھا۔ صرف ان لوگوں کے سامنے بحیثیت بھٹی نہیں آیا جنہیں بھٹی کی موت کا علم تھا اور پھر غالباً اس نے خصوصیت سے اپنے مطلب کے شکاروں کو الگ کر کے بقیہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی بھی ایک مثال برے سامنے آئی تھی۔ خیر اسے چھوڑیے۔ آپ لڑکی کے قتل اور لاش کی تشہیر کے بارے

میں پوچھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کو بھی شبہ ہو گیا تھا کہ یہ بھٹی نہیں ہے اس لئے وہ ان ثبوتوں کو دبا بیٹھی ہوگی جو راٹھور سے متعلق تھے۔ اس لئے کہ بھٹی راٹھور ہی کے یہاں سے غائب ہوا تھا۔ لڑکی سے اس وقت سفیر صاحب نے یہی کہا تھا کہ وہ بے حد ضروری کام کے سلسلے میں فوری طور پر کسی دوسرے ملک کے لئے روانہ ہو گیا ہے پھر میں زبردستی اسے

جی عمرانی کرنے والوں کو دھوکا دینا پڑا تھا۔ بہر حال مجھے یقین تھا کہ تم کو بھی میں گھسنے کا راستہ
 دہی کرتے ہوئے عمارت کی پشت پر ضرور آؤ گے۔“
 ”اور وہ لڑکی.....!“ حمید نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔

”عالمی تہوار اشارہ جولی وکٹر کی طرف ہے۔ اُس نے تم سے جتنی بھی باتیں کی تھیں
 کیوں اس..... دراصل اس سے بھی مجھے بڑی مدد ملی ہے جب پہلے پہل ہم اس مکان کے
 اپنے مالک مکان سے گفتگو کر رہے تھے وہ ہم تک پہنچی تھی اور ہمیں اچھی طرح پہچانتی بھی
 تھی۔ انجان اس لئے بنی تھی کہ بھٹی کی نشاندہی کرنا چاہتی تھی۔ وزارت خارجہ کی گاڑی کا
 بڑھ سب سے پہلے اسی نے کیا تھا۔ لیکن بھٹی کا نام بتانے سے گریز کرتی رہی تھی۔

”وہ تو کیا وہ اسے ایک بلیک میلر کی حیثیت سے جانتی تھی۔“

”ہاں..... کیونکہ ایک سال پہلے تک وہ اس کے باپ سے بھی سہ ماہی وصول کرتا رہا
 نہ اس کے کسی راز کو راز رکھنے کے صلے میں..... وہ اپنے شکاروں سے اسی طرح سہ ماہی
 فراہم وصول کرتا تھا۔ اس کا باپ اس سے بے حد خائف رہتا تھا۔ بہر حال وہ سامنے والے
 کان میں اسے اکثر دیکھتی لیکن اسے حیرت ہوتی کہ آخر وہ حسب سابق ان کی طرف رخ
 نہیں کرتا۔ اس نے اس کا تذکرہ اپنے باپ سے بھی کیا تھا لیکن وہ خوفزدہ ہو کر بولا تھا
 ”مت دیکھو اس کی طرف..... بھول جاؤ اُسے..... خدا کرے وہ مجھے بھی بھول گیا ہو۔“

”اُس کے پاس جو مواد میرے خلاف ہے خدا کرے ضائع ہو گیا ہو۔ ضرور ایسا ہی ہے تبھی وہ
 جان نہیں آتا۔ ظاہر ہے اصل بھٹی تو مرچکا تھا اور راٹھور نے بحیثیت بھٹی صرف انہیں
 ان کے سرکار رکھا تھا جو اس کیلئے بہت اہم تھے۔ یعنی بھٹی کی طرح وہ رومات نہیں وصول
 تھا بلکہ ان سے اپنے مفاد میں کام لیتا تھا۔ مثال کے طور پر وزیر صنعت کا معاملہ لے لو۔“

”آپ نے جولی سے یہ سب باتیں کب معلوم کیں۔“

”گیسپر والے معاملے کے بعد..... گیسپر کو کسی نامعلوم آدمی نے تمہارے متعلق
 لاپرواہی نہیں بتایا تھا بلکہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ جولی ہی نے گیسپر کو بھیجا تھا اور پھر خود

اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر اسے شبہ ہو گیا ہو گا کہ وہ کسی سازش سے دوچار
 ہے بہر حال راٹھور نے اسے اس وقت تک زندہ رکھا جب تک کہ اس کے قبضے سے وہ مواد
 نہیں نکال لیا جو خود اس کے خلاف تھا۔ رہی لاش کی تشہیر تو یہ اس کے کارکنوں کی حماقت کا
 نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس طرح وہ بہ آسانی لاش سے پیچھا بھی
 چھڑا لیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے اسی خطا کی پاداش میں وہ شخص
 مارا گیا ہو جو اس کے شوہر کا رول ادا کرتا تھا۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ضابطے کی کارروائی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔
 راٹھور کا وہ عجیب و غریب پتول بھی زیر بحث آیا۔

”میں نے تو ایسے پتول صرف فلموں میں دیکھے ہیں۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”عالمی مریخ کے
 باشندے ایسے ہی پتولوں سے اپنا کھانا پکاتے ہیں۔“

”اسی پتول کی بناء پر مجھے کہنے دیجئے کہ راٹھور زیرو لینڈ کا جاسوس بھی تھا۔“ فریدی
 نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”ڈی۔ ایس۔ پی بیراگی کے یہاں سے ایسے کچھ کاغذات بھی ملے
 ہیں۔“

ڈی۔ آئی۔ جی حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جلدی سے بولا۔ ”ہاں کہو
 خاموش کیوں ہو گئے۔“

”فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بارہ بجے تک آپ کو پوری رپورٹ مل جائے گی۔“
 مگر واپس جاتے ہوئے حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”آخر مجھے اس طرح
 وزیر صاحب کی کوٹھی میں طلب کرنے کا کیا مطلب تھا۔ میں تو سمجھا تھا شاید چوروں کی طرح
 کوٹھی میں گھستا پڑے گا۔“

”راٹھور کے آدمی ہر وقت میری نگرانی کرتے تھے۔ ہماری کوٹھی کے گرد اس کے
 گروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اگر اسے اس کی اطلاع ہو جاتی کہ میں کسی طرح بھی وزیر صاحب
 کی کوٹھی میں داخل ہوا ہوں تو وہ ہرگز وہاں نہ آتا۔ پہلی بار جب وزیر صاحب سے ملا تھا جب

ہی بچاؤ کرانے چلی آئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ اس مکان کے لوگوں کے خلاف اپنی مہم پہلے سے بھی تیز کر دیں حالانکہ اس کا یہ فعل قطعی احمقانہ تھا۔

حمید جس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں جھومتا ہوا بولا۔ ”تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ گیسپر سے محبت کرتی ہے۔“

”ہوں.....!“ فریدی غرایا۔ ”تم اسی مسئلے پر اپنی رپورٹ لکھ ڈالو۔ ماہنامہ دلدار میں چھپوا دوں گا۔“

”اُوہ..... معاف کیجئے گا۔“ حمید چونک کر بولا۔ ”شاید میں اونگھ رہا تھا۔ ہمیں بھلا محبت و جت سے کیا سروکار..... ہم تو صرف اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ شہر کی سڑکوں پر رات رات بھر کھیاں مارتے پھریں۔ لیکن وہ زیرو لینڈ والا پستول؟“

”راٹھور کی موت نے بڑی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے وزیر صنعت سے وعدہ کر لیا تھا کہ بلیک میلنگ کی کہانی منظر عام پر نہ آنے پائے گی۔ راٹھور کی زندگی میں یہ ناممکن ہو جاتا۔ اب صبح کے اخبارات وزیر صنعت کے خلاف ہلاکت خیز سازش کی خبر سنائیں گے اور مجھے اس سازش کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی۔ لہذا میری بروقت مداخلت نے اُن کی جان بچالی۔ آئندہ سال تک سرکاری کاغذات میں بھیجی بھی مر جائے گا۔“

”جولی وکٹر.....“ حمید بھد سوز و گداز گنگتا۔

”اُسے بھول جاؤ..... وہ لڑکی کرکے ہے۔“

”مجھے آج تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو کرکے نہ رہی ہو۔“ حمید نے جمائی لے کر کہا

اور پھر اونگھنے لگا۔

ختم شد